

طحات پانچ از شاخ طبع جناب اجہ امداد حسین مرحوم مختص ہے

نحوہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں چند قلمے باقی رہ گئے تھے اور انہی شاعت کے لیے
آئی اور موقع نہ تھا اس لیے بطور یادگار کے انکو بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا گیا ہے۔

پانچ وفات جناب مولانا قلندر علی زبیری پانی پتی غفر اللہ عنہ

آن قلندر علی وحیدِ زماں	در نجابت زبیری بسندی
خاک پانی پت از سکونت او	در جہاں شد علم پرستندی
مرد و باخوش بروکت و علم	ماند خلتے بہ کوئے نابلدی
جز دل او کہ بود جہاد صفا	نقد کبر جہت و روی
جز کتابش کہ بدیمہ حسانت	درج ہر نامہ نیکیست و بدی
گفت سال وفات او	رفت عالم بہ جہت ابدی

پانچ وفات حافظ سعد کبیر مرحوم پانی پتی مدرسہ اسلامیہ پانی پتی

تعمیہ کرنے سے ۱۳۰۸ء حاصل ہو جاتے ہیں۔

تخریج و تعمیہ کا اشارہ گویا ”إِنَّ هَذَا الْأَمْلَکَ کَرِیمٌ“ سے نکلتا ہے کیونکہ اس کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے کہ نہیں ہے ”هَذَا“ مگر ”مَلِکٌ کَرِیمٌ“ تو اس سے یہ مطلب استفادہ ہوگا کہ اوپر کے جملے میں هَذَا کی جگہ مَلِکٌ کَرِیمٌ رکھ دو۔ اور سطح ۱۳۰۸ء حاصل ہو جائیگا اصل آیت میں حاکش باللہ ہے بضرورت لام ضم کر کے حاکش کروایا گیا ہے آیت کا ترجمہ ہے (حاکش اللہ پر بشر نہیں ہے یہ تو ہونو کوئی مغرور شہ ہے) جو عورتیں زلیخا کی فریفتگی پر اُسکو ملامت کرتی تھیں جب حضرت یوسف دفعۃً اُنکے سامنے آئے تو اُسوقت جو الفاظ اُنکے مونہ سے نکلے تھے اُنکو قرآن میں اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

تاریخ وفات مہین برادرِ راقمِ جناح ایداد حسین مرحوم تخلص بہ

سَلَّمَ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

۱۳

یہ تاریخ برادرِ زاوۂ رستم حافظِ حقائق حسین سلمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنے والد مرحوم کی وفات سے چند روز بعد عین تملات کے وقت قرآن مجید سے فہمِ لباس کی تھی جس سے بے کم و کاست سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مادہ مذرت سے خالی نہ تھا اسلئے بوجہ اتحاد کے اپنی تاریخوں کے ساتھ اس تاریخ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ تاریخ برادرِ مرحوم کے سنگِ قبر جو کہ دلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے جوامیں واقع ہے کندہ ہے۔

قرآن مجید میں اس آیت ” اِنَّهُ صَرَحَ مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوْلِ اِرْنِدَ ” ہے تاریخ میں بے
 اعداد اور نیز بمقتضای مقام اِنَّہ کی جگہ گائے کرویا گیا ہے مگر چونکہ اس
 پورے نہیں ہوتے تھے اسلئے قَوَائِد میں الف لام پڑھا کر القَوَائِد کرویا گیا
 حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں جب سببا کی بادشاہ ہادی مقبیس اولی
 دفعہ وارد ہوئی تو اسکو شیش محل کے صحن چربیں لینے لگے ہوتے تھے یہ گمان ہوا کہ گویا پانی
 بھرا ہوا ہے اُسے فوراً پانی چڑھائیے۔ حضرت سلیمان نے کہا ” اِنَّهُ صَرَحَ مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوْلِ ”
 یعنی یہ تو ایک محل ہے جس میں شیشے بڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ بنا میں اِنَّہ کی جگہ گائے

کروینے سے معنی ہو گئے کہ گویا یہ وہی سلیمان کا شیش محل ہے۔
 یہ تاریخ ایک دست کی فرمائش سے جو اسوقت
 لکھ لیا گیا تھا کہ پسند نہیں آتی۔ اسلئے کہ ہمیں در
 بلکہ اسلئے کہ نواب صاحب کا نام ہمیں نہیں تھا۔

تاریخ ولادت فرید درجہ کرامت آسمان جاہ بہادر دارالمہام کا عالی

لُحَاشَ لِلّٰہِ مَا هَذَا بَشَرًا اِنْ هَذَا اِلَّا مَلٰکٌ کَرِیْمٌ

اس آیت سے سنین مطو لبعنی ۱۳۰۸ھ اسطرح نکلتے ہیں کہ آیت کے جائز و سہ لبعنی لُحَاشَ
 لِلّٰہِ مَا هَذَا بَشَرًا کے اعداد ۱۶۵۲ ہیں۔ انہیں سے اِذَا کا تخریج اور مملکت کریم کا بجائے آ

یا یعنی جناب باری نے بعض انکے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس انکو عنایت کیا

یا ایہ وفات اب محمد لقشبند خام موم وکیر او نواب محمد مصطفیٰ خام موم رشتیں

وَحُلُّوا سَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ

ہجری

۱۲

۹۴

چونکہ عزیز موصوف ایک وجہ و شکیل آدمی تھے اور انکی وفات عنفوان شباب میں واقع ہوئی تھی اسلئے یہ آیت انکی تاریخ وفات کے لئے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ ”پنھائے گئے انکو چاندی کے کنگن“ بجائے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے لگویا انکی مغفرت ہو چکی اور اہل جنت کے تمام حقوق انکو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حُسن اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی تاریخ وفات قرآن مجید سے بڑا ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورہ دھہر سے نکلی اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آیت نہ خانہ دریاست گاہ بہاول پور

گانہ صرح مہر دمن القواریر

ہجری

۱۲

۹۶

چھپکر ہوا تمام تو حالی نئیوں کہا
 دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب

۸۲ ۱۸ سیوے

یائچ بنائے مہاں شراد موضع سون و اسر کپا سال عیوی

بحر کرم آں ویر چپ کہ باقی نام بزرگان مول زبند الش
 ساختہ منز لگے چو ہر غریباں نیکہ کہ ہر غریب آمدہ سالش

۶۱۸ ۷۷

یائچی خاتمہ مقبیل از قرآن مجید

یائچ و قاع عمران با نواب محمد مصطفیٰ خاں موم ہلاوی سنین گنیم آباد متخلص

جَوَاهِرُ مَاصِدْرٍ وَاجِنَاتٍ وَحَرِيرَا

آیہ قرآنی میں مَاصِدْرٍ وَاجِنَةٍ وَحَرِيرَا ہے چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی
 ایسے جتنے کی جگہ جنات کر دیا گیا ہے جیسا کہ نواب عبداللہ کی مشہور تاریخ میں بجائے ۷۷
 وریحان و جتنے نعتیہ کے ہمارا روح و دین جان و جنات اللہ تعالیٰ کر دیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدید و آلام بے نظیر صبر و تقال
 کے ساتھ برداشت کیے تھے ایسے اس آیت کا مضمون انہی وفات کے نہایت مناسب

چو دیوانِ اردوے عاشق کہت
صنمخانہ طرف گفتی زچیں
بہ پیرایہ طبع آراستند
شنیدند از ہر کنار آفریں
سخنِ کرشن بود از رشتہ درجہاں
ز شاوی نگنجید و در پوستیں
چو حالی ہے جست تیغ طبع
صنمخانہ عاشق آمد سنیں

تاجِ بنا ہے در محوطہ سلیم سلیمانان واقع علی گڑھ بحساب سال
بعثت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بحسن جی جناب از بیل سید احمد خاں

بدایت کیجئے گرام سالِ حبت کی محرم سے
تو کیئے سالِ بعثت کا مہِ شوال کو مبداء
کلام اللہ اتر آخبر ماہِ مبارک میں
ہوا اس واسطے شوالِ مبداء سالِ بعثت کا
نخالے یہ مبارک سن جنابِ سید احمد
بنایا جنے دارِ علم میں یہ چشمہِ نیا
ز روے سالِ بعثت چونکہ تھی تیغ کی خوش
کہا ماتف نے حالی سے کہ چشمہ فیضِ انوار کا

تیغ طبع ترجمہ تیغ دربارِ قیصری بحساب سالِ عیسوی

پنجاب کے ادارہ تعلیم عام نے
ایک اور کام ملا کے حق میں کھایے خوب
دربارِ قیصری کی جو تیغ تھی چھپی
اب ترجمہ اسیہ کا مرتب ہوا ہے خوب
ہیں لفظ و لکھا تو مضامین ہیں دلشیں
ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

تیاخ طبع دیوان فشتی اقبال حسین صاحب متخلص و شاعر

جوان مرو آزادہ عاشق کینیت در تہ ان خود کس ملو اقریں
 نہ صیتا دو ہموارہ از حسن خلق پے صید آزادگان و کیں
 نہ تاج پیوستہ ز افسون لطق کش ز آشیای بازو شیرا غری
 ہے بار د از جہد اش انبساط اگر مہربان ست و گزشتہ گیں
 نہینیش گسکہ برابر دواں نہ یابیش افتادہ چیں جبریں
 دو سال ست کافسون مہر و فاش ربو دست صبر مہر جان خیزیں
 دے دیر پیوند نہا آشنا کہ بود ست فایغ ز مہر و زکیں
 نہا تم کہ عاشق چہ افسون ہوید کہ در باخت خود را بہر شہنیں
 سرشت بہیات دادم نہوت سخن راسماں بود و وقت از زمیں
 کنوں را نم از طبع دیوان سخن کہ شد جلوه فرما بہ نوع گزینیں
 دین روزگار ضرورت ناں سخن شہمان و سخنو مہیں
 عوس سخن مے نیز و بچو بہ حسن اربو غنیت جوہر عینیں
 صدا باد بر عاشق و غنم او کہ درد و رنا ساز گاری چنیں
 زمغنی بہ بیگانہ و آشنا فشان دست گنجینہ از آستینیں

بہ تخت سلطنت نشست و حالی گفت تاریخ
برائے مے مبارک تاج و اوزنگ جہان بانی

تاریخ تالیف قواعد اردو و ملفوظات خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد یہ اردو کی کہ جس کا
کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی
زیادہ حجم میں اور نفع میں کم
مگر مختصر ہے اک رسالہ
کہ ہیں جس میں قواعد سب فراہم
پہ خوبی میں ہے کشش و مقدم
جو قیمت پر پچھنے تو ہے بہت سہل
نہ دینا رہیں لگتے ہیں نہ درہم
اگر نام اس کا تاریخ ہی ہو مطلوب
تو ہے اسے طالبو "اکسیر عظم"

تاریخ حلیۃ نواب سیار الدین احمد خاں سوم دہلوی

درد اک ضیاء دین احمد لکھنوی
از طاق و زلیوان و زبزم و جلیبا
رخت سفر از جہاں کہ جائے لکم
بگستہ بہ رحمت الہی پرست

۸ یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ ۱۶۲۹ میں سے جو کہ ضیاء الدین احمد لکھنوی ۳۲۱ جو طاق۔ ایوان و زبزم اور جلیبا کے اعداد کا مجموعہ جو تقریباً
کر کے آتی ہے ۶۰۸ کو ۶۹۴ میں جو کہ رحمت الہی کے اعداد میں گانے سے ۱۲۰۲ حاصل ہوتے ہیں اور یہی نواب مرحوم کا سال وفات
ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہے ۹۲۹ (۱۱۰ + ۶۷ + ۴۹ + ۹۴) = ۶۰۸ + (۶۹۴) = ۱۳۰۲ م

وہ خبر افیہ جسکی تھی احتیاج
چھپا مشرودہ اسے طالبان کمال
نئی طرز کا ہے یہ خبر افیہ
عیاں جس سے ہر بیج مسکوں کمال
ملی طرز تر اس کی تائیں طبع
وہ خود طرفہ ہے جسے قیل و قال
اگر سال حبس کی ہے جستجو
تو خبر افیہ خود بتاتا ہے سال
ہو مطلوب تائیں گر عیسوی
۹۹ ۵۱۲ ۱۸
۶ ۸۳
۱۸

تائیں بہ پایاں رسیدن بنائید
بائعہ محمد مریم گل ٹھہری در بلند

علی آں سید والا کہ باشد
بناش مہرباں جزوئے رحمت
بود با ذات او تو ام سیادت
چاں کز نام او مہرست پیدا
چو ایں کاشانہ را بنیاد نہاد
بہمد حاکم بیدار و دانا
گروں آں فیض گستر و جوش
شد ایں سمورہ چوں گلشن سرا
چنین گفتش حالی سال تعمیر
مکان بے نظیر آباد بادا
۹۹ ۱۲

تائیں اور نشینی حضور صفی نظام الملک میر محبوب علی خان بہادر
فرماں و اسے ملک دکن
نظام الملک میر محبوب علی خان صفی ثانی
۹۹ ۱۲

اس قافلہ میں آن کے ملا کو وہ سب کے بعد
 ہم اور صبح و شام یہ اندوہ جا انگڑا
 اگلوں کے ساتھ ساتھ گمرہ نور و تھا
 دل تھا کہ فکیر سال میں بعینہ گروتھا
 ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا
 (سچ ہے کہ خواجہ راہب نامی میں فوت تھا)
 "تاریخ ہمسہم کمال چکے پڑھ بغیر فکر
 حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

تاریخ و قاضی محمد ابراہیم جوان مرگ طالب علم بی اے کلاس دہلی کالج

محمد ابراہیم چونک جاں گشت
 زخصل جوانی شہر بر بخوردہ
 بگشتم زروے اللہ سال فوتش
 بجائ آندیں جان شیریں پڑ

تاریخ وفات سید خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیر راہی ملک بقا
 سب ہوئے اندوہ گیں شہر کے بڑا پیر
 دل نے کہا ہر جگہ بھیتی ہے چیز اک جدا
 باغ میں سرین و گل چرخ پہ ہنر شیر
 عیش میں شعر و غزل سو گیت تاریخ مرگ
 غیب آئی ندا "خدا میں ناصر وزیر"

تاریخ طبع جعفریہ لکھی مثال مؤلفہ خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور حقیقت میں بھی نہیں لہستہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی
 اُسے اُس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتمم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے مثلاً کسی کے
 صطبیل کی مرمت ہوئی۔ یا گھوڑا خست کیا گیا۔ یا کسی کی مینا مگرتی۔ یا مرغ پالی جتیا یا تلی
 نے بچے دیئے ایسے وقت میں شعر کو مقابلہ کے امتحان کا موقع مل جاتا ہے جو شخص ماڈہ تاریخ
 فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب اچھا نکال لاتا ہے اُس کا فی الحال اعتبار بڑھ جاتا ہے
 راقم چونکہ تاریخ نگار نے میں سدا سے پڑھا تھا اس لیے ہمیشہ اس امتحان سے کتراتا رہا لیکن بڑی
 بھلی چیز تاریخیں کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی
 تھیں انہیں سے جب قدر و مست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کر دی گئیں تاکہ دیوان کے ضروری
 اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہو جائے۔

تاریخ وفات مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جبکہ روضہ رضوں کی راہ
 ہر بپاؤ سر دھڑی ہر دل میں رو تھا
 اُس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہوچھ
 دنیا سے دل ہر اپنے پرانے کا سر دھڑا
 حالی کہ جسکو دعویٰ تمکین ضبط ہے
 دیکھا تو دل پہ ماتھ تھا اور رنگ زرد تھا
 تھا گو وہ اک سخنور ہندوستان نژاد
 عرفی و انوری کا مگر ہر دم ہر دھڑا

8 تاریخ خود غالب مرحوم کی غزل کے ایک شعر سے نکالی گئی ہے۔ انکی غزل کا قطع یہ ہے۔ یہ لاش ہے کہن اس روضہ تن کی جو حق مغفرت کرے
 عجیب آباد رو تھا، اخیر صبح کے ۱۱ بجے ۲۴۹۶ ہجرت میں حجب انہیں سے لفظ تاریخ کے مدنی ۱۲۱۱ اور لفظ فکر کے مدنی ۱۲۱۱ کا خود کیا گیا
 تو ۱۲۱۱ باقی سنہ ۱۲۱۱ سال وفات ہے جو مختصر صورت تاریخ کی یہ پہلی ۲۴۹۶ - (۱۲۱۱ + ۱۰۰) = ۱۲۱۱

قطعاتِ تاریخ اور تاریخی حُملے مقتبس از قمران محمد

راقم کو فی الواقع مادّہ تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تحریجہ یا تعبیہ کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق سے بغیر سکے بھی تاریخ سرنگام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادّہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور میں صرف مسخر لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھ لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر طعنا و کراٹا یاروں کی فرمائش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپچ سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا دعوے کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اُسکے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ تو قفل بغیر کنجی کے کھول دے۔ اس نے کہا بھائی میں نے نبوت کا دعوے کیا ہے۔ آہنگری کا دعوے نہیں کیا۔ انکا مطلب اس نقل سے یہ تھا کہ ہم نے خدا کی طلب میں درویشی خستیا کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانہ بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں ان لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ ادوار

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے یاقوت جنہیں کچھ قدرِ قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل
اُن کو ایسوں سے نہیں ملنا دنا
جو یاقوت رکھتے ہیں اُسنے سوا
اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اُس کو نہیں
سر میں ہے جگنو کے یہ سوداگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر
چاہیے دن کو نہ نیکے زنیہا
ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرسا

انجی ٹھی میں ہے تو اسے دولت
 نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
 کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
 ایک پل سیری اگر دیکھے گنوا
 تو اگر اپنی لٹا دے ثروت
 ہیں اسے واسطے جو اہل تمیز
 میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
 جانتے ہیں حکماء و عرفا
 دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں
 نہ کوئی کام ہو اُن سے خجہام
 نہ اُنھیں دین کی دولت ہاتھ آئے
 نہ ادا صوم ہو اُن سے وصول
 نہ مدوائے کچھ اپنی کی جائے
 گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت
 بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو

طاہر رشتہ بیا کی صورت
 جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
 جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
 لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اٹھا
 پل وہ ملتی نہیں پھرے دولت
 میری ایک ایک پل انکو ہے عزیز
 ہے مرا جاگتے سوتے اُنھیں پاس
 مجھ کو سرمایہ دین و دنیا
 اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دین
 نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
 اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیاے
 نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
 نہ خبر لے کسی کی لی جائے
 ہے مگر تنگ مجال نصرت
 بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اس میں ہے میرا نقصان
 کہ ہے اُنمول مری ایک اکاں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو
 کسی آواز کا انجام نہ ہو
 کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا
 دریاں گزرتا دم ہو پیرا
 ہیں رکھائی سے مری سب لرزا
 میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں
 جس سے دنیا میں نہیں آہ کروں
 ہو اگر شیر تو رو باہ کروں
 الغرض ہو مری وہ شانِ عظیم
 ٹرتے آتے ہیں جسے تسلیم
 چڑ سچتے ہیں خوشی کی مجھ کو
 پیری غطت نہیں باد تجھ کو
 تو باختر ہے تجھ میں وہ کیا
 جنے مجھ سے تجھے گراہ کیا
 وقت نے سن کے کہا ہے دو
 شک نہیں امینِ ذراے دولت
 ساری تو خوبیوں کی جڑ ہو مگر
 اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر
 تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
 اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی
 کیجئے مرض تجھے گر چشمہ
 تو ہوں اس چشمہ کا میں سرچشمہ
 میں ہوں یا تو ہے ہاں مکان
 پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں
 تو جو کھیتی ہے تو قبہ میں ہوں
 تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
 ہے قرابہ ترا گر عطسہ آگیاں
 میں ہوں اس عطسہ کی اندر میں
 ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
 تو ہے گراماں تو میں رس المال
 جنگے قبضے میں ہوں میں دولت
 تجھ پر رکھتے ہیں وہ دست قدرت
 لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تو
 بڑھ کے جاسکتی نہیں آگے تو

جس طرح وہ پرنڈہ جو فصل گل میں جا کر
پھر موسم خزاں میں گرہے ہے ملتا
دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا
تو ہے سرمایہ عزت یا میں
ہے زمانہ میں بڑی بات تری
وقت سے ہنسکے یہ دولت نے کہا
ہے عجب۔ جس کو خدائی مانے
سبز ہے گلشن دنیا مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں بن بن شوخا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں۔ مگر
چند روز آگئی میں جس کے کام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا
مونہ ذرا جس کو لگا لیستی ہوں
چاہتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں
سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے انسان کی دولت یا میں
دیکھیں ہم بھی کرامات تری
تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
اُسکی تو خوبیوں میں شک جانے
لیتے ہیں تو شہ عجب مجھ سے
لقب ادب ارباب ہے جانے کامرے
علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
میں نہ ہوں۔ تو نہیں کچھ قدر بشر
زندہ تاحشر رہا اُس کا نام
وہ سدا خوار و گھوٹا رہا
اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
پھرتے ہیں دھن میں ی پیر جواں

جبکہ سرچارلس نے پنجاب کے چھوڑا۔ اُنہم
 حال جو ہوتا ہے بچوں کا پھر کراں سے
 جانشین اُنکے ہوئے آئے جب سر لائل
 شکر سے عہدہ برآئے انکے نہیں ہو سکتے
 اچھے گیارہ برس جب اس ملک کے سایہ اُن کا
 کار فرما تھے جب ضلوع میں پنجاب کے آپ
 حیدر آباد میں۔ میسور میں۔ کلکتہ میں
 ہر یہ اب آپ کے اُمید کہ پنجاب میں بھی
 بعد سر لائل، سرچارلس کے سر نہیں بھی
 انگریزی اشعار کا ترجمہ

وقتِ رخت تھا ہر اک انکو بجز رست نگراں
 یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں
 عہدِ سابق کو گئے بھول سب اِنانے زماں
 ہم و انصاف ہوا ذات سے اُنکی عیاں
 ماتھ میں آپ نے لی آ کے حکومت کی عنان
 عدالت آپ کی اُس وقت سے مشہور ہو چیاں
 نیکنامی کے کیئے کام۔ رہے آپ جہاں
 مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہو گئی آساں
 چھوڑ جائیگے ہر اک دل پر عقیدے کے نشان
 انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل رُبا ہی میں جن پر کہ تو ہے شیدا
 وہ عالمِ جوانی جس پر کہ تو ہے معفتوں
 جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تو نے اُنکو
 چل دیئے جب ہمارے اُن بلبائوں کی مانند
 جب ہو چکے گا آخر عیش کا زمانہ
 بے مہربانیوں سے تو نے چھو کیا ہے نگلیں

جب دیر سے دل سے ہو جائیں گی سر پرایا
 جائے گا ٹوٹ جن دم اُن کا طلسمِ سلا
 تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرامِ دل سمجھتا
 بعد از بہارِ جو رخ کرتیں نہیں چمن کا
 کوں آ کے دے گا تجھ کو اُسکے سوا سہارا
 تیری خبر دے دی کچھ لے گا تو آ کے لے گا

درس کے مگر جسے ہیں اکثر قدر ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈروں کے ہنسنے کو ہیں گھر کھیلنے کو نہیں دے ہوسر
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

شہر میں جا کالج کو عطیہ کیں صلا حین آج ہو اکی
شہر کی جو حاجت تھی رو اکی شرط حکومت تمنہ ادا کی
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

تم میں ہیں جو موجود فضائل وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب کے دل سے ہیں قائل او! سر لائل - او! سر لائل
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

اشعار مدحیہ

بمختصر سرفیس افٹر پیپرک لفٹنگ گورنر بہادر پنجاب - انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے

فیض سرمد کے ہیں پیکڑوں احسان جہاں اسکا پنجاب پہ ہے بڑا یہ جان
حکمران آئے ہیں پنجاب میں اب تک جتنے ایک سے ایک کا پتہ ہے عدالت میں گران

نام تمھارا یاد رہیگا

یوں تو ہیں سب احسانِ مہم
سب سے بے یہ جانِ مقدم
تھے تعلیم میں کم سے کم ہم
تم نے مدد کی اپنی آپس میں
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

جو ملی کے جو خاص و طیفی
پانچ برس کو ہکوٹے تھے
لطف سے میعاد انہی بڑھاکے
جیت لیتے دل آپ نے ہے
جیتک ملک آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

مدد تمھارے ٹھور ہمارا
تھانہ کہیں ٹکھنے کا سارا
مانگے مانگے پر تھا گزارا
مٹ گیا اب خلیجان یہ سارا
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا
گھر پر عطا ہم کو فرمایا
حکم مرتب کا بھجوا یا
ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

ہے دلی کے فخر کی یہ دن شہر میں آيا شہر کا محسن

وصف تمھارا گو نہیں مسکن رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر کیسے کیسے رعیت پرور

جنسے ہے ہندوستان منور فخر ہے پاکستان کو جو چ

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

اگر کلاک احسان کا پتلا آدمی کی صورت میں نوشتہ

تمھاری پھنسل خدا کا تم نے جو دلی میں اُسے بھیجا

جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمھارا یاد رہیگا

آب و ہوا سے شہر کی ساری آئی تھی خلقت جان سے عاری

تم نے لگا کر نل اک باری چشمہ حیاں کر دیا جاری

جب تک شہر آباد رہے گا

خود غرض ٹھیرائیں یا مگر تائب کو یا گدا
 فخر سب بیجا ہیں اُنکے قوم ہے جتنی ذلیل
 دہی نہی ہاشم کی مہاں پروری ضربِ ابل
 تشنگی اپنی بھجانی ہوگی اے آبِ حیات
 دلتیں یہ کر کے سب خاطر نشان آئے ہیں ہم
 فخر و عزت کے مٹا کر نشان آئے ہیں ہم
 اس لیے یہاں بن بلائے یہاں آئے ہیں ہم
 لیکے موند میں قوم کی سوکھی باآئے ہیں ہم

مردہ قوم حضور شاہ زادہ ویلزد در ہند

مردہ ہوا ہل شرق اب نہ پھرے تھارے
 گلہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے
 مغرب سے سوے مشرق آیا ہے مہر تاباں
 ہندوستان بھی تجھ سے کچھ آجکل نہیں کم
 ہے ایسے گلہ باں پر گلہ کی جان قرباں
 تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن
 ہند ہی بھی ان دنوں میں قسمت پر اپنی نازاں
 مہاں ہے آج اُن کا اُس شاہ کا ولی عہد
 روئے زمیں کے سلطان جیسے ہوئے ہیں مہاں

شکر یہ عطاے مدرسہ نواب غازی لدین خاں مرحوم واقع جمیری دروا
 وہلی بحضور سیر لائل لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلباء

انیکلو عربی سکول دہلی

آئیے ولی کے دل آرا
 شکر کا ہم کو نہیں یارا
 شہر دعا گو سب ہو تمھارا
 پر یہ ہے کنافِ رض ہمارا

نشہ میں چور تھے اکبادہ پر زور کے ہم
جس کا حجت میں نہ کلفت میں اُترتا تھا خاک
سر پہ وہ دیو قوی لگے چڑھتا تھا اپنے
یاد تھا جس کا نہ حال کو نہ سیلے کو اُٹا
روکتا تھا جسے غار نہ خندق نہ کو اُس
تھے ہم اُس تو سن سرور پہ دنات سو
رہتے تھے اُس شترست کی صورت بے قید
ہاتھ سے جسے شتریاں کے ٹٹالی ہول
پند گو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دل سو
اُن کی صحبت تھے اتنے ہی زیادہ ہیز
خیر خواہ اور تھے غمخوار سُر مرنی جتنے
انہی صورت سے ہمیشہ میں چڑھتا تھا
ملکے بھولیوں سے جان میں جان آتی تھی
ہنسنے اور بولنے پر زلیست کا تھا اپنی ملا
اب انگلیں میں وہ دلیں نہ ترگیں باقی
تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں سیلے نہا

صدا کے گدایان قوم

دھونڈتے تھے خضر مبارک پہ کو بھیاں آئے ہیں ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم
دُوبے جو خوشدل ہیں وہ سُکر نہوں پر مردہ دل
سخت عبرت خیر لیکر وستان آئے ہیں ہم
ہند میں اسلام کا پھولا پھولا تھا جو چمن
ایکے اسکا مژدہ فصل خزاں آئے ہیں ہم
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے جبکہ داؤنے
آج اس در پر اُس کے نوحہ خاں آئے ہیں ہم
قوم کو بھوٹھی ہی جو عباسیوں کی یادگار
جستجو میں اُسکی شعل لیکے بھیاں آئے ہیں ہم
ناکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اسیے ڈالے گلے میں بھولیاں آئے ہیں ہم

۸ پنجاب کی ایک ایسی ہیمن کی طرف سے چند بہت لوگوں نے خبر لی کہ اپنی جوت کا نام گدایان قوم رکھا ہے اور یہاں پر میں چند اوصول کر کے بیٹے
بائیکا ادا رہ گیا تھا۔ اُنکا قصہ یہ ہے کہ صف میں یہ مشاعرے لکھتے لکھتے غائب ہو گئے تھے۔ چو کہ یہیں بہا پور بنی عباس میں گئے ہیں اسی لیے
ان حالات میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی اس لیے یہ مضمون اور طبع اور کیا گیا ۱۱

ایضاً

کارِ احباب ساختن بتواں دوستاں را نواختن بتواں
تا بہ دہر ابرو بادِ خود ماند از شما لطف یا دِ خود ماند

اشعار غزل نامتھام

اس زندگی کے ماتھیں چین ایک دن پایا یہ جان ہے بنیں یا خارِ سپرین میں
حاضرِ یو چنے دل ہی ہی باغ و مرغ یکساں ہم دوستو گئے بھی تو کیا گئے چمن میں
یہ اک خراشِ دل میں سڑ ہے کہ بھرنے کئے زخمی ہے قیرواں میں اور شکستِ ختن میں
تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوتی ہے ونہ اے فاختہ دھڑ ہے کیا سرو و نواروں میں

ایضاً

کس قدر یار و ہوا ہے انقلاب آگیا یاروں کے اقراروں میں فرق
خود بتادے گا تمھیں دورِ زماں بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق
ان پہ ہم قرباں میں ہم پر نثار ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گرنہ ہونیت گدائیں فرق آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق
ہیں و فساد اور بھی لیکن ہے مری جاں و فوافا میں فرق

اشعار قصیدہ نامتھام

یادِ ایام کہ تھی باغِ جوانی پہ بہار نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

جہاں شمع جمع ہوں چارپار ہیں اُس بزم پر لاکھ گلشن نثار
ایضاً

شکر کہ از فضل خالی ہے جہاں وقت خوش از پرودہ برآمد عیاں
شادی دل را سبب آمد بدست فرصت بزم طرب آمد بدست
تا شود از وقت دم میل کرم کلبہ ناخیرت باغ ارم
ایضاً

رفت آسیب بہستان باد نوروزی فرید دوستداران را بشارت باد و یاران انور
طرح بزم حشری با ہم گر باید نہاد نغمہ شکر آبی و بدم باید کشید
ایضاً

سلاۃ من محبت مستاکین یلیہ الخیر والبرکات تلتلی
سلام رد فہ روض و راح و بکن یدک یدہ الاحباب تلتلی
ودعوہ شاہدین و غائبین من الإخوان و الخلان طرا

حائتہ رقعہ شادی

فَاطِبُ الْعِشْرِ فِي الدُّنْيَا وَارْغُلْ رَهْمَتُهُ بِزِيَارَاتِ الْأَحْبَاءِ
ایضاً

ہزار دیدہ و دل پریش راہ یارانے کہ از سرت یاران سرت اندوزند
بہ شادی تلخ بہدگر شوند انبار ہزار رخ ز سر و رخ و دلے بر نہ بوزند

اشعار مشرق

انہیں کشمیر و اشعار میں جو لوگوں کی فرمائش سے خاص نام تین تھیں پڑو یا ناری وغیرہ میں کچھ نہیں

تمہیدرقہ شادی عروسی

شکر کیجئے کوئی نعمت کا خالق کی ادا
ایک سے ہر ایک نیت اس کی بندوں چلا
اُس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں بزرگی
جس نے جو مانگا وہی اُس نے مہیا کر دیا
نخل ترکہ پھل دیا اور پھل کو بختارنگے بو
سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا
کھیتیں کو مینہ دیا ماں باپ کو اولاد دی
اُس سے دی دنیا کو رونق اس سے آنسو بھولا
عمر روزِ خسروں عطا فرمائی پھر اولاد کو
کل چھٹی تھی جن کی ہے دن آج اُنکے یاد کا
اور اُنکے شکر میں سب یکے باہم شاد ہوں
تاکہ صورت سے ہو ظاہر شکر انعام خدا

ایضاً

پھٹی بیاہ یا تیج تہوار ہو
لب آب یا صحن گلزار ہو
گل ولالہ ہو یا ہو عطسہ و گلاب
مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب
یہ سارے خوشی کے ہیں سامان جب
کہ ہوں ایک جامع اجباب سب
اگر سے محفل کی شوکت بڑھے
غریزہ اور پیاروں سے غرت بڑھے

کھیتوں کے لوہ پانی اب بہ رہی ہے گنگا
 کچھ کر لو نہ جو انو اٹھتی جو انیاں ہیں
 تھے تھے تو تھا موغرت کو قوم کی کچھ
 اپنے تو قافلے سب پادر رکاب یہاں ہیں
 اک خضر رہنے رستہ سب صاحبزادیاں
 رستے پر پکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
 خیرت میں انہی حالی کہتا ہے یاد سے
 اسوقت رونق افراہیاں جنے مہرباں ہیں
 دنیا میں گرہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
 ورنہ بگڑنے کے یہاں آثار سب عیاں ہیں
 عرصہ ہو کہ کھلو انھیں دکھا رہے ہیں
 قدرت کے قاعدے جو دنیا چکر میں ہیں
 جو اپنے ضعف کا کچھ کتریں نہیں تدارک
 قوم میں ہند روزہ دنیا میں یہاں ہیں
 گھڑ بال و درگمچہ میں منجھونگے جاتے
 دریا میں مچھلیاں جو کمزور ناتواں ہیں
 سنبھلو۔ ورنہ رہنا یہاں سطح پر گے
 بھیل اور گوند جیسے گنا نام بے نشان ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روبرو دکھائیں
 دھنکے سے کچھ نشان ہیں تو حرکت نہجائیں

وہ دن گئے کہ نازل تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا یا اپنا آس ہے
بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا
یچھت نہ سمجھو سر پر یہ سایہ ہمارے
گم نشہ بخت جب کو پھرتے ہیں حوڈھتیم
لگتا ہے کچھ تو اس کا لگتا ہیں تپا ہے
وہ مشکلیں کر نیگی اب حل نہیں کچھ
جن شکلوں کا ہما کو اور نکو سامنا ہے
ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس سخن کے
معذرت میں نہ لے شکوہ نہ کچھ گلا ہے
فوج ملک کو اکثر سمجھا ہے فوج دشمن
حکمہ ملک پر اپنی اپنوں نے خود کیا ہے
نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہو کر جب د
انسان سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے
قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہما کو
قد رہی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہما کو
ہوتی ہے قدر ان کی منتی ہی جان چرب
لگتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے
گو سب جازو لے خطرے سے بخیر ہیں
پر رنگ نا خدا کا کچھ حق ساہور رہا ہے

آفات بحر سے بین وقف آشناس

ہستے ہیں خدا پر روتا ہے نا خدا جب

گلشن میں فصل گل کے میٹ چکنائیں
چرچیں سے عناد گلشن میں نغمہ خواں ہیں
طاؤں و کبک خش خوش گلشن میں ہیں ادا
اور بیٹھے ہاتھ ملے گلچین باغبان ہیں
غفلت کی چھائی ہی کچھ قوم پر گھٹاسی
بے فکر و بخیر ہیں بوڑھے ہیں باجواں ہیں
اترے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں
رستہ کہ صرے اسکا اور جار ہے کہاں ہیں
فضل و کمال انکے کچھ تم میں ہوں تم جاں ہیں
گر یہ نہیں تو بایا وہ سب کہانیاں ہیں

جن کو نہ ہو بلا و احکام کا اور نہ قدس
لایا ہو پچھلے دل انکو نہ حکم سلطان
خادم ہوں جس قدر وہاں مخدوم قوم ہو
مخدوم ہوں جس قدر وہاں سب سے مہربان
خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ وہاں تواضع
ہو خود ہی میرا نہ اور خود ہی وہ دھما
ٹھیکر نہیں جو چاہیں وہ آپ میرے جلس
چاہیں جنہیں بنائیں وہ آپ میرے سامان
آئے ہوں اس عرض سے سب تکے تاکہ سچوں
دنیا میں کس طرح ہوں سب سے بھر سدا
ہنستا ہوں کیونکہ باقی رہے نشانی
اُس قوم کی کہ تھا کل جگہ زہر فرماں
نخلیں تو کیونکہ نکلیں فیت سے وہ گھرا
اعزاز نے تھا باندھا جگہ بڑوں سے پیمان
اُن مدرسوں کا کیونکہ جاری ہے افاضہ
جگہ سے زندہ نام حدیث و قرآن
جو مسجدیں ہیں بہر ذکر خداے واحد
محفوظا حادثوں سے کیونکہ ہوں اُنکے ارکان
جو کچھ ہے بھائیوں کی تقاریر میں وہ سرگ
اپنی طرف سے لیکن ہر سعی فرض انسان
اسی شہنشاہ اسلام امی حسین اللطین
اسی پائے تخت ساداتی از ملک خدا

تو جشن گاہ شاماں ہر عہد میں رہا ہے

ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے

شاہو کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے
دوست کے تھے وہ جاوے ملت کا ہے نقشہ
کاغذ کی تھیں وہ ناویں بڑا یہ نوح کا ہے
بے روح تھے وہ غالب ہیں روح بخشی
سج رہا ہے وہ یہ چشمہ بقا ہے
سیل نہ وہ بچھڑتے روح انہیں گریہ ہوتی
رہتا ہے آنکھوں میں دشن دیا ہے

فیروزشہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آم آد
دو پٹھانا ہوا ہے تڑپیں سے شہر سارا
تغلق کا آج شکر تیمور کے مقابل
بہر مدفعت ہے یہاں میں صفا آرا
مخلو کے اُڑ رہے ہیں گلِ حسن فتح و نصرت
تیمور سے زمانہ ہے ہر سردار
آتا ہے آج بابر لودی پختہ پاکر
میں شوقِ شاہِ نو میں بیڑِ جوانِ دار
گلِ سوریوں میں ہر سہمہ تجھے میں شاہِ پانچ
مخلو کا آرا ہے گردش میں کچھ ستارا
ہو جشنِ فتح پھر آج چغتائیوں میں پانچ
قبائل نے ہو گیا مخلو سے قولِ پانچ
جس دھوم سے ہو گھر گھر جشنِ جلوں
ہے گردِ آگے آگے جشنِ قباد و دارا
شاہِ جہاں غشی سے پھولا نہیں سماتا
تعمیر ہو چکے ہیں شہرِ فصیلِ باد
طیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے
گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سادہ دوبارا
اطرافِ ہند سے ہیں عیانِ ملک آئے
پاکر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا
ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تختِ حاضر
بالائے تختِ طاؤس ہے شاہِ جلوہ آرا
وہ جشن کرنے والے گو خاک میں ماں ہیں

ہر جشن اُنکے اب تک سب ریاستاں ہیں

لے خاکِ پاکِ بلی اے تنگ گاہِ شاماں
پیشِ نظر ہیں تیرے اگلے ساز و ساماں
ہنگامے اس میں لاکھوں ہیں گرم ہر
پر کوئی جشنِ قومی اتنا نہیں نظر بھیاں
تقریبِ جشنِ جمیں ہو کچھ نہ خزانہ
ملکوں سے جمع اگر جمیں ہوئے ہوں انھاں
پائین صد کا جو جمیں نہ کچھ تفاوت
خرد و بزرگ کی ہو جمیں نشست یکساں

سہارا کو کہتے ہیں۔ جشنِ سادہ وہ جشن ہے جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب کے اول جشن یہ ہے۔ پھر من سے اگلے کی خوشی میں بڑی دھوم سے ایران

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا

مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی تھیں مخور کے لیے چاروں طرف رہیں کھلی

داستان کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گراتے تھے لوگ

گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر رطلی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ ستم کوئی بچاں رنگیں ترانہ چھپنے ٹھپائے نہ ہم

سینہ کوبی میں ہے جب تک کہ دم میں دم

ہم رہے اور قوم کے قتال کا ماتم را

۱۵۔ ترجمہ پندرہویں ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ

جو محفل ایکویشنل کانفرنس کے ساتویں جہاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا

یہ خاک۔ آج جس پر ہیں جمع اہل آرا یہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

اس باغ میں بہاریں جو گدگد چکی ہیں آنکھوں کے روبرو ہے گویا ساں ساں

کل جشن فتح تھا یہاں ہوا آج جشن شادی ہر دم عروج پر ہو سلام کا ستارا

بلین کے آج مہمانِ خاقان میں اور سلاطین اصغر ہے کہ دلی بلین ہے یا کہ دارا

پاگل دنیا میں پر دنیا کے غم سے برکراں
بچ ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادمان
ظاہر اپنا بند تھا دنیا کی رسمِ راہ کا

دل مگر اپنا تھا ایسا جیسا اہلِ بند کا
غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی
منقبض اُسکو نہ مکروہات میں پایا کبھی
دل کسی بادِ مخالف سے نہ کُلا لایا کبھی
تمہی دوراں سے چوں پر نہ سیل آیا کبھی

کی بے دراجن میں بزمِ عشرت کی طرح

عمر کاٹی دوئیخ دنیا میں جنت کی طرح

سٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
قوم میں جس کی مثالِ نیندہ کم دیکھیں گے یار
جگ کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار
رنگ ہو گا جن میں لیکن بونہ ہو گی نہ ہا

کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظرِ انجام پر

قوم میں اک ہموں کا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار
اہلِ علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار
ایسے حاصلِ خیر دنیا میں نہ ہوں گے کشتِ نا
جیسے مروجینہ تھے اسلام کے شہرِ دیا

مرا تھا کامل تو کامل تر نہ آتا تھا بھیاں

سورج آتا تھا نکل جپا چھپاتا تھا بھیاں

یابِ پہنچی ہے ہم میں نوبتِ قحطِ الرجال
ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحبِ کمال
دوسری ہوتی نہیں دنیا میں پھر اسکی مثال
ذاتِ باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بھی کمال

قصہ جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خوشحی نہ تھی دی گواہی جنے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی
جنے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی ہاتھ سے جنے بڑوں کی آن اب تک نہ تھی

بیگنا ہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا

پانو ایک سکاحالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جبکہ غمقا تھی دیانت بین اسما الزمان تھی امانت جسکی اُسکے پاس ہلکی یا گراں
خوف میں پاس اپنے رکھا اسکو شیل پسباں کی حوالے مالکوں کے جب ہوا اسن واماں

ایک عالم ناخدا ترسی میں جب میاک تھا

اشکا دامن تھا کہ ہر دھبے سے باہل پاک تھا

وضع عداوتی میں نہ تھا اسکا زمانہ میں بدل وضع میں اُسکی تغیر تھا نہ عادت میں خلل
وقت کی تاثیر کا اُسپر نہ چلتا تھا عمل انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل

اُسکے آگے ان نئے سانچوں کی کچھ ہستی تھی

اُس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو چین سے طرزِ زندگانی اختیار اُسیں فرق آیانہ وقت واپس تک زینار
کوہِ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار وضع اُسکی جو کہ تھی وضعِ سلف کی یادگار

قوم کے از یاد رفتہ خواب کی تعبیر تھی

عمدِ عالم گیر و کبہ شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علائق کا تھا گو بارِ گراں پر ہرک حالت میں ہلکی پُچھول سی ہتی تھی جاں

باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چُرا جاتے تھے یار ساتھ دینا تھا کس کا موت سے ہونا دو چار

یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

اگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر

جل نہ جائیں اُسکے شعلے سے کہیں خشک پتر

ہو رہا تھا جب کہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پُست لایا عیاں

ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب گویا بال سے باریک تر تھی راہ اُن کے درمیاں

راہرو ڈگدایں تھے اور راہ پر خوف و خطر

اُس نے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم دہ جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عند خواہ

مجرموں کے جرم پر دیوار و درتھے سب گویا پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُس نے کی

اہل انصاف اُس کو بھولے ہیں جھوٹے گھوٹے بھی

بایقین جن ملزموں کو اُس نے سمجھا بے خطا مارشل لایں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا

چین سے بیٹھانہ جب تک ہو گیا اک اک را جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت بر ملا

زردیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا

بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

نارساتھین و بینیں اہل صنعت کی جہاں

جا پہنچتی تھی نگاہِ دور میں اُس کی دہاں

شہر کے سب مرد و زن پیرو خواں - خرد و کلاں تھے قوی پشت اُس کی ایسے جیسے پشت سے مکاں

جسکو نفع دیدیا لکھ کر وہ یہ سمجھا کہ ماں زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں بھلاں

گو کہ ماتم ملک میں ہے اسکا ہر سو آج کل

پر گئی اسے شہر سیری جان ہی گونا گل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب بے رچا رہ گر جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر

خلق کو تکبیر ہو جن کی راے اور تدبیر شہر میں ہوں مرجعِ کل - ملک میں ہوں نامور

جمع ہوں مجموعہ خاں کے ذات میں انجی کمال

ہے یہ سب ممکن مگر مجموعہ خاں ملنا مل

رہتی اور رہ سببازی اُس کی تھی ضربِ لشل اُسکے کاموں میں یا تھی اور نہ باتوں میں دغل

امتحان کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں حل رہتبا زوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اُس رنج میں نکلا وہ خالصِ سطح

اگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے گندن جس طرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بیا نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا

اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

سچ زن تھا جبکہ دریا سے عتابِ دودا بکلاں

اگر طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا توئی مجلس کا نہ تھا پُرساں حال کے سوا

کرتے ہیں جو دعویٰ ہمدردی نوع بشر

اُنے ہل کر دیئے تھے اُنکے دعوئے سر

طبِ مسلمانوں کی لی اسکی سچائی نے تھاام ورنہ اب تک اُنکی ترکی چسکی ہوتی تمام

روقی طبِ جدید اور سپہیل خاص عام درس گاہیں اور دواخانوں کا اُنکے انتظام

دیکھ کر تھا اک زمانہ اُس کی خوبی کا مُقتدر

طبِ یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سُرخنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال جو سب آگیا تھا اسے میں زود محنتا دوں کی خلل

دیں مگر اُس کی سچائی نے سب رائیں بدل طبِ یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا

ایک طاقت اُنکے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفا خانوں میں خاص عام سب پر اُلچھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب

خلق کا پھر ملجا و ماوے اُسکا تھا طب اُسکے بیماروں کو گویا بوس ہوں یا جاں لب

سورہ تبیر و معارج کی خطا کا ڈرنہ تھا

موت کا ڈرنہ تھا مگر مُلک دو کا ڈرنہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سُن جن بھر و ساجقہ کرتے ہیں معلوم جو اُنسے امراض بشر

وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھکے انگلی نبض پر اُسی اک انگلی پہ تھے قریبان سو تھے راسخ

جاچکی تھی تجھ سے گولے شہر عظمت قوم کی ہو چکی تھی آبر و مدت سے رخصت قوم کی
 ہر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
 کیا دکھا کر اب دلانے کا سلف کو یاد تو

ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلی! کوئی اب ایسا مقبول جہاں نازش و ارجح کلافت مرجع ہندوستان
 ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا اندماں بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب

خود جیکموں کا مساج اور طبیبوں کا طبیب

ہو کوئی اب تجھ میں ہمیر و ایسا یتیم زماں و قہات زندگی کر دیجے گرائس کے بیان
 سمجھیں اک افسانہ ناوقف اُسے اور دستان ہے تعجب خیز اچھی سیرت محمود خاں

یادہ اک جو ہر الگ تھا جو ہر انسان سے

یا نکلتے اب نہیں ایسے جو اہر کان سے

اُس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دار اشفا خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانا بندھا
 صفت بیماروں کو اُس کے در سے ملتی تھی دوا فکر نذرانہ کا تھا اُن کو نہ شکرانہ کا تھا

اُس کے ہتھک سے جھک جاتا تھا سرور کا

اور غایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اُس نے سمجھا مان دولت کو سدا تھے برابر اُس کے نزدیک غنیا اور بینوا

اے گل پڑمردہ تیری کیا ہوتی بو باس ؟

دور آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا بچتے بچتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یہاں تیری پھرا نگلے و لعل بے با جسے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام سلافا کا

عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھایا

خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و کنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی پرنکی عرض ہنس میں تو نے اب بھی کوتاہی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دو کبریا

علم دین و شعر و حکمت ملتے تیاغ و نجوم

ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں مہم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بالا تھا ترا تھا جاں علم و ہنر گو دوں کا پالا تھا ترا
تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اُجالا تھا ترا پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا گسن سے جو وہ پھر گمنا گیا

چار دن کی چاندنی تھی پھر نہ دھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے و عظام قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخمور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے کچھ سیجا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا

لے گئی سیل قنائے کو بھی لے دلی بہا

گردشِ ہلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وا

تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پر اسے دارِ خلافت انقلاب آنے لگے غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

طالعِ شفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے

دولت و قبائل کا بندھن لگا رختِ سفر

تجھ سے لے دالِ سلوم اٹھنے لگا عالمِ ہنر

ہو گئے تیرے محدثِ راہی دارِ سلام کر گئے دنیا سے حلتِ تیرے مفتی اور امام

ہو گیا خست جہاں سے تیرا جاہ و حشام رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام

مجلسیں برہم ہوئیں یروزر بر دیواں ہوئے

خانقاہیں بے چرخ اور مدرسے ویراں ہوئے

چل نیے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب

جاگ جاگ آخِر سدا کو سو گئے تیرے نصیب اس گلستاں سے نہ اٹھی پھر صدِ اغذلیب

جنکو کھو بیٹھے نظمیں اُن کا کہیں پایا نہ پھر

جو گیا۔ اُس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

کر گئے احساق اور آدابِ بہ تجھ سے سفر گر گیا نظروں سے تیرا بجلالِ جاہ و فخر

بھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے لبِ گوہر تجھ کو اسے دارِ خلافت کھا گئی کس کی نظر

علم ہے باقی نہ اب دولت ہی تیرے پاس ڈ

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پرجوم کھیتوں پر تیری برآتے تھے اُنکے جھوم جھوم

آئی گلشن میں تیرے بھول کر فصلِ خزاں

تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں تر آشور نام تھے تمدن میں بھی پیر و تیرے جہوں را نام

اوستہ سیکھنے آتے تھے تجھ سے خالص عام شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں ارض و فضا میں اطرار میں

طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے اگر جو کہ تجھ میں چند سال ڈھل گئے سانچے میں گویا اُسکے عادات و خصال

اُسکے بن جاتا تھا بھلا نقصان انسان کا کمال تیرے پر چھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفاک

اتے ہی انسان کی کاپاپٹ جاتی تھی بھلا

چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی بھلا

تیرا معورہ تھا اک عالم میں موج اور تاب آن کر لیتے تھے بھلا ٹھیک جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آگے تجھ میں شیخ و شاب کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جگمگاتا تھا تجھ میں ترک و فرس و روم و رنگ کا

دستہ تھا گویا کہ تو گھاتے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبع دوران کا ہے جیسے اقتضا ہر ترقی کی ہے حد ہر بیت کی انتہا

جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا وقت اسے جان جہاں تیرا بھی آخر آگیا

ہند میں جو تھا محدث تھا وہ تیرا خوش چین تھی محدث خیراے پاتخت تیری سرزمین

تھا قلعہ بھی مسلم تیری خاک پاک کا

بہیقی وقت تھا ایک لکھتہ یہیں خاک کا

شاد و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیرؔ اب و گل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ منبر خیر تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر

آج جس دولت کا بازار جہاں میں کل ہے

تیرا قبرستان اُن دولت سے مالا مال ہے

طب میں گویا نانیوں کا سب سے آگے تھا قلم آن کر اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ جیسے نسیم

جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اسے باغ ارم بھرتے تھے تیرے اطبا بھی میحانی کا دم

ہند میں جاری تھی سے طب یونانی ہوئی

شہر شہر اس جنس کی بھیال تجھے از رانی ہوئی

خاک سے اُٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور اک جہاں شیوا بیانی سے ہے اُن کی باخبر

راس تھی آج ہے ہوا تیری سخن کو جس قدر سرو کو ہوگی نہ ساس اتنی ہوئے غاتفر

حُسن صورت میں اگر ضرب لاشل نو شا د تھا

حُسن معنی تیرا حصہ ہے جہاں آباد تھا

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم جنہیں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں مجوم

8 غاتفر مرقد کے قریب ایک قلعہ زمین پر جہاں سرو غریزی بیانی دہتی ہے فرشتہ ہر روز ۱۰۰۰ فرشتہ اور چھ دو شہر و قوم ترکستان میں توجہ جو من غریزی میں مشہور ہے

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز
 سال بھر رہتا ہے نقش اس انجن کا یادگار
 کر رہا ہے قوم کے سترکل کو یہ مجمع وسیع
 اتفاقا اگر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد
 ہے کبھی ان شرائط باران اور کبھی ہر قحط آب
 کال ہے گرائن برس تو ہے سماں اگلے برس
 ویک تو پختے ہی یہ پکے کی ڈھیسے آنچ میں
 کچھ اُبال آ یا تو بے اُسمن سمیت ہے یہی

انجن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں

ایک دن کا کام کچھ روم کی آبادی نہیں

۱۲۔ مسدس مرتبہ ۱۳۰۰ ہجری

مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
 اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں مضمون

تھے ہنر و تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر بخوم
 تھا فاضلہ تیرا جاری ہنر سے ناشام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا

نام روشن تجھے تھا غرناطہ و بغداد کا

بیری طینت میں دلچت تھا مذاق علم دیں
 جیسے اتنی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہیں محفل غنیمت اور بے نوا کوتاہ دست
 جو قوتے اُن کو ملے ہیں کام میں لائیں انہیں
 فرض ہیں چائے و تمہ خالق اور مخلوق کے
 قوم ہو گزرتا تو ان تو تقویت بخشیں اُسے
 گونجات انسان کو مکرویات دنیا سے نہیں
 کام دنیا میں سنوارے ہیں جھوٹے قوم کے
 سارے بھگتاتے تھے باتیں تھے نیک کے کام
 سب کی پرتی ہے انہیں کے ست مبارک نظر
 تاکہ زندوں کی طرح ہوزنگی ان کی بسر
 اُن میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار اٹھوں بہر
 کیونکہ اُسکے ضعف کے ہوا ان کی قوت کو ضرر
 جسے بچا گوشت سے ناخن چھٹانا ہے مگر
 تھے نکتوں سے وہ مکرویات میں آلودہ تر
 اور دائیں سے ہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جس طرح اس انجن کے ٹکن آتے ہیں تمام

قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام

قوم کو ہے آس جن کی وہ جماعت ہے یہی
 اتفاق قوم ہے اقبال دولت کی دیل
 مال و دولت نامبارک ہے نہوگر اتفاق
 بھان وکیل ایک ہو شہر اور ملک کا قایم مقام
 رائگاں جائے گایا روک نہ یہ سچ سفر
 فرد فرماتے ہیں جو جاتے ہیں بھائیے مجتمع
 تم ہمارے کام آو ہم تمہارے آئیں کام
 قوم کی خدمت میں ہے ضمیر رابیت کی شان
 جس سے جان آتی ہے مردوں میں طاقت یہی
 رانی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی
 قوم جن دولت کی بھوکی ہے وہ دولت یہی
 دانہ کو کرتی ہے جو خرمن ہرکت ہے یہی
 رحمتیں جی ٹفیل ہیں رحمت ہے یہی
 ملتے ہیں جس کی بدولت نالہ ملت ہے یہی
 جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت یہی
 جو کہ بچا آتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

شاہ ہوں یا ہوں گے اور نو کو قوت انے ہے
 نوع انساں میں بقائے آدمیت انے ہے
 رونق بازار جنس علم و حکمت انے ہے
 ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت انے ہے
 آدمی مصداق رحمانی خلافت انے ہے
 آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت انے ہے
 آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت انے ہے
 ہے جہاں قوموں میں یک رنگی و وحدت انے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
 آدمیت سیکھتے ہیں انے سب چھوٹے بڑے
 یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یہاں
 پاؤ گے انہیں طبیب انہیں ادیب انہیں خطیب
 پاؤ گے ان میں مہندس پاؤ گے انہیں حکیم
 کرتے ہیں خلاق اونے اور علے انے اخذ
 ان میں قوموں کے ہیں صالح انہیں ملکوں کے کیل
 پھونکتے ہیں روح قومیت یہی اندامیں

دم سے ہے وہ لٹکے قوم کا سارا نظام

یہ اگر بجڑے تو سبھو قوم کا بگڑا قوام

ہیں مفاسد گرد و پیش انکے فراہم سرسبز
 ہے انہیں بھی شر سے یہاں بچ بچ کے ہنسنا عمر
 اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر
 ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطور
 وہ جو اڑنے کے لیے حق نئے تھے بال پر
 جسمیں چھنس جاتی ہے کبھی شہاں ٹیٹھا جان کر
 رہ سپر پڑتہ والا ہو سیدھی راہ پر

گر نہ ہو بہر حال میں ان کی مصالح پر نظر
 کھیلتی ہے جس طرح بتیں دانتوں میں باں
 گھاٹیاں فقر و غنا کی انکے ہیں دو نو طرف
 ایک جانب پستی فطرت ہے اور دُور ہمتی
 جھک پڑے گر اس طرف تو مفت کھو بیٹھے نہیں
 دھل گئے گر اس طرف تو اُس بلا میں چھنس گئے
 برکتیں اللہ کی اُس قوم پر جس قوم میں

اس کھن منزل میں ہے یثیا ہی اک بے خطر
رکتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین
اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک
ٹنکے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و نا
لذت فقر و غنا دونوں سے ہیں وہ آشنا
جو گذرتی ہے گدا پر اس سے ہیں وہ باخبر
استحاث دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے
اس لیے جب دیکھتے ہیں عسرت ابنائے جنس
اور نہیں کرتے زبان طعن بے دردی سے ما
ست کی بے اختیار تشنگی مخمور کی

میں اوصر کھڑا اور چڑھائی ہے اوصر الیڑ کی
ہیں حسد اور کینہ کے امراض ٹھنک سے بری
دیکھ کر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی
لکے پھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خفا کبھی
اغنیاء میں ہیں فقیر اور میں فقیروں میں غنی
ٹیونکہ حالت گاہ گاہ اُنپر بھی گزری ہے یہی
ٹیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس کے بدستی ہی
جوش ہمدردی سے بیکل ان کا ہو جاتا ہے جی
جب کہ سنتے ہیں کسی غم کی از خود فحشی
واردات ایک ایک کی ہے سرسبز اُنپر کھلی

جنت اور دوزخ ہے سب اعراقیوں پر جلوہ گر

گندم اور زقوم دونوں کے ہیں پیش نظر

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت لانے ہے
شکلیں اکثر انھیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل
ہے انھیں کے دم سے جو ہے گرمی ہنگام آج
ہے جہاں دولت ہی میں نظم دولت کے کفیل
ہاتھ میں رکھے ہیں جتنے عقل و دانش کے پرکام

منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت لانے ہے
بھائیوں کے بازوؤں میں درو و طاقت اتنے ہے
ساری قومی مجلسوں کی زیر بنیٹ لانے ہے
ملک کی دولت میں ہو جو خیر و برکت لانے ہے
عقل و دانش میں جو جن ملکوں کی شہرت لانے ہے

ہضم کرنا اور پچانا مال و دولت کا ہے پس
ورنہ مال و جاہ و کمالت کا جہاں آیا قدم
عقل ٹھیراتی ہے جو فسادِ نساں پر حرم
فقر میں تھا نفیس دلوں و اماندہ جس پر داز
خواہشیں یوں نفس میں اب مہدم بڑھنے لگیں
آپ کو گننے لگا بالا تر از انساے جنس
سُرف بے زر ہو جیسے قرض خواہوں میں گھرا
بجھک پڑی طبع وئی گر بخلِ خست کی طرف
اور اگر بھوت اُسکے سپر چڑھ گیا انس و فکا
اُگیا غالبِ طبیعت پر گر استقامتِ حرص
باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاقِ اقتدار
نفسِ انسان میں اگر بالفرض ہو کوئی کمال
اور وہ بے سلبِ دمی سے آدمیت کے خصال
کرئیے اُسکے لیے سب مال و دولت نے حلال
اُسکے ثروت نے دیئے پروا سطر اُسکے نکال
منہ میں حبِ طمع دیوانہ کے گونا گوں خیال
چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پروال
خواہشوں میں اس طرح جسکڑا ہوا ہوا بال
ہو گئی فتنہ و زن پر زندگی اُس کی بال
پھر نہیں گنجینہ قاروں کچھ آگے اُسکے مال
ہے سمندر سے بھی اُس کی پیاس کا بھجنا محال
جو قدر ثروت میں ہے دشوار پاسِ اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور سیٹھے بھی اگر

دیکھ اے روباہِ نفیس دلوں حذر اُن سے حذر

ہے عجب دنیا میں نعمت و مہمانی زندگی
چھین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہو
فقر و ثروت فی السُّل ہوں و فخر اور جنت اگر
وخلِ شیطان کا ہو جہنم ایسی جنت کو سلام
فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنہ سے بڑی
یہ جو ہے برزخِ میانِ کمالت و دستِ تہی
مانگے ہیں ہم حذر و فخر سے اور جنت سے بھی
منزلِ عراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگ
وہ سبک تر دانہ خردل سے آتے ہیں نظر
فقر و حاجت میں نہواں سال کو جب صبر و شکیب
پھر نہیں کوئی بُرائی فقر و حاجت سے تر
بھیک بنگولتے جو اکھلوانے یہ چوری کرانے
پت گنوائے آبر و کھوئے پھرائے دربار
ہوئے محتاج سے طاعت نہ یاد اللہ کی
لے سکے محتاج جو رو کی نہ بچوں کی خبر
کہ زباں آلودہ اُس کی شکوہ تقدیر سے
اور کبھی بوجھاڑ اُس کی آسمان پر سپر
اگر خیالوں کی نیت پر کبھی آجاتے وہ
ہو نہ سب دشتم سے سیری اُسے دودھ پر
اُسکے زہر آنا کہ ہو جائے مذاقِ بزمِ تلخ
کھولے غیبت کا دفترِ ان ویت کی لگر
کہ وہ بے عام کی مانگے دعا اللہ سے
تاکہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیرِ زبر
اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب
بے حلاوت اُسکی دنیا اور نذب اُسکاویں
رات اُسکی حسرت آگیں اور دن اندھنگیں
گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا
فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعت نہیں

پرزدی شروت سوا کے شکر کی طاقت نہیں

نشہ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال
اس نے مرد آرمائی تھی بہت شکلِ سنبھال
نفسِ تارہ اور اُسچھپڑ ماراں جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جہیں ڈال
جاد صر صرگ کو اسطرح بھڑکانی نہیں
جسطرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکا تا ہر حال

جب ہوتے بھوکے تو بخشتی تو نے نانِ نازخیز
 پر نہ اتنی۔ معصوم و احشاء جو گز سے گراں
 جب ہوتے پیاسے تو بخشتا آبِ شیریں و زخک
 پر نہ ایسا۔ ہو صراحی جس کی یاروں سے نسل
 ڈھانکنا چاہا بدن جب۔ تو دیا تو نے لباس
 کھانے پینے کو کیسے برتن ہیں تو نے عطا
 سونے اور آرام کرنے کو دیا بسترِ جہین
 رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہمو جبرگہ
 آنے جانے کو دیئے دوپاں و بھیاں تو نے نہیں
 راہ اور بے راہ یکساں جبکو ہنگامِ حرم
 کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر
 سیم و زر وقتِ ضرورت ہمو تو دیتا رہا
 آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور استیاز
 نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں
 راحتیں اکثر میں سر تین تکلیفوں کے بعد
 تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہمیں پیر عیاں
 تاکہ کھو نہ ٹھہیں نہ ہم ان راحتوں کو ریاں
 پر نہ ایسی۔ جس سے ہوں محسوس ہوتا زماں
 پر نہ ایسی۔ تختِ فرعون کا ہو چہر گیاں
 پر نہ اتنا۔ ہو گجہانی میں ججی بیسم جاں
 پر نہ ایسی۔ جس سے ہوں محسوس ہوتا زماں
 تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہمیں پیر عیاں
 تاکہ کھو نہ ٹھہیں نہ ہم ان راحتوں کو ریاں

وقت پر کرتا رہا بارانِ رحمت کے نہال

قط اور طوفانِ دونوں سے بچایا بال بال

اخذ رائس فقر و ناداری سے سو بار اخذ
 لوٹتی جاتے ہیں بنِ ججی بدولت شیریں
 چاہو سی جا کے کرتے ہیں غنی ہوں کی حقیت
 ناکوں کے ناز بچا سہتے ہیں اہل ہنر

ختم کر حالی سپاس صدرِ اعظم
تقویت سے جس کی ہر شکل ہماری حل ہوئی
پھر ادا کر جان و دل سے شکرِ صدرِ انجمن
جنے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن
ایکے اذن صدرِ مجلس کیجے پھر قصدِ وطن
باندھ لیجے خلد اب رختِ سفرِ ڈر ہو کساتھ

بالِ بالِ پنا ہے جسے شکر میں جگاڑا ہوا
انجمن کے منعقد ہونے کی دی جنے رضا
جسکے قدموں میں یزید ہے کہ دیں آکھیں بچھا
قوم کو دی عزت اور انجمنی اُمیدیں دیں بڑھا
ورنہ ہے حالی دکن کی دلفریب آبِ ہوا
قافلہ سے چھٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

۱۱۔ قطرہ مرتبہ ۱۳۰۹ ھ ہجری

بمقام حیدر آباد دکن

یہاں بولا کر دی ہے جو غرت ہمیں مگر نے
عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
خیرت والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے
جولیاقت اُس میں ہے درکار وہم میں نہیں
شاعری جسکو سمجھتے ہیں کمالِ انباے دہر
چند نظم میں انجمن میں اسلئے بنے پڑھیں
شکر کرنا تھا ہمیں **شکرِ عالی** کا ضرور
اور جبکہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں
گر چہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں

۱۳۰۹ ھ ہجری میں جو راقم اور مولانا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگانِ قوم آنر بیل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علی گڑھ میں کالج
کی طرف سے بطورِ فوٹویشن کے حیدر آباد دکن میں بحضورِ سرکارِ عالی نظامِ حاضر ہوئے تھے اُس موقع پر ایک عام جلسہ بصندارتِ نوآ
دعا سلام بہادری شہرِ باغ میں منعقد ہوا تھا۔ جبیں راقم نے اور مولانا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں شکرِ عالی کے شکرِ یہ
میں پڑھی تھیں جلسہ کے بعد جناب صدرِ انجمن نے مجھ کو اور مولانا محمد شبلی کو خاص طور پر ہمارے نظمیں دوبارہ سننے کے لئے دو قافانہ پر طلب
فرمایا تھا وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اسی وقت سوزوں کی گایا تھا راقم نے پڑھا تھا ۱۲

تجسّرح ہوتی ہے بانی سانپ کی طے پناہ
 ہے بلاشبہ۔ دارالملک آصف جاہ بھی
 ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستان میں اتنا
 مرتبین اور خاقان ہیں۔ مدرسے اور مدرسین
 حج بیت اللہ سے۔ جو ہر مسلمان پر ہے فرض
 اول آنا چاہیے یہاں استطاعت کے لئے
 خرچ سے ماتھے اک مسلمان کا ہو گرا تیریں تنگ
 خواب آتے ہیں دکن کے اُسکو سوتے میں نظر
 ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں
 چلتے چلتے اُن کی گاڑی بھی الٹ جاتی ہے جو
 ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال
 تھا ہمارا اک اُس میں معور اہل فضل و جاہ
 ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اُچھلے نہ پھر
 کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں اُن کو نظر
 ہے وہ زورق فی اشل سرکار آصف جاہ کی
 ہے و جا۔ جو قوت تک پانی سمندر میں ہے

ہو گا لمجا اب مدینہ بھی یونہی اسلام کا
 ہند میں اب مرکز اسلام بے رو و ریا
 دولت عالی نے چُن چُن کر لیا سب کو بلا
 سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون چرا
 ہے دکن آنا مقدم۔ شک نہیں اس میں ذرا
 کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا۔ ناروا
 ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا
 قوم کا بچہ مٹل سے جب ذرا آگے بڑھا
 اور مدد کو جن کی وصال حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا
 کھینچنے کو اُسکے جاتا ہے یہیں سے بیٹھیا
 اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں پا
 لطمہ امواج نے پُر زے دیئے اُسکے اُڑا
 بچ رہے ہیں جو وہ ہر سوار تے میں سوت پیا
 اُس محیط بی کر اس میں ایک زورق کے سوا
 ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جکا آسرا
 یارب اس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

دولتِ عالی نے حق سب کو برابر میں دیئے
پارسی ہندو و مسلمان یا مسیحی کو تو ہی ہو
ہم کو بچاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
قصہ کو تہ۔ بار جب ہم کو ملا ہمار میں
دیکھ کر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک
حضرتِ والائے جس شفقت سے کہیں نہیں قبول
جس توجہ سے سنی رو دادِ قومی در سگاہ
جب سے کلچ کی علی گڈھ میں بنا ڈالی گئی
جو لگایا تھا درخت اُس کی ہمیشہ لی خبر
اب کہ وقت اگر پڑا تھا بانی کلچ پہ سخت
شکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اول کل
خود علی گڈھ کلچ اور اُس کے درود یو اسب
ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تک اسلام کی
کی ہے سر سپند نے جو کوشش فلاح قوم میں
پر یہ سترید سے بیڑا پار ہونا تھا محال
تھا پڑا سید کا۔ چلو چھو تو خشکی میں حجاز
ہے روایت۔ جبکہ حیرت کر کے ختم السلیں

ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں بچاں دوسرا
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا
رہگذر کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا
کہہ نہیں سکتے کہ میداری تھی وہ یا خواب تھا
واقعہ مورا اور سلیمان کا ہمیں یاد آگیا
اسپہ گرجاں اپنی ہسم قرباں کریں تو ہی بجا
شکر سے اُسکے نہیں ہو سکے ہم غم سن برآ
دولتِ عالی۔ مدد کرتی رہی اُس کی سدا
دبدم پانی دیا یہاں تک کہ بار آور ہوا
دولتِ عالی نے شہرِ طرد ستگیری کی ادا
کی اُسی دریا دلی سے اُن کی پھر حاجت روا
راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا
جیتے جی ہوں گی نہ اُسکے طوقِ منت سے رہا
اُس کو ہے اسے اہل مجلس اک زمانہ جانتا
دولتِ عالی اگر بستی نہ اُس کی ناخدا
دولتِ عالی نے اُس خشکی میں گنگا دی بہا
پہنچے شرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

کی ہے نواب قیصر الملک نے جو محنت
 یہ مقولہ ہنس میں مدت سے ہی ضرب لاشل
 ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری
 وارث ملک دکن ہے آج وہ محبوب خلق
 ہم کہ ہیں و کمور یا کے ہمدرفت میں پے
 جانتے ہیں ہم کہ پستی ہے عینت کس طرح
 کرتے ہیں کس فخر اور افسوس سے تسخیر قلوب
 کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر
 ہے یہی شاہ دکن کی گلہ بانی کی دلیل
 چوچھنے گھنے کی اہل ملک سے حاجت نہیں
 دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم بڑا
 راہ میں دیکھے تھے ہمیں کوہ اگر گردوں شکوہ
 عالموں کی سخت گیری سے ہیں سب آزار بچاں
 اغنیاء میں ہم استغنائیں پاتے کہیں
 جتنی بچاں تو میں ہیں سب کھتی ہیں باہم میل جول
 ایک کے تہوار میں بے عذر میں سارے شریک

اُسے گفت کو سفر کے دل سے بالکل دھو دیا
 جو کہ جا پہنچا دکن میں۔ بس وہیں کاہور ہا
 جو دکن میں آ کے دیتی ہے وطن دل سے بھلا
 نام پر دیتا ہے جسکے جان ہر چھوٹا بڑا
 اس و آزا دی کی ہنسنے کھائی ہے برسوں پہلا
 کس طرح ہوتے ہیں مقبول جہاں فرمانروا
 کس طرح ہوتے ہیں دل میں خلق کے تحسین فنا
 تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اُس نے ادا
 گلہ اپنے گلہ باں پر جان دل سے ہے فدا
 اُن کی خوشحالی پر اُن کی تازہ روئی ہے گوا
 خلق کو سبزدیکھا آ کے یہاں اُن سے سوا
 اس کے دار الملک میں یکے محل گردوں نما
 مینوا سے منجسم اور منجسم بڑھ کر بے نوا
 جیسا بے پروا نظر آتا ہے یہاں ایک اک گدا
 بے تعصب بے تکلف بے تصنع بے ریا
 ایک کی تقریب میں ہند میں سب اور ہم نوا

8۔ اشارہ ہے اس عجز کی طرف جو کہ فخر و قدر و ہر اہم و نام نہان نے بدوہ جیلو آلود کے باہر جانب جنوب بہر پرند خیر صرف کر کے اپنے رہنے
 کے لیے بنوایا ہے اور اس کے نام ملک بنارکھایا ہے

سیرت عادت میں اُس کی نکلے آن اجداد کی جو ہر حلاق فاروقی ہوں اُس میں جلوہ گر
 رات دن رکھیں اُجالا صورت شمس و قمر
 ملک آصف جاہ میں سر سماں جاہ اور
 ۱۰۔ قصیدہ مرتبہ ۱۳۰۹ ہجری

اے صفر کی دوسری۔ روز و شب نہ جبراً ہم نہ بھونگے کبھی وہ تیری صبح جان نثار
 ہنسنے رکھا آکے جب بلدہ کی صحر میں قدم پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا
 عزت قومی۔ ترستی تھیں سدا آنکھیں جے اُسکے کچھ آثار دیکھے ہنسنے پھاں بشکر خدا
 کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک دستِ گم آکے بلدہ کے سوانہ میں لگا اُس کا پتا
 بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم جھولیاں ڈالے گلے میں در بدر دیتے صدا
 پہنچے لینے اُن کو وہ اعیان دار الملک دولت عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا
 قوم کو ہے جنبہ فخر اور ملک کو ہے جنبہ ناز سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے تو
 غلطی نے ہمیں بختا اقامت کے لیے وہ سراب تہاں غلج ہو جس سے جنت کی فضا
 ہم غریبوں کو سمجھ کر اک سفارت قوم کی دی وہ عزت۔ شکر جسکا ہو نہیں سکتا ادا
 پیشتر مہاں نوازی کا فقط سنتے تھے نام آکے پھاں سمجھے کہ ہے مہاں نوازی خیر کیا

اس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسان جاہ بہادر حضرت عرفان حق رضی اللہ عنہ لاد میں ہیں ۱۲
 اولہ یہ قصیدہ ۱۳۰۹ ہجری میں مقام حیدر آباد دکن جب کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقا
 جن میں سے ایک رفیق بھی تھا بطور پیشکش کے محفل کا بیچ علی گڑھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے
 ایک جلسہ عام میں پڑھا گیا تھا۔ جسے صدر انجمن جناب نواب وقار الامیر بہادر تھے ۱۲ عالی

زمیں پر سایہ فگن جب تنگ آسمان سے رہے دکن چھوڑ نظام کا سایہ
 تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لاقند سو یہ چگاندہ ناچیز شیکش لایا
 یہی بس اُسکے لئے ہو گا مایہ ناز بش جو عظمیٰ الم عمر نے قبول فرمایا
 وقطعہ مرتبہ ۱۳۰۸ ھ ہجری

تینیت ولادت فرزند ارجمند در شہستان اقبال جناب نواب سر آسمان جا بہادر مدار الحاکم کراچی

فیض ب ذوالمنن سے مراد اسے ہلک کن
 دی بشیر دولت دیں کو وہ چیز اللہ نے
 جنکو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے
 جسکے مٹنے سے ہوا اوڑھ منون قضا
 جسکے بدلہ میں علی الرغم شہادت پیشگاں
 جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی
 جس سے مستفی ولی ہیں اور نہ عارف کے نیاز
 صدر اعظم کو دیا حدش کرفاقی زلف
 یہ پسر یارب تجی عتبرت خیر الورے
 صدر اعظم کی طرح دربار آصف جاہ میں
 دولت و ثروت کو اُسکی ذات سے لگجا آشیان
 نائبِ ولت کا نخل آرزو ر لایا شہر
 جس سے پایا دیدہ یعقوب نے نورِ بصر
 حق نے دی جسکے حطا ہونے کی سارا کو خبر
 جسکے پانے سے ہوا یوتب مرہون قدر
 حق سے ختم الالبیہ پانے سے شہیر و شہر
 جو ہے ماسل عمر کا اور زندگانی کا مثر
 جس سے ہیں اجداد زندہ اور اکا جہ نامور
 خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر
 پائے عمر خضر زیر سایہ ہر پندر
 جایگاہ قرب سلطانانی ہو اُس کا مستقر
 زیار علم و ادب سے ہو مٹھی اس قدر

و غایب شیر مگر وقتِ رحمِ موثرِ ضعیف
 کسی کی آہ سنی اور دل اُن کا بھڑک آیا
 وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج
 جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا
 وہ چونک اٹھے کہ گویا قیامت آئی پچی
 جو در پہ آکے کوئی داد خواہ چلا آیا
 نشاط و عشرت جاوید کی ہے انگوٹھ
 دل ریا جنکو عنایتِ خدا نے فرمایا
 سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سیف
 سوا آنکھ سے وہ وزیرِ دکن دھکلا یا
 بشیرِ دولت و دینِ عظیمِ امرا
 نہیں ہے جسکا کوئی قربِ شہ میں ہمایہ
 جظلِ حق ہے عیتِ سرِ شاہِ دکن
 تو عظمِ الاہرِ اخلِ حق کا ہے سایہ
 ہمیشہ جسکو ہے بہبودِ ملکِ مدِ نظر
 رفاہ و امنِ ممالک میں جسے پھیلایا
 اٹھایا فتنہ نے جب سرِ فرو کیا اسکو
 پڑا عمل میں جہاں عقدہ اُسکو سلجھایا
 بنائے نظم و نسق جسے رکھی سورِ پر
 مشیرِ کارِ خسرو پر دروں کو ٹھیرایا
 دکن کو جسے کیا مرجعِ خوں و عوم
 دکن کا جسے کڈ نکا جہاں میں بجوایا
 نہ کوئی ملک میں سرکشِ زمانہ نافرمان
 جھاڑِ ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا
 بلِ انتظام کے رشتہ میں پڑے تھے بہت
 سو تھکے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا
 لگا گئے تھے وزیرِ انِ رفت جو پودا
 وہ صاحبِ مینِ زیرِ زماں کی پھل لایا
 ترقی اب یہ تمدن میں کی ہو ملدہ نے
 کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہی شرمایا
 زبانِ حال سے ماضی کو دیکھے کی نہایت
 اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکلا آیا
 خدا دراز کرے عمرِ عظمِ الاہرِ امرا
 دکن کو جسکی حکومت نے دن یہ دھکلا یا

اُدھر ہے فصل بہار اور اُدھر ہے عیا العطر
 کھلے ہیں سکے عوضِ دشت میں کس وِٹھوں پل
 ہزاروں کسرو خراماں میں شہر میں ہر سو
 اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم
 مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب پہنچ
 فریفتہ ہوئے جو ایسی لہری خوشیوں پر
 خوشی ہو جس سے عبارت وہ ہو خوشی انہی
 جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
 جنھوں نے ناک کے امراض کو کیا خنص
 جنھوں نے خلق سے اپنا بنایا غیروں کو
 خبرِ رضیوں کی بی جاہلوں کو دی تعلیم
 ہوا زمین چس سالِ آسمان مُتسک
 ہوا سے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد
 سدا غریبوں کی امداد پر نہیں جو تیار
 ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
 نہ سمجھا آپ کو اک پاس بان سے بڑھکر
 نہ پانی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے
 سماں نشاط کا ہی شہر و دشت پر چھایا
 جو غم سے شہر میں آج ایک لہر کھلایا
 جو دشت میں کئی پودا ہے آج مہر چھایا
 تو سمجھو غم کا عوض غمزدوں نے بھر پایا
 اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اُترایا
 انھوں نے آبِ کا دھوکا سب پر کھایا
 جنھوں نے خلق میں ذکرِ جمیل بھیلایا
 جنھوں نے علم کا بجھتا چس لہجہ اُکسایا
 جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرایا
 جنھوں نے لطف سے حشری کو لو کو پر چرایا
 کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا
 رینہ اپنی داد و دُش کا انھوں نے برسایا
 فضا سے دہر کو خلقِ حسن سے مہکایا
 لیا نبھال سے جس نے ماتھے پر کڑیا
 نہ مانگ سکے تھے جو انکے گھر یہ پہنچایا
 انھوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا
 ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلویا

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
بخت اُس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو فیروز
حامی علم و حسد یدار کمال انساں
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احسان
اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جنت تک
اسماں جاہ سے ہو تقویت ملک و کن
اور رہے ملک و کن بلجا و ماواسے جہاں
ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیبان
دولت قیصری و دولت آصفیاجاہی

۸۔ قصیدہ ہر تہہ ^{۱۳} ہجری

تہنیت عید الفطر بہ جناب نواب سر اسماں جاہ بہادر مدار لہم ام کلر عالی

میر صیام گیا اور روز عید آیا
گیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی سجالایا
کہ اپنے صبر کا انعام پہنچے بھر پایا
کہ تین روز کے پیاسوں کا روزہ کھلویا
کہ جیسے طفل ہو کتب سے چھوٹ کر آیا
کہ گنج انھوں نے ہے گویا خزانہ میں پایا
کہ دن خزانے نکالیں کا اُن کو دکھلایا
خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج سنوایا
خوشی نے وی ہے مانہ کی کچھ پلٹ کا یا
ہے ایک خزانہ سے نعم نے سب کو چھکوا یا
میر صیام گیا اور روز عید آیا
گیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
رہیں منت ساقی میں بادہ غوار تمام
گئے ہیں ایسے ساجدے مختلف خوش خوش
شگفتہ آتے ہیں اس طرح عید گاہ سے لوگ
حسین چاؤ میں پھولے نہیں تھاتے آج
غزیرہ دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
چیکم ہیں متفکر نہ زاہد نہ سہرہ
غنی پیشال میں مست اور گاہیک کمال میں

ہاں مگروں میں ہے فیضِ سارنی جن کی
 میں مربی ہنس رہے ہنسی کے جھٹک
 آسمان چاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار
 یہاں وہ اُن کھیتوں کو دیکھ گیا ہوا پانی
 قوم اس وقت ہو تعلیم کی جستنی محتاج
 عزت - آسودگی اور ملت و مذہب اُن کا
 پھر نہ در انکی کچھ آنکھوں میں خلیق کی بلند
 آسمان چاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے
 مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں مستان
 اُن کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم
 کرتے ہیں زندہ جاوید بنی نوع کو - جو
 ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی - جس کا
 یہی بخشش ہے یہی جو ہے اس بحسنات
 یہی امداد ہے جس سے ہوتیں قومیں سبز
 یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس ضعیف
 دی لگا ایک نے پانی کی سیراہ سبیل
 اُس کی خواہش تھی کہ ہوتے ہیں پیسے سیرا

ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی چیلہ برائے احسان
 خار و گل و نو کو کرتا ہے نہال آب رواں
 ملک میں اُسکا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جوان
 آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگران
 ہے وہ عالم پہ ہویدا - نہیں محتاج بیاں
 ہو نہ تعلیم تو میں سب کوئی دن کے مہاں
 اور نہ وزن اُن کا ترازو میں حکومت کی گراں
 درد کا جان لیا اُن کے کہ یہ ہے درماں
 جن میں کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشان
 چشمِ عالم میں سیاحتی پہ اپنی بڑماں
 بدل کرتے ہیں پتے تربیتِ اہل زماں
 ملک پر قوم پہ تادیر رہے گا احساں
 جس پہ موقوف ہے بہبودی نسلِ انساں
 یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملکِ بادل
 جی سکت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس گراں
 کی ہمیشہ کے لئے ایک ہے وحاں نہرِ زماں
 اس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشان

اور کہتے کہ یہ قوم کی کشت مراد قومِ ہند پر بدست کی طرح بھانڈا ہے
 یہ قصیدہ اتمامِ مرقومہ شمسہ جیری
 سرستیا احمد خاں دامادِ بھادوہم کی شان میں

پہاں نہیں ہے یا دوسرے پر گھاہا	جو بال آگن اپنا اور اپنی قوم کے
جو اک لکیر باقی جس نقیب ہیں تم	خود سانپ نہ بچاں سے کہ کچھ نہیں کیا
اسپر بھی اسے غریب ہے جاے فرنگو	دینوں میں دین شہادت کے نہیں کیا
قلب ہے دو تھمار جو گھر ہے جب پلا	بادی ہے دو تھمارا جو تسم ایما
دی ہے دوسرے کل حق نے کتاب کا	جنے شہر یوں کو شیر و شکر ہے
بخشتی تھیں حکومت تھیں شاکی	دوڑاں سے اس وقت سے یوں نہیں را
اس دورِ آخری میں جیوں گے چلے تم	اک ماشینی تھارا صلح کھڑا کیا
سر سبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں	فتووں سے قوم کے گو کا فر ٹھہر چکا
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال پنا	یاروں پہ جنے سب کچھ قربان کر دیا
دار اس پر قوم کے ہیں وہ قوم کی ہر	قوم اُس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا
درہم سے اور قلم سے دم سے قدم سے	جو کچھ کیا ہے اُسے وہ کس سے ہو گا

۸۔ یہ قصیدہ اس وقت لکھا شدہ ہے کہ اس وقت معلوم کا بنیادی پتہ روٹن اپنے اہل سے رکھ چکے تھے
 اور سرستیا کے کامِ تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مگر وہ بکرات دینوی کے ہرمانہ ہر سکا

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دوردست
 بارِ محصولات سے چھانتک ہوئی ہلکی کہ اب
 خیر تیری۔ ہے حصارِ عافیت تیرے لیے
 نعمتیں حق کی سٹمپنگی سمیٹتی زمیندار
 خواہنِ نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم
 ہے یقیں تجھ پر پڑے اصحابِ محشر کی نگاہ
 دولتِ اقبالِ روزِ افروز سے تیرے ہو عیاں
 پرورش پاتی تھی جتنے سایہ دولت میں قوم
 کچھ گھرنے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر
 یہ اگر بنتے نہ کشتیاں اس طوفان میں
 رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل
 رل گئے تھے گوہرِ رُجِ مشافتِ خاک میں
 ہو رہے تھے دو دوانِ علم و دولت جاں بے
 گول میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم
 ہے یہ وہ احسان جکے بارِ منت سے کبھی
 تیرے نظرِ تربیت میں گرنا یہ نو نہال
 فرض اگر کیجے اسے دیوارِ کاخِ آرزو

اسے خوشا وہ سز میں جسر ہو تو فرماں روا
 بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے وقتا
 سیر ہو کر تجھ کو دیتے ہیں بہت بھوکے کھا
 ہر بھلائی کی ملی دہ چنہ گر تجھ کو جزا
 نام پھر زندہ ہوا خواہنِ خلیلِ اللہ کا
 جب کہیں کہنے کیا حق میں سزائی کا ادا
 جو کہ حامی قوم کے ہیں اُن کا حامی ہے خدا
 لے گئی اُن کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا
 ہند میں اب تیکہ گاہِ امتِ خیر الورے
 کشتیِ اسلام تھی منجھدھار میں بے ناخدا
 وزنہ اُن کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا
 خاک سے تو نے اٹھایا اُن کو اور بخشی جلا
 تو نے لیک اک کے چوایا خلق میں آبِ بقا
 آبیاری سے ہے تیری ہی اُسے نشو و نما
 قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی بے روے و ریا
 ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اسکی طوبیٰ سے
 تو وہ پستیاباں ہے جس سے اُسکی قائم رہنا

۴ قصیدہ حدیثِ ناتمام
نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کی شان میں

خل حق کلب علی خاں جسکے بادل جوڑے
ہند سے لے تا عرب میں خاص فی عامی گوا
صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکام دیں
زائرِ قبرِ نبوی اور حاجی بیت اللہ سے
شاعری میں فرد و موسیقی میں فارابی عصر
صوت روح افزا و صورت آیہ صنعِ خدا
دولتِ برطانیہ پر اُس کی فرزند کی حق
دولتِ عثمانیہ کو اُس سے پیوند و لا
اُسکی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب و جلیس
اور موت پر میں نازاں مجرم و اہل خطا
اُسکی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب و جلیس
مربحِ ارباب علم و فن ہے اُسکا بابِ فیض
ان کو چن چن کر یہاں لایا چمنِ بندِ سخا
کلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ باردار
اور محدث ہیں تو ہیں سرِ شہدِ علم و ہدایہ
گر مناظر میں تو ہیں سرِ دفترِ اہل کلام
نمکِ پیناںِ محبتی خرو گہِ گدازِ شفا
زمرہِ اہل یقیں یا مجمعِ اہل سلوک
شاعرِ شیریں نفس یا شاعرِ سنجیدہ را
بے بدل ہے الغرض جو روپے اس باغ میں
فیلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

۸ یہ قصیدہ ۱۲۸۵ھ میں اُس وقت لکھا گیا تھا جبکہ نواب مرحوم علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کا پیرن ہونا منظور کر چکے تھے اور
بارہ سو پچیس سال کی جاگیرِ ہمیشہ کے لئے مدرسہ کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپیہ نقد بطورِ چندہ کے دے چکے تھے مگر
مصنف اُن کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لئے ناتمام رہا۔ اسکے اہل و اقارب کے کچھ اشعار ضائع بھی ہوئے ہیں ۱۲

مہرِ سرزند و خواہشِ زروِ سیم طبعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور
 ایک بیمار اور سو آزار ایک رنجور اور سونا سوز
 نفسِ امارت اور دیوِ مرید یہ ہے افی تو وہ ہے کلبِ عقور
 مجھے جبرِ کام چاہیے لیجے جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور
 حد و بغض و غیب بت بہتیا بخل و حرص ہو او فسق و فجور
 ایک جو مجھے بن نہیں آتی ہے وہ خدمت کہ چہ ہوں مامور
 دل لگے بندگی میں کیا امکان لبِ تلخِ ذکرِ حق میں کیا مذکور
 مایہ عقل ہے نہ شورِ جنوں دلِ پیاب ہے نہ جانِ صبور
 نہ معاصی میں تلخے بخلت نہ عبادت میں چاشنیِ حسد
 فی اہل ہے مریٰ سلمانی جیسے زندگی کا نام ہو کا فور
 ماں مگر کچھ امید بندھتی ہے تیرے زمرے میں گر ہو محسوس
 جب ترے کارواں میں جا پہنچا پھر رہا بابِ خلدِ کستی دور
 دوریِ آستانِ والا سے ہے بہت تنگ حالیِ مجبور
 اب دعا ہے اسے شفیعِ مہم بسکہ بیتاب ہے دلِ رنجور
 جا لگے تیرے در پہ کستیِ عمر جب کروں بجزِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری

مرتے دم لب پہ ہو تراند کور

وہ شہنشاہ - اُمتی جس کا
 یہاں گنہگار اور وصالِ محفوظ
 وہ خداوند - خدمتی جس کا
 یہاں سبکسار اور وصالِ ناجور
 مر وہ اسے بہت ضعیف کہ بیٹھا
 سعی ہوتی ہے بے کئے مشکور
 لب شیریں کلام سے اُس کے
 دوست بھی شاد غیر بھی مسرور
 اثرِ فیضِ عام سے اُس کے
 لُعبہ آباد و مِسکدہ معہور
 چرخ کو دے اگر وہ حکم سکوں
 ہو غلط نسخہ تنہا و شہور
 صرصرِ قمر گر چلے اُس کی
 بند ہو مسلکِ صبا و دُبور
 جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ
 جلوہ گر ہو اُدھر سے لعلِ طور
 ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن
 موجزن ہو دامن سے چشمہ نور
 بات پوچھو تو سوئے چرخ نگاہ
 سینہ دیکھو تو علم کا گنجور
 ہو سکے اُسکی غویوں کا شمار
 نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
 اے ترا پایہ قسم سے برتر
 اے ترا نامِ عرش پر مِسطور
 میں ترے درپے سن کے آیا ہوں
 نام تیرا شفیح روزِ نشور
 کچھ نہیں زاوِ راہ پاس اپنے
 مگر اُمیدِ غفورِ بَغفور
 طبع غالب ہو اور میں مغلوب
 نفسِ قاہر ہے اور میں مقہور
 بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق
 نشہ کبہ میں ہوں بالکل چور
 چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن
 ہوں بہت اپنے ماتھے سے مجبور

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں اُسے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
 لذتِ مے سے جو نہ ہوا گاہ اُسکو کیا فائدہ خوشہ انگور
 جسکے آنکھیں نہ ہوں کیا جانے روزِ روشن ہے یا شبِ دیچور
 پہلے ہوگی کسی کو تر ہنر اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور
 دروِ دل کا بیاں کروں کس سے بات کھوئی نہیں مجھے منظور
 سخنِ حق کی داد لوں کس سے سُن چکا ہوں فسانہ منصور
 دلِ آباد مفتِ بے ہنراں ہو چکا خانہ تہنہ محمود
 مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا ہو چکی سچی کو ہیکن مشکور
 ہمنے دیکھی تیسرا اہل نظر ہمنے دیکھا مذاقِ اہل شعور
 ہے غرض ان کو صوتِ موزوں نے نالہ دل ہو یا نوائے طیور
 ہو کسی شے سے انکی گرمیِ بزم دستاں ہو وہ یا کہ درسِ نبور
 ہے فقط روشنی سے انکو کام موسمِ ہوا صلِ شمع یا کافور
 ہے یہاں قائلِ انا مردود ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور
 آپ اپنے سخن سے ہوں مخلوط دلِ اصحابِ گو نہ ہو مسرور
 پھاں اگر کام ہے تو شیریں سے قصرِ خسرو کے آور ہیں مزدور
 دلِ اجاب پر نہیں چلتا بخرمیرا کہ رہیو غیر سے دور
 ہوں تماشائے شہرِ نابینا ہے برابر مرا خفا و طور

گم لکنا فیہ من بگی و عویل
و عتاب مَم الزمان طویل
۳۔ قصیدہ نعتیہ

میں بھی ہوں حسن طبع پر غرور مجھے اٹھینکے اُنکے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے داغ مجھے برتر ہے میری طبع غیور
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنوا اہل عصر میں مجھ کو میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دو
چشمہ آب خضر کی مانند چشم اہل جہاں سے ہوں مستور
دل سے داوا اپنی لے چکا ہوں ہست مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثل یوسف دکھائے جو ہر ذات جسکو بچنا ہو غمت یہاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور
ٹپک و قمری کو خصیت پر دیا ۲ بال و پر غمتِ صحوہ و عصفور

8 اس قصیدہ کی تصدیق ۱۲ یا ۱۳ھ کے ہدایات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں ناسور شر کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن فوق۔ آرزو وہ۔ غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں سیتا رام کے بارے میں ایک مشاعرہ قرار پایا مرصع طرح پر تین غزلیں بڑے دعویٰ سے لکھیں جن دوستوں کی جاوید تحسین آفرین سے دماغ میں خلل آگیا اور جن کی دوا کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باجوہ دادر کے مشاعرہ میں نہ گئے۔ یہ وہ اپنے خریدار کے بے وفائی سے شاید اپنی کھسائی پر تھکا ہوا شاعرانہ لوگوں کی بے وفائی سے جکودہ چمچ لیے شعر کا قدر دان سمجھتا ہے۔ اسی نام خیالی کے ہوش میں اس قصیدہ کی غزلیہ تہذیب لکھی گئی تھی مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ جاری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے نئے میاں ٹھہرتے ہیں کیونکہ اُس زمانہ کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ ہر طرح کی نجات اگر کم بختی کی شتمانات کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس طرح شاعری بھی سزا سے مافی باقی ہے لیکن جب تک خضر صحر سے زیادہ بڑھ گیا تو دوشنبہ کی غلطی پر تہذیب ہوا۔ نعت و قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ شاعر پر کیا گیا۔ تاہم فقر کے لیے ایک وجہ دیا ہو جائے ۱۶

ملک دیکر ہوا ہے بے آستیں اک فداطوں نہیں جویوں میں
 ختم تھی اک زباں پشیرنی ڈھونڈھتے کیا ہو سیبِ تماں میں
 لبِ جادو بیاں ہوا خاموش گوشِ گل واسے کیوں گلستاں میں
 گوشِ معنی شنو ہوا بے کار مرغ کیوں لغزِ زن ہو بستاں میں
 وہ گیا جس سے بزمِ روشن تھی شمعِ جلتی ہے کیوں شبستاں میں
 نہ رہا جس سے تھا فروغِ نظر سرمہِ تباہ ہے کیوں صفاماں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت

ابِ حیوان پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون سکھ اپنا بٹھائیگا اب کون
 پہنے جانی ہے اُس سے قدِ سلف اُن پر ایمان لائیگا اب کون
 اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے اُس کو دل سے بھلائیگا اب کون
 تھی کسی کی نہ جس میں گنجِ بیش وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون
 اُس سے ملنے کو بھیاں ہم آئے تھر جا کے دلی سے آئیگا اب کون
 مر گیا دستِ دروانِ خیمِ سخن شعرِ ہموں سنائیگا اب کون
 مر گیا تشنہ مذاقِ کلام ہموں گھر سے بھلائیگا اب کون
 تھا بساطِ سخن میں شاطرِ ایک ہموں چالیں بتائیگا اب کون
 شعر میں ناتمام ہے حالی غزل اُسکی بنائے گا اب کون

نازِشِ حُلق کا محل نہ رہا رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج
 تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
 بارِ اجاب جو اٹھاتا تھا دوشِ اجاب پر سوار ہے آج
 تھی ہر اک بات نیشتر جس کی اُنکی چپے جس گزر گار ہے آج
 دلیں مدت سے تھی غلشِ جبکی وہی برجھی جگر کے پار ہے آج
 دل مضطر کو کون دے تسکین ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
 تیغِ غم نہی نہیں جاتی جان شیریں بھی ناگوار ہے آج
 کس کو لاتے ہیں بہرِ دفنِ کبر ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ نشاد

گس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنجِ دامن نہ رہا خوانِ مضمون کا میزِ نیاں نہ رہا
 ساتھ اُسکے گئی بہارِ سخن اب کچھ اندیشہ خزان نہ رہا
 ہوا ایک ایک کارواں سالار کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
 رونقِ حسنِ تھا بیاں اُس کا گرم بازارِ گلِ خزاں نہ رہا
 عشق کا نام اُس سے روشن تھا قیس و نازک کا نشان نہ رہا
 ہو چکیں حسنِ و عشق کی باتیں گلِ بلبل کا تر جہاں نہ رہا
 اہلِ مہنہ اب کر نیگے کس پر ناز رشکِ شیراز و صفہاں نہ رہا

اسکو اگلوں پہ کیوں دین ترجیح اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و بیم لوگ جو چاہیں انکو ٹھیک رائیں
ہمنے سب کا کلام دیکھا ہے ہے ادب شرط موند نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت

خاک کو آسماں سے کیا نسبت

شرح و جمال کی صورت نظم غنچ و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر تخریت اک طال کی صورت
قال اُس کا وہ آئینہ جسمیں نظر آتی تھی حال کی صورت
اُس کی توجہ سے پڑتی تھی شکل مکان محال کی صورت
اُس کی تاویل سے بدلتی تھی رنگ ہجر اصال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا سخن اُس کا مال کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے انوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے علم فضل کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے غالب بے مثال کی صورت

اب دنیا میں آئیں گے یہ لوگ

کہیں ڈھونڈنے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سو گوار ہے آج اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نبیل ہند مر گیا ہیہات جسکی تھی بات بات میں اک بات
 نکتہ دان نکتہ سنج نکتہ شناس پاک دل پاک ذات پاک صفات
 شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند اور مرجع کرام و ثقات
 لاکھ مضمون اور اسکا ایک ٹھٹھول سو تکلف اور اسکی سیدی بات
 دل میں چھپتا تھا وہ اگر بٹھل دن کو کہتا دن اور رات کو رات
 ہو گیا نقش دل پہ جو لکھتا قلم اسکا تھا اور اس کی دوات
 تھیں تو دلی میں اسکی باتیں تھیں بے چلیں اب طن کو کیا سوغات
 اسکے مرنے سے مر گئی دلی خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
 یہاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم یہاں اگر ذات تھی تو اسکی ذات
 ایک روشن دماغ تھا نہ ریا

شہر میں اک چرخ تھا نہ ریا

دل کو باتیں جب اسکی یاد آئیں کس کی باتوں سے دلکو ہلالتیں
 کس کو جا کر سنائیں شعور غزل کس سے داد سخن ہوئی باتیں
 مرثیہ اس کا لکھتے ہیں اجاب کس سے اصلاح لیں کنہ ضرورتیں
 پست مضمون ہی نوچہ استاد کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
 لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہل مرتیت جازہ بھید آئیں
 لائیں گے پھر کہاں سے غالب کے سوئے مدفن ابھی نہ لیجا تیں

لفظِ مہل ہے نطقِ اسرالی - حرفِ ہل چو عقلِ یونانی
 ایک دھوکا ہے سخنِ داؤدی - اک تماشا ہے سخنِ کنہانی
 نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک - چشمہ خضہ کا ہو گر پانی
 لوں نہ اک مُشت خاک کے بدلے - گرے خاتمِ سلیمانی
 بحرِ ہستی بجز سراب نہیں

چشمہ زندگی میں آب نہیں۔

جس سے دنیا نے آشنائی کی - اُس سے آخر کو کج ادائی کی
 تجھ پہ بھولے کوئی عبتِ اے عمر - تو نے کی جس سے بیوفائی کی
 ہے زمانہ وفا سے بیگانہ - ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
 یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی - صلح میں چاشنی لڑائی کی
 ہے یہاں حظِ وصل سے محروم - جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
 ہے یہاں غلطِ وضع سے یابوس - جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
 خندہ گل سے بے بقا تر ہے - شان ہو جس میں دلربائی کی
 جنس کا سد سے ناروا تر ہے - خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
 بات بگڑی رہی سہی افسوس - آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و مخرطابِ مژو

اسد اللہ خان غالبؔ

ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا
 کرم کا دیکھئے دامن کہاں تلک ہو فراخ
 زمیں پہ ٹھہرا ہے ماوے شاہ عرش نشیں
 اسی سے ہوتا ہے ظاہر عیار استعدا
 اگر نصیب ہو شرب میں جا کے شربت مرگ
 اگر قبیح میں گز بھرز میں بیترتے
 سمایا اُس کا جو نقش قدم تصور میں
 حریفِ نعتِ ہیمبر نہیں سخنِ حالی
 نبی کا نام ہو ورو زباں رہے جب تک
 کیا تھا عزمِ اولو الحسنِ زم نے کہاں کے لئے
 ہو میرزا بن خدا جب کہ سپہاں کے لئے
 رہی نہ اب کوئی فوقیت آسمان کے لئے
 محاکہ ہو حُبِ نبی دل کے تمناں کے لئے
 پیوں نہ آبِ بقاعِ سمر جاوداں کے لئے
 کروں نہ طولِ ازلِ روضہ جنان کے لئے
 پیچوم شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لئے
 کہاں سے لائے اعجاز اس بیاں کے لئے
 سخن زباں کے لئے اور زباں ماں کے لئے

۲ ترکیب بند مرتبہ ۸۵۰ ہجری

مرتبہ جناب مرزا اسد خاں مرحوم ملوئی تخلص غالب

کیا کہوں حال درو پستانی
 عیش و نیا سے ہو گیا دل سرو
 دیکھ کر رنگِ عالم فانی
 تجھ نہیں جبرِ ظلم خوابِ خیال
 وقت کو تاہ وقت طولانی
 گوشہ فتنہ و بزمِ سلطانی
 ہے سراسر فریبِ ہم و گماں
 تلخ غنغور و تختِ خاقانی
 بے حقیقت ہو شکلِ موجِ سرب
 جامِ حبشہ و راحِ تحسانی

سپہ گرم طواف اُس کی بارگاہ کے گرد
 وہ لختہ لختہ تفقہ وہ و مبدم الطاف
 وہ گو نہ گو نہ مدار وہ بات بات میں ہر
 کہ فتنہ مقابل میں ہل نخوت کے
 کہیں ہلاک میں تاخیر قوم سرکش کے
 صفاے قلب حووان کی نہ خواہ کے تھا
 کہیں مسترد تہ بحیث نبی اور رسول
 مدنیہ مرجع و ماوے اہل مکہ ہوا
 اسی شرف کے طلبگار تھے کلیم مہج
 بس اب نہ غول کا کھڑکانہ راہزن کا خطر
 شفیع خلق سراسر خدا کی رحمت ہو
 شفاعت نبوی ہے وہ برقی عصیاں سوز
 خدا کی ذات کریم اور نبی کا خلق عظیم
 اُسی کا دیں ہے کہ ہے گلشن ہمیشہ بہا
 عبور نچے عصیاں سے کسطح ہو اگر
 مریض حرص و ہوا پائے کب شفا۔ جب تک
 نہ حرف و صوت میں سوت نہ کام و بس سکت

زمین سر بسجود اُس کے آستان کے لیے
 رضاے خاطر یا ران جانفشاں کے لیے
 کشائش گروہ کین دشمنان کے لیے
 گرا نکسار مدارات میسماں کے لیے
 کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیے
 دعاے خیر بداندیش و بدگماں کے لیے
 کہیں وہ خاتمہ الباب دستاں کے لیے
 مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہو مکاں کے لیے
 نوید۔ اُستِ یغیبِ رماں کے لیے
 ہوا وہ قافلہ سالار کاررواں کے لیے
 بشارت اُمتِ عاصی و ناتواں کے لیے
 کہ حکم خس ہے جہاں کفر و وہاں کے لیے
 گنہ کریں تو کریں خستہ انس و جاں کے لیے
 و گرنہ ہر گل و گلزار ہے حسناں کے لیے
 وہ ناخدا انہو اس جسیر بیکراں کے لیے
 وہ چارہ گر نہواں در درجائے تہاں کے لیے
 حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے

قصیدہ کرب و حسرت میں مختلف مضامین پر

اوقاتِ تحریر

قصیدہ نعتیہ

بنے ہیں جنتِ سلطانِ دو جہاں کے لیے
سخنِ زباں کے لیے اور زباں ماں کے لیے
وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم ہیں
عداوت اُس کی عذابِ لیم جاں کے لیے
وہ شاہ جس کا مُحب امن و عافیت میں مدام
محبت اُس کی صہارِ حصینِ اہاں کے لیے
وہ چاند جس سے ہوتی طلعتِ جہاں معدوم
ربانہ تفرقہ روز و شب زماں کے لیے
وہ پھول جس سے ہوتی سحرِ باغبانِ مشکور
رہی نہ آمد و رفتِ چمنِ نزاں کے لیے
ہلالِ مکہ کا۔ ماہِ دو ہفتہ شرب کا
فروغِ قوم کے۔ اور شمعِ دو دماں کے لیے
اگر اُس کا موروثِ آنِ محبِ جبریلؑ
در اُس کا کعبہ مقصود اُن جاں کے لیے

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گزرے اک خستہ جگر کی رات کیونکر گزرے
گذری نہوجن بغیر بچاں ایک گھڑی یہ چارپہر کی رات کیونکر گزرے

یاد اُس کی یہاں ورودام اپنا ہے خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ پہچنے کہ ہے نام اُس کا کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرات تھے شاہ
میں اور اطاعتِ نیرید گمراہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ

حرکت کرتا تھا اے دل شیر ذی جاہ سے مل گم نہ ہو میرے حق آگاہ سے مل
سرگشتگی کوئے ضلالت کب تک اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

گر کفر میں قرع و نعل کا ثانی نکلا اک شام میں بیبِ اد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھا بھر غفلت کی نیرید وصالِ میل سے بھی زیادہ پانی نکلا

تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

و عظموں کی سخت کلامی

اک گہرے پوچھے جو اصول سلام و عظمنے دشتی سے کیا اس کلام

بولاکہ حضور مقتدا ہوں جگے ایسی ملت اور ایسے نہایت کے سلام

نواب و قارا الامر اقبال لدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اسکی چھوڑ دی سہری اقبال پہ جس نے فتیابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی اُنے ہے جنہی رگوں میں رخ آصف چاہی

رباعیات قدیم

ہو عیب کی غویا کہ ہنر کی عادت مشکل سے بدلتی ہو بشر کی عادت
چھٹے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

مرنے پہ مرے وہ روز و شب و نیگے جب یاد کر نیگے مجھے تب رو نیگے
الفت پہ وفا پہ جاں نشاری پہ مری اس کے نہیں وئے تھو تو اب رو نیگے

8 رباعی نمبر ۱۳۳۱ چری میں جبکہ راقم حیدر آباد میں مقیم تھا اور نواب قارا ملک بہادر پوری سے بولوس بانسک جیت کر رہے تھے۔ کبھی شی گرا کی سخت
میں بھی نہیں گئی۔ خون آصف چاہی کے لفظ میں اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ حضور سے قربت فرماتے رہے۔ یہاں اقبال کے میں سے خطاب کی طرف اشارہ ہے۔

احسان بے منت

احساں کے ہو کر صلہ کی خواہش تکو تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احسان کر دو
کرتے ہو گرا احسان تو کر دو اسے ظلم اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو
قانون بد خصلاتی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً یکساں حاشا کہ ہوانہ نظم عالم کا مدار
جو نیک ہیں انکو نہیں حاجت انہی اور بد نہیں بنتے نیک اپنے زہنا
مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہل شر سے اڑنا نہ کہیں بھڑکے گی بدعت سے اور آتش کہیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہل خلاف جز ترک خلاف کوئی تدبیر نہیں
ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں اکل وقت سے اپنے نہیں ملتی تو اہل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اٹھا کر حضور ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اکل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے بس مجھ کو ہی معلوم ہو جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

اٹیں پیری میں شیخ ابھرتے نہیں پو دل نیتے میں پر جی سے گدے نہیں پو

ردِ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے۔ نہ صفا زیبا نہیں سائل پھر مگر قمر و عتاب

بدتر ہے ہزار بارے دُش ہمت سائل کے سوال سے ترس تلخ جواب

کھانا بغیر بھوک کے فراہم دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں جو دیکھے چککے دل سے بھائی ہیں

پر بے لذت تھے وہ کھانے اور بھوک جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال

سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی اندیشہ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوٹا بُرا سننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مہ و ثنا کی پروا جو کر کے بھلا۔ خلق سے سنتے ہیں بُرا

ان گالیوں کا ہے جنکو خچر کا حالی آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکرتیہ مہج کلامِ راقم

جو خوش خشم بادہ جامِ خالی میں ہوا پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا

تسلیم نے دی کچھ اس طرح داؤ سخن مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

مولوی سلیم الدین مرحوم نارتولی مقیم جے پور تخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستائش میں اس وقت بھیجے تھے۔ جب کہ مدت سے فکرِ شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُن قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی ۱۲

کی طاغوتِ نفس میں بہت عمر بسر انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اٹھا چکے اب حالی مجلس کرو برخواست۔ ہو اوقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ماتھ دل سے صوٹا زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا

جسطرح کہ سونے کی کوئی ہو محک ہی جو ہر انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابلِ عقوبت ہے

غصہ پر کسی کے غصہ آتا ہے ہیں جب تک کہ ہے وہ عقل و دانش کے قریں

اپنے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر پھر کس سے ہوں آزرہ کہ تو تو ہی نہیں

سُفہا کی مح و دم

گرتے ہیں سفید اگر مذمت تیری کر شک کہ ثابت ہوتی ہمت تیری

پر دم کر ہیں وہ گر (نصیبِ اعدا) رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لا علاج ہے

اب نصف کے پنجے بکھلنا معلوم پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم

کھوتی ہے وہ چیز جکا پانا ہے محال آتا ہے وہ وقت جکا ٹھنا معلوم

اسراف

سُرف نہ بن اپنے حق میں کانٹے بوئیں نعمت نہ خدا کی رایگاں یوں کھوئیں

گر بخل پر لوگ اُن کے ہنسیں بہتر ہے اس سے کہ فضول یوں پر اُن کی روئیں

ہو سکے رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ پر اُسکو کسی نے یہاں تپایا ہی نہیں
وینداروں کی بُرائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ ہلِ اسلام اسلامِ طعنہ زن میں اقوامِ تمام
بہرِ ہمسری سے بگڑے اپنی بیمار اوفت میں ہو گیا سجا بدنام

فکرِ عقبی

منزل ہے بعید۔ باندھ لوزاؤ سفر موج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبہ
گاہک چوکس ہے۔ یچلو مال کھرا ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن را سگزر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں ممکن ہے۔ بدی کا نہ رہے اُس میں نشان
ممکن تو ہے سب کچھ۔ حقیقت یہ ہے انساں ہے ابتک ہی قرنِ اشیطان

سلاطین کا عشق

ہر چند بُرا ہے عشق کا سب کے مال پر حق میں ہے شاہوں سے خصو بَدِ مال
سُلطان ہو اگر سُلالِ آہی تو عشق ہنُزلِ آہی کے لیے وقتِ زوال

وقت کی مساعِدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چاؤ پر تجھے بگڑنے کا نہیں ہے یارِا
ہو جائے گرا ایک تو ہمارا ساتھی پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا
بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

مانے نہ کبھی کہ نہ ہے ہر جز کے بعد دریا کا ہمارے جوا تر نادیکھے

✓ اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہو شرط ابتدا انسان سے پھر چاہیے مانگنی مدد یزدان سے

جب تک کہ نہ کام ہو ت بازو سے لیا پائی نہ نجات نوح نے طوفان سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہی جان کے ساتھ کام انسان کیئے بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیئے

جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح مردوں کی طرح جیئے تو کیا خاک جیئے

جھوٹی نمائش

میں جھوٹ کسے سچ میں سب ہونے والے بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے

گھڑیاں رتہی ہیں جھکی جیبوں میں مدام اکثر نہیں دہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہونفات میں جھکی ہزار بدظن نہو عیب اُس میں اگر ہوں دوچار

طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

سکوت درویش جاہل

مصرف جویوں و ظیفہ خوانی میں آپ خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ

بولیں کچھ مونہ سے یا نہ بولیں حضرت معلوم ہے ہما کو جتنے پانی میں ہیں آپ

ارشاد ہوا بسندہ ہمارا وہ ہے جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی ہے

قتلہ کو جہاں تلک ہو دیجے تسکین زہر اگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمت

تیمور نے اک مورچہ زیر دیوا دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لیس کر سوبا
آخر سرِ رام لیکے پہنچا تو کہا ”مسئل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوا“

کم ہمتی

جبریتِ وقتِ مدیت کی بحث و کرا دیکھا تو نہ تھا کچھ اسکا مذہب پہ مدأ
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پیشانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا شر ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے نداشتوں کی جاناہنے دوزخ بھی ہے اک نامِ پیشانی کا
تأسفِ بروفات نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم نے تخلصِ بلوی
قری ہے نہ طاؤس نہ کبابِ طنا آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پروا
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار سوا کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

ایضاً

دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری قوموں کو ذلیل - خاندانوں کو تباہ
سببِ نوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم سمجھو کہ وہاں ہے کوئی ہرکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت یا ہے کوئی مولوی درِ عظیم
دین و دنیا کا رشتہ

دنیا کو دیئے دین نے آسرا و حکم دنیا نے کمر دین کی تھامی جدم
گردین کی مومن بہت ہو دنیا دنیا کے بھی حسان نہیں دین پہ کم
آزادگانِ استباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب گناہ کافر کہا و غلطی نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادتِ جنت لائبہ خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

بے پروائی و بے غیرتی
اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدد اُس قوم کا چیتنا ہے حالی دشوا
عزت کی نہیں ہے جسکو ہرگز پروا ذات سے نہیں ہے جسکو ہرگز کچھ مآ
عفو باوجودِ قدرتِ تمام

موسمی نے یہ کی عرض کرے ابا خدا مقبول تر اکون ہے بندوں میں سوا

۸۱ یہی کفر و ضلالت ہے جس پر ساری کلامِ خدا کے سوا اور کسی کو نہیں جو بکتا - مثلاً شیخ کو بکتا کہ بعضوں نے کہ ہے اور بعضوں نے زندیق
ایسے بات کو نہ فی الواقع صداقت تھے یا نہ توفیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا نہیں جس شخص میں کوئی میرا اندہ فی برائی نہ عیب موج و دشوا کسی بخیر
یا فضلیل کرتی رہی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مٹی کو شہادت نہ ملے اور نہ اپنے دعوے پہ خدا کو گواہ قرار دے ۱۲

توقع بجا

میں باریق پر مصیبت میں نہیں ساتھی میں غیر۔ ایک ذلت میں نہیں
 اُس بات کی انساں سے توقع عجیبست جو نفع بشر کی خود چلت میں نہیں
 عقل در دوستی متضاد ہیں

ہو عقل میں جست در کئی اور بیشی اتنی ہی مختاریت ہی بچاں اور خوشی
 وہ دوست نہیں جسے کیاں کراں ضدین ہیں دوستی و دور اندیشی
 عیش و عشرت

عشرت کا شرم تلخ سا ہوتا ہے ہر وقت پر پیغام بگاہا ہوتا ہے
 جس قوم کو عیش و دست پاتا ہوں کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے
 ایضاً

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا سلطان کو گداغنی کو محتاج کیا
 ویراں کیا تو نے سینوا اور بابل بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا
 غیبت

رونق ہر اک بزم کی اب غیبت میں بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
 اوروں کی بُرائی ہی ہے فخر و ماں خوبی کوئی باقی نہیں جس بُہت میں
 عشق

اے عشق کیا تو نے مگر انوں کو تباہ پیروں کو خسوف اور جوانوں کو تباہ

ہیں بے ہندوں میں قابلیت کے نشان پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انسان
حاری ہیں لباسِ تربیت سے دور ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہاں غائب ہوا تو جہان سے وصال کیا زوال
اپنہ ہوئے غیب کے خزانے مفتوح جن قوموں نے ٹھیکر یا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنج شادی تو ہے سرشتِ نعا و آیا دی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سایہ میں تر دنیا کا وسیلہ دین کا مادی تو ہے

ایضاً

ہو تجھے نہال جیسی مغرب کی زیر مشرق کو وہ فیض تجھے اے علم نہیں
شاید اے علم اونٹنِ شب کی طرح رہتی ہیں شاعریں تری محدود ہیں

۵ خاندانی عزت

بیٹا نکلتے جب تلک ذات سے عزت نہیں اُس کو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے کھات کا نسب بھی عالی پر اُس کو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا۔ مجھے یہ عزت ہو جہاں فرمایا ہنرنے۔ میں ہوں عزت کا نشان
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیان میں بھیہ ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

چرب کرو آغا کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمر جاودالی سمجھو
آشمار زوال

ابا کو زمین و ملک پر المینان اولاد کو سنتی پناہ کا گمان
بچے آوارہ اور بے کار جو ان ہیں ایسے گھرانے کوئی دیکھے نہ مان
شان ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چپٹیل میدان برسات میں سبزہ کا نہ تھا چپہ نشان
یاد آتی ہم سبق م کے ادبار کی شان
نفاق کی علامت

ہر نیم میں آنسریں کے لایق ہونا شیریں سخن سے شہر فایق ہونا
آساں نہیں مقبول خلاق ہونا
مکمل نہیں جب تک کہ نہ ولی نفاق
مسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہ دشمن اخواں پکا ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے سنتے ہیں کسی کو جب مسلمان پکا
نکرو یا

حالی رو رہت جو کہ چلتے ہیں سدا خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے وجہ ہر حذر بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوه نما
جو ہر قابلیت

مُسْرِف کو کیونکر فرغت حاصل ہو سکتی ہے؟

اگر شمعِ مسْرِف نے یہ عابد سے کہا کر سیرے لیے حق سے فرغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سو بے چرخ محتاج کر اسکو جلد اسے بار خدا

کام کی جلدی

یہاں رہنے کی مہلت کوئی کہا پتا ہو آتا ہے اگر آج۔ تو گل جاتا ہے
جو کرنے میں کام آنکو جلدی بھگتاؤ طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہو نفس میں انساں کے جیل یہ مرض ہر سچی پہ ہوتا ہے طلبِ کارِ عوض
جو خاص خدا کے لیے تھے کام کیے دیکھا تو نہاں انہیں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ وزگار

بے بس کے ہزاروں گھراؤں جاتے ہیں گر گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو گل کی باری بن بن کے یونہیں کھیل بچڑ جاتے ہیں

تقاضا سے سن

حالی کو جو گلِ فسدہ خاطر پایا پوچھا باعثِ توبہ بنکے یہ سہ پایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی اُمید وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگی کا بھروسہ نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا

دنیا سے دنی کو نقشِ خالی سمجھو رو دادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو

عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو گھٹنے سے کہیں اُنکے نہ بڑھ جائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ زباناں سے کہتے ہیں ہم ہوتے نہیں ساتھ جمع۔ دُم آؤرت دم
بڑھتا گیا جعفر کہ حسن گفتار بس اُتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرط قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں پرت در کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ اسکاں ہو مگر عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں
طالب کو سوچ سمجھ کر پیر بنانا چاہیے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہل عرفان یقین پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہو احتیاج چار آنکھوں کی اور ایک کی بھی سیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جل میں سب عالم و جاہل ہمسر آتا نہیں فرق اسکے سوا انہیں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا جاہل کو نہیں جل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو گل انجام ترقی بشہ یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

امتحان کا وقت

زادہ کہتا تھا جان ہے دیں پرتسرباں پرایا جب امتحان کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کیسے اب کیا ہے صلاح فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے۔ پتہ اتنی ہر خبر اک مشغلہ دھچپ ہی بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھیرا تو بدے فرزند ایک آدھ ادا لگی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں ہوں اُس میں اگر گلے ٹرے دلچسپند

دوستوں سے بے جالوق

تازیت وہ محو نقشیں مہموم ہے جو طالب دوستانِ محصوم ہے
صحاب سے بات بات پر جو بگڑے صحبت کی وہ برکتوں سے محروم ہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں گردن پہ نہ لوعقل خندا و دکاخوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اہم کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک آؤ جنوں

غروبِ عیبوں سے بڑھتے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور پر عیب سے بچتے تا بمقدور ضرور

بٹھائے عرب کو محترم تو نے کیا اور اُٹیوں کو خیر اُرم تو نے کیا
اسلام نے ایک کرو پاروم تیار پچھڑے ہوئے گلہ کو ہم تو نے کیا

ایضاً

بٹھا کو ہوا تیری ولادت سے شرف شیرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو خسر نہیں کچھ تجھ پر آبا کو بھی ہے تیری اُبت سے شرف

صلح کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بنیں کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے ہم نغم دنیا وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترک شرعاً شقانہ

بلبل کی چمن میں سفر بانی چھوٹی بزم شر میں شعر خوانی چھوٹی
جب سے دل زندہ تو نے ہکو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوٹی

پیران زندہ دل

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل اُن کے ہیں ظرافت انکے جو کرتے ہیں طیر ہنس بول کے پیری کو جانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس میں ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی غداک بدی ہو گرنہ خواجوں نیکی سے بدی نہیں کچھ دور بہت

توحید

جب مایوسی لوں پہ چھا جاتی ہے دشمن سے بھی نام تیرا چھپاتی ہے
مکن ہو کہ کچھ میں بھول جائیں طغالیٰ لیکن مٹھیں دکھ میں ہی آداتی ہے

ایضاً

مٹی سے ہول سے آتش و آب سے یحساں کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ انداز عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک لغینہ غیب میں اُسی طرح نہاں

ایضاً

ہستی سے ہی تیری رنگ بوسے کیلئے طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے کیلئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور سب اپنے کیلئے ہیں اور تو سب کے کیلئے

ایضاً

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیادہ دنیا میں نہیں ہے ایک ل جو کہ ہو شاد
پر جو کہ ہیں تجھ سے لڑ لگائے بیٹھے رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

نعت

زُناد کو تو نے مجھ تجھ کیا عشاق کو مست لذت دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی حاجی کوئی توحید کو تو نے اس کے توحید کیا

ایضاً

رباعیات

توجہ

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہو کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پُغاس نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہرے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ایضاً

طوفان میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ واوی میں ہو ٹکراتا
اسباب کا آس رہے جب اٹھ جاتا
وہاں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے طہو
منکر بھی پکار اٹھتے ہیں تجھ کو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوچھی کوئی را
خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

جان تھی اک بالِ فرقت میں شوق کو جاں گزاکیا تو نے
 تھی محبت میں ننگِ منتِ غیر جذبِ دل کو رساکیا تو نے
 راہِ زاہد کو جب کہیں نہ ملی ^{قطع} درِ محبانہ واکیا تو نے
 قطع ہونے ہی جب لگا پیوند غیر کو آشنا کیا تو نے
 تھی جہاں کارواں کو دینی راہ عشق کو مہنسا کیا تو نے
 ناؤ بھر کر جہاں ڈبوئی تھی عقل کو ناخدا کیا تو نے
 بڑھ گئی جب پند کو مہرِ سپر اسکو اُس سے جدا کیا تو نے
 جب ہوا ملکِ مال رہزنِ ہوش بادِ مشہ کو گدا کیا تو نے
 جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد درد کو بے دوا کیا تو نے
 جب دیا راہِ رو کو ذوقِ طلب سچی کو نارسا کیا تو نے
 پردہ چشم تھے حجابِ بہت حُسن کو خود نما کیا تو نے
 عشق کو تابِ انتظار نہ تھی غرہ اک دل میں کیا تو نے
 حرم آباد اور دیرِ خراب جو کیا سب بچا کیا تو نے
 سختِ خسروہ طبع تھی اجباب ہم کو جا دو نوا کیا تو نے
 پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب تون پوچھے کہ کیا کیا تو نے
 حالی اٹھا ہلا کے محفل کو احسا اپنا کہا کیا تو نے

ابتدا سے وفا ہے سردینا میری دیکھی نہ انتہا تو نے
 دل سے قاصد بنا کے وعدہ وصل اور کھویا رہا سہا تو نے
 ایک عالم کو خوش کیا اسے رشک ہلو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج

حالی اپنا کہا سنا تو نے

کر کے بیمار دی دوا تو نے جان سے پہلے دل لیا تو نے
 سہر و شنب نہ گھبرا اب بیا چشمہ بقا تو نے
 شیخ جب دل ہی دیر میں لگا اکے مسجد سے کیا لیا تو نے
 دور ہوا ہے دل مال اندیش کھو دیا عسمر کا مزا تو نے
 ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ کیا کیا چشم آشنا تو نے
 دل و دیں کھو کے آئے تھو سوکھا یہاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے اُمیدِ خلد پر حالی

کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

دل کو در و آشنا کیا تو نے در و دل کو دوا کیا تو نے
 طبعِ انساں کو دی شربتِ فا خاک کو کیسا کیا تو نے
 وصلِ جاناں محال ٹھہرایا قتلِ عاشق روا کیا تو نے
 تھما نہ جگر غمِ بیاغاشقی میں غم کو رحمتِ فرا کیا تو نے

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں صلح میں چھیڑ ہو لڑائی کی /
 ملتے غیسروں سے ہو ملو لیکن ہمسے باتیں کرو صفائی کی
 دل رہا پائے بند الفتِ دم تھی عجب آرزو رہائی کی
 دل بھی پہلو میں ہو تو بھیاں کس رکھئے اُمید دل رہائی کی
 شہر و دریا سے باغ و صحرا بو نہیں آتی آشنائی کی
 نہ ملا کوئی غارتِ ایماں رہ گئی شرم پارسائی کی
 بختِ ہمدانِ ستانی شیدا تو نے آہ کو نارسائی کی
 صحبتِ گاہ گاہی رشتگی تو نے بھی ہمسے بیوفائی کی
 موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے ساعتِ آپہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوسِ حالی

انتہا ہے یہ بے حیائی کی

کر دیا خوگر جفا تو نے خوب ڈالی تھی ہتد اتو نے
 دو پہنچی تھی اپنی آزادی پر حنہ اجانے کیا کیا تو نے
 کیوں نہ آئیں گے بھان لے ہم بس سنائیں نے اور کہا تو نے
 گوشِ لب ساتھ لائے تھے ہم آج نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے
 صبر کا ہے بہت بُرا انجام ہلکو سبھا ہے دل میں کیا تو نے

8 شیدا سے مراد عشقِ محمد کرم اللہ وجہہ صاحبِ دلیوی ہیں کہ جن میں کسی نہ کسی کی فکرِ شکر کرتے تھے اور شیدا انکھس کرتے تھے ۱۲
 ۱۲ رشتگی آنریل نواب ایچ بی بی خاں ہمدان دریں چاہیچہ آباد کا تخلص ہے ۱۲

نہیں آتی کہیں بھیاں بوسے سب
 مگر جو گھر ہے وہ بیتِ انحران ہے
 یہاں بیگانگی ہے ہفت درعام
 کہ لبیلِ ناشناستے چمن ہے
 نہ کچھ مجنوں کو ہے پردے لیلی
 نہ کچھ شیریں کو دردِ کویہکن ہے
 مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور
 تصور میں مرے اک انجمن ہے
 مری خلوت میں ہے ہنگامہِ نیم
 خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
 بتاؤں تمکو ہوں کس باغ کا پھول
 جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
 بتاؤں تمکو ہوں کس صحر کی بو
 جہاں غربت و وطن پر خندہ ملن ہے
 عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
 مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے
 نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام
 یہی گر جذبہِ مہرِ وطن ہے
 گریں نظروں سے سب باتیں پرانی
 مگر لغت کہ اک رسم کُن ہے
 بھلا حالی اور لغت سے ہو خالی
 یہب تم صابوں کا حُرِ ظن ہے

کیا ہے اُسے کہتے ہیں سخن ترک

مگر ہوا بھی اس میں سخن ہے

دھوم تھی اپنی پارسی کی
 کی بھی اور کس سے آشنائی کی
 کیوں بڑھاتے ہو خستہ لاط بہت
 ہموطقت نہیں بدائی گی
 منہ کہانتک چھپاؤ گے ہم سے
 تمکو عادت ہے خود نمائی کی

اور کون سی بات کہی گئی تھی جبکہ نزل سابق لکھی گئی تھی آخر کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے ۱۲

بہت خطا اٹھاتا ہے دل تجھے ملکر قلعہ دیکھئے کیا ہوا چاہتا ہے
 غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدام سودہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
 بہت چین سے دن گزرتے ہیں حالی
 کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

جس کو غصے میں لگاؤٹ کی ادا یاد رہے آج دل لے گا اگر کل نہ لیا۔ یاد رہے
 شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اُس شوخ ہم یہ سبق وہ ہے کہ بچو لے سے سوا یاد رہے
 ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر نہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
 یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجے اس بے لانی کا ہے انجام پڑا۔ یاد رہے
 شیخ بھیاں شرم نہ شوق بھلا دیتا ہے تو بے انکی ہے جنہیں اپنی خطا یاد رہے
 وادیِ عشق میں موٹی کو ہو گرخصیت دید با تھ کٹواتیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے
 خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا بھول جائینگے رو آب بقا یاد رہے
 دل بڑی طرح لگا عشقِ تباں میں اشیخ دیں پڑا پائیں اگر اب کبے خدا یاد رہے
 چارہ گرا کار باندا زہ تدبیر نہیں کیجیو بہت اگر وقت دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ

حضرت اس لطف کا پائینگے مزا۔ یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے آخر کو ہم حوالہ تقدیر کر چکے
 افولِ شب وصال کے مہاں گز نہیں لے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

غیر ممکن ہے نہ تو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اُسکو لکھا چاہیے
ہے دل افکاروں کی دلہا اسی ضرور
گر نہیں اُلفتِ مہارا چاہیے
ہے کچھ اک باقی غلشِ اُمید کی
یہ بھی سٹ جائے تو پھر کیا چاہیے
دوستوں کی بھی نہ پورا ہے
بے نیازی اُسکی دیکھا چاہیے
بھاگتے ہیں آپ کے انداز و نماز
کیجئے اغماضِ حبسنا چاہیے
شیخ! ہے ان کی نگہ جادو بھری
صحبتِ رندان سے بچنا چاہیے

لگ گئی چُپِ حالی رنجور کو

حالِ اُس کا کس سے پوچھا چاہیے

جنوں کا رُخ نہ رہا ہوا چاہتا ہے
قدمِ دشتِ پیما ہوا چاہتا ہے
دہمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشکِ اشکِ دیا ہوا چاہتا ہے
خط آنے لگے شکوہ آئینِ اُمکے
ملاپ اُن سے گویا ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جن دل سے ہمو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے
ابھی لینے پائے نہیں دمِ جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے
مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہر خست
کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے
فردوں تر ہے کچھ ان نونِ دوقِ حسیلا
درِ رحمتِ اربابِ دوا ہوا چاہتا ہے
قلقِ گریہی ہے تو رازِ نہانی
کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے
وفا شرطِ اُلفت ہو لیکن کہا نیک
دل اپنا بھی تجھ سے ہوا چاہتا ہے

دریا کو اپنی منوج کی طغیانوں سے کام
کشتی کی پار ہو یا دریاں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ سرد و پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں ہے

حق و سنا کے جو ہم جانے لگے
آپ کچھ کہہ کے سُکرنے لگے
تھا یہاں دل میں طعن و صلِ عدو
عذر اُن کی زباں پہ آنے لگے
ہم کو جیسا پڑے کافرت میں
وہ اگر بہت آزمانے لگے
دُور ہے میری زباں نہ کُھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی
غیر الفت بہت جانے لگے
تہ کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا
ہم اگر در و دل سنانے لگے
سخت شکل ہے شیوہ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
جی میں ہے لوں ضاعِ پیرِ مغال
قافلے چہرہ کو جانے لگے
سیرِ باطن کو فاش کر یارب
اہل ظاہر بہت ستانے لگے
وقتِ خست تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب جانے لگے

حشر تک یہاں لٹکیا چاہیے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے
ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار
اُس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے

بانگِ گلگشت ہے بیمِ خزاں موت کرتی ہے نگہبانی مری
 قدرِ نعمت ہو بوقتِ انتظار حشر پڑھ ساری ہو ممانی مری

خندہ زن ہے اُس مسلمانِ یہ کفر

جیسی ہے حالی مسلمانِ مری

پروے بہت سے صول میں بھی دریاں ہے شکوے وہ سب نالیکے اور مہرباں رہے
 کیا کیا ہیں دل میں دیکھتے ارماں بھرے ہو ہم سب زبان نہیں جو کوئی یہ سناں ہے
 حراماں میں ناگھ سے نہ دیا رشتہ امید اب تک تو ہم جاں میں بہت شاداں ہے
 پوچھی گئی نہ بات کہیں پاس وضع کی اتنے ہی ہم سب کئے تھے گراں ہے
 دیرِ حرم کو تیرے فسانوں سے بھڑکا اپنے رقیب آپ رہے ہم جاں رہے
 دارا و جم کو تیرے گداؤں پر شک ہے نریخ مستلح عشق۔ الٹی گراں ہے

حالی سے دل کے ہو گئے تم ہنرِ دل بہت

اگلے سے دلوئے ہاب اُنہیں کہاں ہے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گناں رہے بات اُس کی کاٹتے رہے اور ہنرِ پاں رہے
 یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم مجھ نالہ جبریں کا رواں رہے
 یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ عظم یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مُغلاں رہے
 وصلِ مدام سے بھی ہماری ٹہنی نہ پیاس ڈوبے ہم آبِ خضر میں ادنیجاں رہے
 اکل کی خبر غلط ہو تو چھوٹے کار و سیاہ تم مدعی کے گھر گئے اور یہ سماں رہے

تو بجزرت کی یونہی اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دینگے ذرا دم بھرتو وقف کیجئے

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا ہم خنداں
جان کو بننے لگالی ہے یہ علت کیسی
جسکی قسمت میں ہو کلفت اُنھیں حسرت کیسی
وہ تو آفت تھی ہمارے لیے۔ لغت کیسی
قید ہستی میں مری جان فراغت کیسی
جسکو کچھ کام نہیں بچاں۔ اُنھیں فرصت کیسی
وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی
ہم کہیں کس سے کہ دیش ہے حالت کیسی
ہے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی
وحی بھی کام نہیں کرتی۔ نصیحت کیسی
جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اسے دنیا
جانتا ہے وہی۔ دل پر ہے گذرتی جسکے
ہنے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک
جبکہ رہتا نہیں تا بو میں دل اپنے ناصح

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی خجنام

یار کی میں بھی کہوں ہے یہ غنایت کیسی

سچی سے بہتر تر آسانی مری
کفر سے بدتر مسلمان مری
تھانہ محتاج سبب عفو کسیرم
کچھ نہ کام آئی پریشانی مری
خدا میں بھی گر ہی یاد اسکی زلف
کم نہ ہو شاید پریشانی مری
ہے لباسِ جہنم تک مجھ پر گراں
دور جا پہنچی ہے عریانی مری

عقل پھیلی پر سنٹی حرص آزار انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے
چیونٹوں میں اتحاد اور لکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجہ میں جوت لے شمع ہے کس قی عالم سو کی
جان و دل سے تجھ پر واندہ جویوں زبان ہے
دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ

جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

تیم میں وہ سوز نہ تیم میں ہے وہ ایمان باقی
رہ گیا کیا ہے اب اے گہر و سلیماں باقی
بزم دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اسوقت
میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہمان باقی
حق ادا اک نگہ لطف کا ہوگا کیونکر
دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی
ظاہر اور دہی الفت کا نہیں چارہ پذیر
ور نہ چھوڑ انہیں ہنسنے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ ضیق

ابھی کرنے میں بہت کچھ کے ساماں باقی

جب یہ کتابوں کہ بس دنیا پر اب ٹف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے
وہاں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہی بار
اُس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجیے
مضبوط کیجیے در و دل تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر آف کیجیے
دوست کے تیو میں ہم ہر رنگ میں چلینے
بے تکلف ملنے ہے یا تکلف کیجیے
جب کہ عقبی مل گئی دنیا ہے پھر بسال الوصول
شیخ لگتے ہاتھ اس پر بھی تصرف کیجیے
وقت تھا جو کام کا حالی گنوا بیٹھے اُسے
جائیے اب عمر بھر بیٹھے تا سف کیجیے

جو کہیے تو جموں جو سینے تو سچی خوشامد بھی بنے عجب چیز پائی
 ہوئی اس کے پیری میں قدر جوانی سب سے بکواسی پناہ وقت آئی
 وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پرست وہ پرست کو بھی کر دکھاتا ہے رائی
 جوانی میں عاشق تھے اب ہم میں اصح جو دھان لے لے لی تھی تو بھان نہ لگائی

قیاس آپ پر ب کو کرتے ہو حالی

نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

وصل کا اسکے دل زار متنائی ہے نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
 قطع اُمید نے دل کر دینے کیو۔ صد شکر شکل مدت میں یہ اندھ نے دکھلائی ہے
 قوت دست خدائی ہے ٹیک بانی میں وقت جب آ کے پڑا ہے ہی کام آئی ہے
 ڈر نہیں غیر کا۔ جو کچھ ہے سوا پنا ڈر ہے بنے جب کھائی ہے اپنے ہی سے لگائی ہے
 نشہ میں چور نہ ہوں جھانچے میں غمور نہ ہوں پند یہ پیر خرابا ست نے فرمائی ہے
 نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی بعد مدت کے تمنا سری بر آئی ہے

بات سچی کہی۔ اور انگلیاں اٹھیں سب کی

سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
 سانا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے
 دیکھو اسے کلیل ذرا گلبن کو آنکھیں کھولو کر پھول میں گراں ہے کانٹے میں بھی کشان ہے

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تیز
 اچھے سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مندی
 جو چھپاتے ہیں حق اندیشہ رسوائی سے
 دوست گر بھائی نہ وہ دوست ہے تو بھی لیکن
 اسے غم دوست تجھی پر نہیں اپنی گزراں
 دل غنی رکھتے ہیں اب دولت دنیا جو لوگ
 عقل ہے۔ اپنی حماقت کے چھپانے کی ٹھیں
 عقل و حسن پہ جتنے بھری مجالس ہو گواہ
 ملنے دے گی نہ اجل تھے ہیں جی بھر کر
 فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پانی بھی
 اس میں شہری بھی ہیں کو ہی ہیں صحرائی بھی
 اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
 گھات میں اُن کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی
 بھائی گرد و ست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی
 کچھ فستق اسکے سوا اور ہے بالائی بھی
 تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمانی بھی
 جنہیں کچھ ساتھ حماقت کے ہو خود رائی بھی
 انکو خود رائی بھی چھپتی ہو خود آرائی بھی
 فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پانی بھی

جی گئے ہم۔ پر رہے مزد و نئے بدتر حالی

دیکھ لی ہے طبعیوں کی سیحانی بھی

راکھ لکے زاہد کا زہدِ ریائی بنائی بہت بات پر بن نہ آئی
 بڑائی ہو رندوں میں بھی شیخ! لیکن کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی
 گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی
 دکا ماتھ جب۔ بنگے پارسانم نہیں پارسانی یہ ہے نارسانی
 بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے سوا اسکے منع میں ہی کیا بڑائی

یہ کشتی یونہیں پار اتر جائے گی
 بڑی اور بھلی سب گزر جائیگی
 ہرک پکھڑی ایوں بکھر جائے گی
 ملیگا : گلچیں کو گل کا پستا
 کوئی دن میں گنکا اتر جائے گی
 رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا
 یہ بازی تو سو بوسے ہر جانے کی
 ادھر ایک ہسم اور زمانہ ادھر
 یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
 بناوٹ کی شہنی نہیں تہی شیخ
 یونہیں عمر ساری گزر جائے گی
 نہ پوسی ہوئی ہیں اُپیش ہوں
 شینگے نہ حالی کی کب تک صدا
 یہی ایک دن کام کر جائے گی

کہ اُنکے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
 سلف کی دیکھ رکھو سستی اور سستی اخلاقی
 حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
 نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی سکن
 گلچینی ہو یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی
 نیگل چھوڑے نہ برگ با بھوڑے تو نگلشن میں
 یہ وہ کہتے ہیں سمجھے جس کو شانی نہ اشراقی
 کمال کفش و زنی علم سلاطوں سے بہتر ہے
 گئے چین یاں سب چینی و فرغانی و قجپا قی
 رہی دانائی آج غایب اگر پہلوانی پر
 اُنٹھا جو خم پہ خم غیروں کیوں مسک تو گرسا قی
 ہمارے ظرف ہی العام کے قابل نہیں نہ

ملاج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
 لطیفہ رو گیا ہے دیکھنا ک غیب کا باقی

اہل حسنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
 بنم میں اہل نظر بھی ہیں تماشا قی بھی

مطہن اس سے مسلمان نہ مسیحی نہ یہود دوست کیا جائیے یہ چرخ کہن کسا ہے
 وعظاک عیبے تو پاک ہی پاوات خدا ورنہ بے عیب نہ مانہ میں چلن کسا ہے
 آج کچھ آؤ دونوں سے ہے سوا استغراق عزمِ تخیس پیرے شیخ ز من کسا ہے
 آنکھ پڑتی ہے ہر اکھسل نظر کی تم پر تم میں روپاے گلِ نسیرین کسا ہے
 عشقِ اوصد عقلِ اوصد و صحن میں چلے پیر ہی رستا بے پکھینے دونوں کٹھن کسا ہے
 شانِ دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اُس کی ولولہ تجھیں یہ اسے مرغِ چمن کسا ہے

ہیں فصاحت میں مثلِ وعظ و حالیِ دونو

دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ آؤ رہی عالم میں چسلی جاتی ہے ہنر کی عیب کی صورت بلی جاتی ہے
 عجب نہیں کہ رہے نیک بد میں کچھ نہ تیز کہ جو بدی ہے وہ سانپے میں ڈھلتی جاتی ہے
 سپاہ و میر سپہ باغ میں لیکن بہیر روتی ہے اور ماتھ ملتے جاتی ہے
 اٹھا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں اجاب کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے
 قلع اُنھیں نہیں گروستوں سے چھٹنے کا طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنھلتی جاتی ہے
 بہت سے کھو دیئے خلیجانِ بینوائی نے ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے
 ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز زمیں بھی اپنے خزانے اُگلتی جاتی ہے
 اڑے گی خاکِ تقدس کی اب سر بازار فقیہ و شیخ میں جوتی اُچھلتی جاتی ہے
 خوفِ مرنے سے جب تھاناب ہو کچھ حالی کچھ اک جھپک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

پھر یہ بنا ہے ہستی ہر تیرے بعد ویراں
ہر تو بھی افسانیت اے ضعف و ناتوانی
کیا جانے کس اداسے کی سنے دستانی
دیکھا جالِ جانان آنکھوں نے اور نہ دل
اے نکتہ کے بیاں سے سر نہ ہو گے حالی

چلتا نہیں کسی کا پھالِ فِ نکتہ رانی

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیا
گرے نہیں دے زہر ہی کا جامِ بلا سے
جو کچھ ہے سو ہے اُسکے تقاضا کی کٹکات
قاصد سے ہے گزار نہ جھگڑا ہے صبا سے
دلا لہ نے اُسے دلائی تو ہے لیکن
دیتے نہیں کچھ دل کو تسلی یہ دلا سے
ہے وصل تو تقدیر کے ماتھے لے شیہ خواہاں
یہاں ہیں۔ تو فقط تیری محبت کے ہیں پایے
پایے ترے گشت ہیں جو راہِ طلب میں
ہو نمٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آج بقا سے
تر گزریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے
تر گزریں دعا سے تو بھروسے چڑھا کے
تخفیفِ دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے
اک در وہو بس اٹھ پہر دل میں کہ جس کو
شرندہ ہوں کیوں کے احسانِ عطا سے
حالی دلِ انسان میں ہے گم دولتِ کونین
جب وقت پڑے دیجیے دستکِ در دل پر

جھکیے فترت نہ جھپکیے اُمر اسے

اے بک و قمری میں ہو جھگڑا کہ چین کسا ہے
کل تباہ کی خزاں یہ کہ وطن کسا ہے
فیصلہ گر و دشمن و راں نے کیا ہے سوبا
مرو کسا ہے بدخشاںِ ختن کسا ہے
دوم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ بیتِ حزن کسا ہے

ہماری آہ بے تاثیر کا حال	کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ
دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری	کس نہ گیونے تندر سے پوچھ
دلِ مجبور سے سُن لذتِ وصل	نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں جز گریہ غم حاصلِ عشق	ہماری چشمِ دریا بار سے پوچھ
نہیں آبِ بقا جز جلوہٴ دوست	کسی لبِ تشنہ دیدار سے پوچھ
قریبِ وعدہٴ دلدار کی تر	شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ
فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل	یہ نکتہٴ معنی لبِ زار سے پوچھ
تصویر میں کیا کرتے ہیں جو ہم	وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ
متلع بے بہا ہے شعرِ حالی	مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ی

ہے انہی دوستی پر بکھو تو بدگمانی	وہ بکھو دوست سمجھیں یا کئی مہربانی
بے جرم کوئی آخر کب تک سنے ملات	ناصر سے بکھو اپنی کہنی پڑی کہانی
عاشق کے دلوں ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے	دیتا نہیں وہ لذتِ پیاسے کو سُر پانی
ایسے وصل سے ہے کچھ عجیب چھڑائے دینا	جو کچھ سٹنا ہو تینے مشاطہ کی زبانی
ہر حکم پر پہوں رضی ہر حال میں مرغِ بخش	کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی
صبر و سکون سے بکھو یہ بھی نہیں نے دے	تھوڑی سی رہ گئی ہولے کا ہیش نہانی

فرغت سے دنیا میں دم بھرنے بیجو اگر چاہتے ہوں فراغت زیادہ
 جہاں رام ہوتا ہے بیٹھی زباں سے نہیں لگتی کچھ اسمیں دولت زیادہ
 مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا مصیبت سے ہی مصیبت زیادہ
 کروڑ کر کم اپنی داد و دہش کا مبادا کہ ثابت ہوخت زیادہ
 پھر اوروں کی تکتے پھر وگے سخاوت بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
 کہیں دوست تھے نہ ہو جائیں بطن جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ
 جو چاہو فقیری میں غرت سے رہنا نہ رکھو پیروں سے ملت زیادہ
 وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
 نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیر خدادے بچھے خواجہ ثروت زیادہ
 ہی الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
 فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا مگر اسمیں پڑتی ہے محنت زیادہ
 بچے مفت یہاں ہم زمانہ کے ہاتھوں پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
 ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر نہیں بس اب اسے عقل مہلت زیادہ

غزل میں نہ رنگت نہیں تیری حالی

الاہیں نہ بس آپ دُھرت زیادہ

حقیقت محرم اسرار سے پوچھ مزا انگور کائے خوار سے پوچھ
 وفا غیار کی غنیار سے سُن مری الفت درود یار سے پوچھ

اُسکے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ مخلص میں بلکہ



درفریض حق بند جب تھانہ اب کچھ قہقروں کی جھولی میں جواب بھی سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یہاں بھیک زاہد بہت جاچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
کچھ اور آؤ بن کر تم اے میرو مرزا نہیں پوچھتے یہاں حسب اور نسب کچھ
یطبل نہی ہیں جو بنگارتے ہیں جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ
دیا تو نے یہاں جس بہانے سے چاما ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ
ہے افسردہ مجلس کی خست سے وعظ وہ گریا نگاہ پھینکے جب کچھ
تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب نہیں باصحو تم پہ الزام اب کچھ
یہ ہے میر مجلس کم چینی کی موت ٹٹولو توھیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمہ چرب تاکا ہے شاید

یہ حالی کی عزت نہیں بے سبب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بیگانگی کی نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
کر دو دوستو پہلے آپ اپنی عزت جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
نکالو نہ رختے نسب میں کسی کے نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ
کر دو علم سے کتاب شرافت نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

بہت بیقرار ہوں محفل میں تیری کہیں ناخواندہ تو بھی یہ سہماں ہو
مجھے ڈالا ہے سو سو گم گماں میں بہت کیوں آنکھیں پھر مہرباں ہو
کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے جسے سستی ہماری داستان ہو

موت ہے بہت حالی تیرا وعظ

کل اُس کے سامنے بھی کچھ بیان ہو

حکم ہے پیرِ حناں کا کہ جوانی نہ گنواؤ
دل کو کس طرح سمجھئے کہ وہی ہر دل
یار کو پار سمجھتا ہے نہ تو غنیمت کو غنیمت
دوست ہوں جسے ہزاروں کیسی کانہیں دے
تو وہی برقِ جہاں سوز ہے بنِ خواہ بہن
ایک ہی دوست اور اُس سے نہیں چھوٹا ہے
ہو گیا ذکرِ قیامت تو حیرن وعظ
تجھ کو اے ابر بلادیکھئے جی چھوٹ گیا
پہنچا ہے خضر کہ ہے وقتِ مدد گاری کا
دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ امید
اے شرافت تجھ کو بچا ہے اگر مفت تو پاک
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
خیر کھارہ عصمیاں ہے پیو اور پلاؤ
وہ امیدیں ہیں نہ اراں وہ منگائیں میں چاؤ
تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے میں بڑاؤ
سچ بتا تجھ کو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ
ہے برابر تیرا بے ساختہ پن اور بناؤ
ناصرِ حجاب تمھیں دشمن کہیں یادِ دستِ بناؤ
باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ
ایک ہی بار تم اے بادلو! سطحِ نہ چھاؤ
ڈنگ لگاتی ہے بہت دیر سے مجھ حار میں ناؤ
آؤ اور زندیاں آج آنسوؤں کی ٹلکے بہاؤ
آج کل کیجئے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ
وقت اب ماتھے سے جاتا ہی جاتے ہو لوگو

جی ڈھونڈتا ہے ہر مہربان میں اُنھیں مگر وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
 دل ہو گیا ہے لذتِ غربت سے آشنا اب ہم کہاں ہولے نشاطِ وطن کہاں
 کتاب ہے خیر ہم بھی ہر دشمن آپ کے شکوے کو لے گیا ہے وہ بے یار و فن کہاں
 رو کا بہت کل آپ کو حالی نے وصال مگر

جاتا ہے مجھ شوق کا دیوانہ پن کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہتا ہے کچھ اپنی زبیاں میں
 قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
 کوئی دن بواہوس بھی شاد ہو لیں دھرا کیا ہے اشارتِ نہاں میں
 کہیں خجماں آپہنچا و فنا گھلا جاتا ہوں ابکے اہتال میں
 نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا بہت وسعت ہو میری دستاں میں
 دل پر درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
 بہت جی خوش ہو احوالی سے ملکر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

و

مرے دلیں ہو۔ گو مجھے نہاں ہو مجھے بھی ڈھونڈ لیں نامِ جاں ہو
 نہ چھپوئل تذکرہِ وصلِ عدو کا اگر سببِ مبارک پر گراں ہو
 تقاضا ہے محبت ہو۔ وگرنہ مجھے اور جھوٹ کا تم پر کیاں ہو

حق ہوا کس سے ادا اُس کی وفاداری کا جیسے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں
 دیکھتے ہیں کہ نہ پختی ہے وہاں کو نسی راہ کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں
 ہوں گے قائل وہ ابھی مصلحِ ثانی شکر
 جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلووار نہیں
 کچھ پتا سنزلِ مقصود کا پایا ہم نے جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
 چشمِ بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ غیرتِ عشق سے اب تک خبردار نہیں
 ہو چکا ناز اٹھانے میں ہے گو کام تمام لشدِ احمس کہ باہم کوئی تکرار نہیں
 مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں
 اصلِ مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا در نہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بتی حالی

سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ نظر نہیں

دشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں لائی ہے بوئے انسِ نسیم چمن کہاں
 ہے بندگی کے ساتھ یہاںِ ذوقِ دید بھی جائے گا دیر چھوڑ کے اب بہمن کہاں
 اہل طریق جو سمجھتے ہیں زاو راہ وصالِ حوصل و ستِ بُرد کوئے راہنِ کہاں
 فصلِ خزاں کہیں میں ہو صیاد گھات میں مرغِ چمن کو فرصتِ سیر چمن کہاں
 لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا لیجائے ہم کو دیکھے ذوقِ سخن کہاں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم بھراں میں نہیں
 چاکل میں ہو مرے جو کہ گریباں میں نہیں
 لکھو دیا یا س نے ذوقِ خلش نہ کر وصال
 اک مرزا تھا سو وہ اب کے دیش پنہاں میں نہیں
 ہنسنے کی سیرِ حرمِ غور سے اے ٹبلِ زنا
 بات چھپتی ہوئی کوئی گل دریاں میں نہیں
 عشق نے مصر میں سو بار زنجیر سے کہا
 فتنہ دہر ہے جو حُسن وہ کنعاں میں نہیں
 محاسب! صدق و صفا یہاں ہو نہیں کے تک
 مصلحت برہمی صحبتِ زنداں میں نہیں
 یہاں بھی ہے کوئی مکان سے دلِ حشی آزاد
 جکوم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں
 بٹھیرتے بٹھیرتے دل یوں ہی بٹھیر جائے گا
 بات جو آج ہے وہ کل غم بھراں میں نہیں
 کس طرح اُسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
 خط میں لکھا ہے وہ القابِ عنوان میں نہیں
 دوسری ہے وہ عظمیٰ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھے
 ایسے الجھاؤ ترے کا کل چپاں میں نہیں
 آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جائے
 اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں
 بے قراری تھی سب سیدِ ملاقات کے ساتھ
 اب وہ اگلی سی درازی شبِ بھراں میں نہیں

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز

یہ تو آتار کچھ اُس مریسلماں میں نہیں

غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دوشوار نہیں
 شادی وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں
 خوب روئی کے لئے زشتی خوب بھی ہے ضرور
 رچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سطرحدار نہیں
 قولِ دینے میں تاثر نہ قسم سے انکار
 ہلکو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں
 کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا
 دل میں سب کچھ ہے مگر نصیب گھٹا نہیں

تصور نے بھلایا تیرے ذوق شادی و غم کو
خوشی میں بھی نہیں بنا خوش آنا ایک حالت پر
زباں تقریر سے قاصد تسلیم تحریر سے عاجز
فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کام دل کے خضر
نہ چھوڑی گئی محبت یار سے ناکام عاشق کو
گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا
بہت دن چاہیں یوسف کو تاپنے زلیخا تک
نہ کچھ کلفت ہی زنداں میں کچھ حیرتِ شبستان میں
کہاں تک جی نہ گھبرائے آہی در و پیراں میں
نہ پوچھو سے کیا دیکھا ہے ہنسنے زبیر زنداں میں
سوائے طولِ حیرت کیا دھڑلے کر جیواں میں
نیم صدمہ آنا ہے اک ن بیتِ احزان میں
ہمارا بھی کہیں لگتا تھا دل سے گھلتاں میں
نگل کر جاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جاں اک دم

رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

اب وہ اگلا سا انتفات نہیں جس پہ پھولے تھے ہم وہ بات نہیں
بھکو تم سے پرستِ مادی و فانی تم کو مجھ سے پرستِ فانی نہیں
سچ کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ زندگی موت ہے حیات نہیں
تو نہیں گذرے تو سہل ہے لیکن فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں سرسری دل کی واردات نہیں
دزدہ ذرہ ہے منظرِ خورشید جاگ اے آنکھ دن ہر رات نہیں

فتیس ہو کو ہر ممکن ہو یا حالی

عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

بھولی ہوئی ہیں ڈائیں ہر نوں کی چوکر سب جانیں کدھر کہ ہر سو دواں لگ ہی ہون میں
حالی بل نہیں بھاس سننے کی تاب باقی مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوک زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا

ترکش میں ہو یہ پکیاں یا ہے زبانِ دین میں

ہو جتھو کہ خوب سے ہے خبر تر کہاں اب ٹھیرتی ہو دیکھے جا کر نظر کہاں
میں در جامِ اول شب میں غدی سے ہوئی ہو آج دیکھے ہو کھر کہاں
یار بابر خستِ لاط کا انجام ہو بخیر تھا اسکو ہم سے ربط مگر تقدیر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو شیشِ عشق رکھی ہو آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکایاں کس فربخِ راہ کا خطا کا مرے جواب کو انا مہر کہاں
کون و مکاں سے ہو دل چوٹی کنار گیر اس غماں خرابے ڈھونڈ ہو گھر کہاں
ہم جس پر مری ہیں وہ ہے بات ہی کچاؤ عالم میں تجھ سے لاکھ سی تو گھر کہاں
ہوتی نہیں قبولِ عاترِ عشق کی دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ دے ڈھونڈتے ہو

اُسے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

پیاہنے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں خزاں کو لگتے ہمراہ اگر پہنچے گلستاں میں
نہیں کچھ منحصر لبگی زلفِ پریشاں میں جو دل چاہے تو ابھر اک غبارِ دو پہیاں میں
اگر چھوڑا کندِ جذبہٴ عشقِ زلیخا نے نہ رہنے دیگا حُسنِ خود کا یوسف کو کنگاں میں

میں اور تو ادا نہیں ساری سہی قدروں کی
 ہے عیارِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں
 سونہ سے دھواں سا اٹھالیتے ہی نامِ لام
 پھر زخمِ پھوٹ نکلا۔ حالی نہ چھپے نہ لٹکا
 گو رو چکے ہیں دُکھڑا سو بار قوم کا ہم
 وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
 پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا
 رُوئے کی جون میں ہے مرعوب اب ہر ملت
 وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستندِ یمن کی
 وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے
 قبرِ اولیس پر ہے بس فخر اب قرن کو
 اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑادی
 ڈالی نہ ہوگی آگے اے دورِ چرخِ شاید
 فوج اور بہیر دو نو پھرتی ہیں بے سری
 خرد و بزرگ سارے ہیں بھجواس گویا
 پڑنی ہے جان باقی بس سرفرازوں میں
 جنگلِ بسا ہوا ہے سب غنمِ ریہن میں
 بارود بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں
 فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں
 پرتازگی وہی ہے اس قصہ کہن میں
 تنے سنا بھی؟ اُسپر کیا گزری انجمن میں
 روندن میں ہے وہ گلبن چھوٹا تھا جو چمن میں
 تھی سہمناک کل تک جو شیر کے برن میں
 ہے اب بجائے حکمت خاک اُڑ رہی یمن میں
 ہے کالِ موتیوں کا اب سرِ سرِ عدن میں
 زندہ اولیس کوئی باقی نہیں قرن میں
 فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں
 جواب کچھ تو نے ہل چل ڈالی ہوا انجمن میں
 گویا امیرِ شکر مارا گیا ہے رن میں
 لٹنے کی قافلہ کے پُنجی خبر وطن میں

8 میں کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ الایمان یمان والحکمة یمانیۃ یعنی ایمان ہے تو میں کا ہے اور حکمت ہے تو میں کی ہے اسی بنا پر میر تقی میر نے اپنے فلسفہ کا نام حکمتِ یمانیہ رکھا ہے ۱۲

غمز و رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جسمیں گھر کرتے ہیں
جی رکاوٹ سے جو اُن کی کبھی رُک جاتا ہے
اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں
ایک پچھا جینے سے بیزار ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں
لتخیاں زلیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ محم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں
قیصر و زار کا پچھا ٹپٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گزر کرتے ہیں
کہیں فطسار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی

اُپ اکثرِ مضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رنخے نکلیں گے سیکڑ و سہیں
کی نصیحت بُری طرح ناصح
اور اک بس ملا دیا بس میں
ہو نہ بینا تو فسق پھر کیا ہے
چشم انسان و چشم زرگس میں
بے قدم و دم ہیں خالق ہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فتنہ رتھے کبھی کچھ چیز
اب دھر کیا ہے اُس میں اور اُس میں
نہو قبضے میں جب عنانِ فرس
ہتیج ہیں جو ہنریں فارس میں
جس سے نفرت ہو اہلِ نعمت کو
وہی نعمت ہی چشمِ مغلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان
درو تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور آدمی - فرشتہ - خدا
آدمی کی ہیں سیکڑ و سہیں
آج کل چرخِ صلح جو ہی بہت
دیکھتے ہو بگاڑ کس کس میں

غل تو بہت یاروں نے چایا پر گئے اکثر ان ہیں
غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں

بس کوئی دن کا اب حالی یہاں سمجھو تم مہمان ہیں

کی تو ہیں رہنے بھی حالی کوچ کی تیاریاں
خوابِ رحمت میں ولذت تیرے ای پیر نہیں
جو جوانی میں فراد دیتی تھیں شب بیداریاں
ناگوار اُنسے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں
سب کو کرنی ہو گئی پوری اپنی اپنی باریاں
زینتِ بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال
اتنی بھی لے عاقلو جتنی نہیں ہشیاریاں
بے مزہ و اہل دیں کی ترش روئی بھی مگر
اُس سے پھسکی اہلِ نیا کی ہیں ظاہر داریاں
گو طبیعت سے گئے سب پاؤں فاسدِ کل

کم ہوتیں حالی یہ لیکن نفس کی بیماریاں

رازِ دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں
عقل کی بات کوئی پہننے کسی ہے شاید
آج ہم شہر میں خون اپنا ہدر کرتے ہیں
جتنی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں
جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں
بولِ قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں
زہد و طاعت کا نہارا نہیں جیسے زہد
عیب یہ ہے کہ کہو عیب بہتر کھلاؤ
اور نہ یہاں عیب تو سب فردِ بشر کرتے ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہو کچھ نرالی

یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

جب سے سُنی ہے تیری حقیقت چہن نہیں اک آن ہمیں

اب نہ سُنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوتے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یہاں ٹھونڈتے ہم آسائش کو

کھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلیجان ہمیں

چل کے نئی اک چال خاکے کھودئے ہوش حریفوں کے

زُرف سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس اُنھیں گرا پنا ذرا ہو جاں اپنی بھی نپسہ فدا ہو

کرتے ہیں خود نا منصفیاں اور کہتے ہیں نا فرمان ہمیں

واو طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس نہ ہو

بتلائی ہے زمانہ لے افساف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا

دیکھ کے اُسکو سارے تمہارے آگے یادِ احسان ہمیں

یہاں تو بدولت زہد و قریع کے نبھ گئی خاصی غرت سے

بن نہ پڑا پر کل کے لئے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُرتھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بیوقت سی تھی

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے پوچھینگے جا کے حالیؔ دو بیاں سے ہم

ن

یارِ دل کو تجھے حالیؔ اب سرگراںیاں ہیں
 یادِ انکی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانو
 بنے ہیں غمِ اپنے ہوتے ہیں رامِ وحشی
 غیبت ہو یا حضوریؔ دو نو بُری ہیں تیری
 کہتے ہیں جبکو جنت وہ اک جھلکے تیری
 رحمتِ تیری غذا ہے غصہ ترادو اسے
 ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخِ مہرباں تو
 اپنی نظر میں بھی بھیاں اب تو حقیر ہیں ہم
 روئے ہیں چارہمِ پسر ہنستے ہیں چارہمِ پیر
 ہر حکمِ پرہوں رُحنی ہر حال میں ہر خوش
 خاور سے باختر تک جکے نشان تھے برپا
 دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
 اکھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہو گنگا
 خضل و نہر بڑونکے گر تم میں ہوں تو جاں

نہیںیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
 اب بچھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
 الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
 جب بد گمانیاں تھیں اب بد زبانیاں ہیں
 سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
 شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں
 کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہ زبانیاں ہیں
 بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
 یہاں تک ہماری پہنچی اب نا تو انیاں ہیں
 حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
 کچھ مقبروں میں باقی انکی نشانیاں ہیں
 اس سے بھی سخت آئی آگے گزائیاں ہیں
 کچھ کرو نو جو انو اٹھتی جو نیاں ہیں
 گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

ہو اگر مقصد میں نا کامی تو کر سکتے ہیں صبر
 رو خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم
 ٹھیرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے
 حال نفس وں کا اتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم
 جہد رنجھک جھک کے ملتے ہیں بزرگِ حُزُو
 کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم
 گو بھلائی کر کے بچندوں سے خوش ہوتا ہوجی
 تہ نشیں نہیں مگر دُورِ ریا پاتے ہیں ہم
 ہے رولے نیک نامی دوش پر اپنے مگر
 داغ رسوائی کے کچھ زیرِ دوا پاتے ہیں ہم
 راہ کے طالب ہیں پر بیراہ پڑتے ہیں قدم
 دیکھے کیا ڈھونڈتے ہیں و کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہمنے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر

رنگ کچھ تیری لالہوں میں نیا پاتے ہیں ہم

اگے بڑھے نہ قصہ عشقِ تباں سے ہم
 سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازِ داں سے ہم
 اب بھاگتے ہیں سایہ عشقِ تباں سے ہم
 کچھ دل سے ہیں ڈبے ہوئے کچھ آسمان سے ہم
 خود فریگی شب کا مہر بھوتا نہیں
 آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم
 دردِ فراقِ شک و تک گراں نہیں
 تنگ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
 جنت میں تو نہیں اگرے نغمِ تیغِ عشق
 بد لینگے تجھ کو زندگی جاوِ داں سے ہم
 لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نیکر
 اے میں آج چھوٹے قیدِ گراں سے ہم
 ہنستے ہیں اُسکے گریہ بے اختیار پر
 بھوئے ہیں بات کہلے کوئی رازِ داں سے ہم
 اب شوق سے بجا رُکی باتیں کیا کرو
 کچھ پاگئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم
 دلکش ہر ایک قطعہ صحرا ہے راہ میں
 ملتے ہیں جا کے دیکھیے کبارِ واں سے ہم

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر شہ پہنچ کر فر کے ٹوٹ
صحبتیں اہلِ فرج کی سب گتیں نظر سے گزر
شیخِ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ہم نہ تھے آگاہ و عنقریبِ خوبی سے تری
سچی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ما تھ ساحل ہی پہ پڑے سے اٹھاٹھے تھوہم

ہے خود دنیا ہی پتیانی نہ حالی ورنہ یہاں

دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

خوبیاں اپنے میں گوبے اُتھا پاتے ہیں ہم
خوف کا کوئی نشان ظاہر نہیں فہال میں
کرتے مرطاعت تو کچھ خواہاںِ غاش کے نہیں
دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں کھ سکتے بان
دل میں رُوِ عشق نے مدت سے کرکھا ہو گھر
ہو کے نادومِ جرم سے پھر جرم کرتے ہیں ہی
ہیں خداؤں و دوستوں پر جنہیں ہو صدق و صفا
گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
جاتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا
گر کبھی تو فریقِ ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

کاہنوں نے پرورش پاتی ہے روح اب لگا کھایا پیاسب آ کے انگ
عقل شاید ناک میں باقی ہے کچھ ہی ابھی کم حاصل افیون بنگ
بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت ہوگی ایجا و ابنتی توپ اور تفنگ
قوم کو حالی نہیں پس اتفاق پھوٹ ہی کابن کھلیگا ہمہ رنگ

ل

ہونگے ہیں بسم ہی کچھ اور آج کل یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل
رمگے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف اور ابھی ہونا ہے شاید بتدل
اک سنبھلتے ہم نظر کرتے نہیں ورنہ گر کر گئے لاکھوں نبھل
کب تک آخر تھیر سکتا ہے وہ گھر اگیا نبیاد میں جس کی خلل
ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار تیری حد بھی ہے کچھ لے طول اہل
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی لپچے پودے بہت اگلوں کے پھل
دیکھتے نبھتا ہے کب تک پاس وضع ہم نہ بے اور گیا عالم بدل
کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں وقت کوشش کا گیا شاید نکل
اب سو حالی کے توڑے عمر بھر ہو چکا ہنس گمانہ موج و غزل

م

مدرسہ میں دہر کے روبرو تھا بیٹھے تھے ہم اٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

دوست کے ہیں جان نثار اپنا ہویا بیگانہ ہو
 ہے عیش و اور انکا دو دواں سب سے الگ
 سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
 ہے کوئی بھییدی اور انکا از داں سب سے الگ
 جاپختے اور نو نکو میں خود لے کے اپنا ہتھاں
 رکھتے ہیں اپنا طریق امتحاں سب سے الگ
 اک چمن ہر تفریح رکھتے ہیں زیرِ عجل
 روضہ و بستان و فردوسِ جہاں سب سے الگ
 کلبہ اخراں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے
 ہے وہ نورِ مہروماہ و کمکشاں سب سے الگ
 سیکڑوں پھندوں میں بھٹا جگا ہوا ہونہ بند
 پر شولے کوئی دل نہکا تو دھاں سب سے الگ
 شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
 در و مند دل ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر

شہر میں کھولی ہے حالی نے کان سے الگ

صلح ہے اک مُہلتِ سامانِ جنگ کرتے ہیں بھرنے کو بھٹا خالی تنگ
 عہدِ گیتی پر نہ چھو لیں کلامِ راں آخر اسکی ہشتی لائے گی رنگ
 علم کیا۔ حنلاق کیا۔ ہتھیار کیا سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں مُہنگ
 روکیے بد خو کو بد خوئی سے کیوں آپ اپنی خوشے آجائے گا تنگ
 زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاو یہ بھی ہے اک نو جوانی کی ترنگ
 پاکبازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع جو ہیں اچھے اُنہ سب کھلتے ہیں رنگ
 کام کا شاید زمانہ ہو چکا دل میں اب اُٹھتی نہیں کئی اُمنگ
 وہ عجائبِ نظر آتے ہیں کھیل دیکھ پہلے جن کج رجالتے تھے دنگ

ک

ولوں کل کھوٹ اگر کہتے برلا ایک ایک
 تو آشنائے ہو گئے آشا ایک ایک
 سلامتی کو وہ باقِ فلوں کی رٹھیں
 جہاں ہر راہزنِ خلق رہا ایک ایک
 زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
 بنا ہے غوثِ زمانِ آجکل گدا ایک ایک
 راہوں زند بھلی شیخ پارا بھی ہیں
 میری نگاہ میں ہو زند و پارا ایک ایک
 وفا کی ایک تجھی سے نہیں ہر اس وقت
 کہ یار سے ہو جائیگا جد ایک ایک
 چھپا کے اس سے قصو اپنے ہم بہت شرکا
 جب آپ موند سے لگی ہوئے خطا ایک ایک
 ہوانہ ایک بھی حق اسکی بندگی کا ادا
 کیا ہے جسے حق خواہی ادا ایک ایک
 امیرِ حاج کی بہت میں گزرتے قصو
 تو موجِ بحر سے کشتی کی ناخدا ایک ایک
 ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
 ورق جب اسکا اڑا لیگتی ہو ایک ایک
 ہمارے بھی نہ بیل تری بھجائی آگ
 جگر کے پار ہو اب بھی تری نوا ایک ایک
 وہ عشق ہو نہ جوانی وہ تو ہو اب نہ وہ ہم
 پہ دل نقش ہو اب تک تری ادا ایک ایک
 نہ ہم رہینگے حالی پہ و خراشِ جہاں
 رہیگی حالی نگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالم آزاد گاہاں ہے اک جہاں سے اک
 ہے زمین انہی اور انکا آسمان سے اک
 پاک ہیں لائشوں میں بند شو نہیں بے لگاؤ
 رہتے ہیں نیامیں سے درمیان سے اک

ف

حق نہ ملانے کچھ بتایا صاف اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف
 آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کھلی مہر روشن نظر نہ آیا صاف
 کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم صاف تھے آپ سب کو پایا صاف
 زاہد و ہم تو تھے ہی آلودہ تم کو بھی بنے کچھ نہ پایا صاف
 کیوں فقیہوں سے رک گئے حالی بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ق

نہ ہم میں یار کی محفل میں بار کے لایق نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لایق
 گھرے گا کیا تیر کھل الجواہرے کمال نہیں یہ آنکھ ہی دیدار یار کے لایق
 مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ بہت ہے زندگی ستار کے لایق
 غرور و حرص ہیں زریور عروس دنیا کے بناؤ تھے یہی اس نابکار کے لایق
 کرے گی باد بہار آ کے اب کسے سبز رمانہ باغ فردوس ہمار کے لایق
 بس اب ہو فضلہ روباہ و گرگ پر گزرن رمانہ شیر شیاں خود شکار کے لایق
 گنہ کا عذر کریں مستب ہم آنکھوں سے ہمارے جرم ہوں گراعتذار کے لایق
 گھر میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی تمہیں تو شہر میں ہو تہ مبار کے لایق
 یہ بنے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لایق

ع

اے بہارِ زندگانی الوداع اے شبابِ بے شادمانی الوداع
 اے بیاضِ صبحِ پیریِ اسلام اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
 السلام اے قاصدِ ملکِ بقا الوداع اے عمرِ فانی الوداع
 روزِ کارِ ضعفِ دوستیِ اصلا وقتِ سحیٰ جانفشانی الوداع
 فرصتِ عشقِ و جوانیِ انشراق ^{قطرہ} ۱ دو عیش و کامرانی الوداع
 تجھ کو سمجھے تھے نصیمِ جاوداں ۲ اے نصیمِ جاودانی الوداع
 تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں ۳ اے خدا کی مہربانی الوداع
 آنگا حالی کنارے پر جہاز الوداع اے زندگانی الوداع

ع

کل کیا سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک نزاغہ
 ہے تاک میں عقاب تو شہبازِ گھات میں
 یارب نگاہِ بد سے چمن کو چپائیو
 دو چار گامِ نقشِ قدمِ تل کے رو گئے
 آئیں پیئیں وہ شوق سے جو ہلِ ظرفِ ہوں
 جنگل میں تختہِ گلِ خود رو کو دیکھ کر
 حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
 دیکھ اس خرامِ نازِ پہ اتنا نہ کرو داغ
 جھلے سے پھاں اہل کے نہیں ایک دم فراغ
 بلبل بہت ہو دیکھ کے پھولوں کو باغِ باغ
 اس کے چلا نہ آہوں بے مشکین کا کچھ سراغ
 ساقی بھرے کھڑے ہے فہمِ لعل سے ایام
 نازہ ہو ازمانہ کی نامتِ ریوں کا داغ
 باری تب انکی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

ط

رات گزری ہو چکا دور نشاط
 طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
 دل سے خوشیاں بگئیں سب گوشہ گیر
 نام تھا شاید جوانی کا نشاط
 دن اب بدل منقبض رہے کہیں
 ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط
 غنچہ چمکا اور اس پہنچی حنراں
 فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط
 زینہ منبر ہے لعرش کی جگہ
 جانو واعظ اسے راہِ صراط
 تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
 ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط
 کوچ کی خالی کروتیاں
 ہے قوسے میں موبہم اب انحطاط

ظ

چھپے ہیں حرفِ قیل میں احرار و عظ
 بڑا کہہ نہ رندوں کو زہار و عظ
 سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
 نہ ستار ہے تو نہ غفار و عظ
 نکل آئے گی نئے کشی کی بھی حلت
 کوئی مل گیا اگر ہمیں یار و عظ
 کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن
 سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار و عظ
 ہمیں آؤر بھی تجھ سے کرتے ہیں بظن
 یہ جبہ یہ ریش اور یہ وستار و عظ
 پنچھڑے گا زیور گھروں میں نہ زرتو
 یہی ہے اگر حسین گھٹار و عظ
 مسلمان نہ ہم کاش خالی کو کہتے
 ہوئے بات کہہ کر گنہگار و عظ

عشق سے ہی مجھ تنب زار ہدایت
شیر کو صید زبوں سے کیا غرض
کھرچکا جب شیخ تلخیر تلو ب
اب سے دنیا نے زوں سے کیا غرض

آئے ہو حالی پے تسلیم بیاں

آپ کو چون چپوں سے کیا غرض

دوست کا ناروا نہیں اس راض
دوستوں ہی کا کام ہے انماض

چاہیے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی جد جہدا غراض

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیئے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھتے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
آور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

لَا اَبَالِيْ بِاَنْ يُعَاثِبَنِيْ
کُلُّ نَاقِیْ اَنْتَ عِیْ رَا ض

منعمو بذل خیر میں یہ دیر
اپنا مطلب اور سپہ سوا غماض

حق میں اپنوں کے سخت مشک میں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض

راہی ہے کچھ طلیل تسی سیری
نبض اپنی بھی دیکھ اسے بناض

وعظ میں گل کھرتے ہیں واعظ
موندہ میں اُن کے زباں ہی مقرر اض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
هَلْ لَنَا فِيْ نِزَاعِنَا مَقْضَا ض

ہے ریاضت پہ ناز کیا زہد
خار کش بچہ سے ہے سوا مراض

شیخ کی تھی یہ آخندہ ی تلقین
چاہیے زرتو اُس سے کرا غراض

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

یوں تو ہے امید بکچہ پر نہ ہوں شاید مخلص
وہ جو کی ہیں بننے لے حالی خطائیں خاص خاص

درد اور درد کی ہے سب کے دوا۔ ایک ہی شخص
عور و غلمان کے لیے لائیں لکڑی کا
یہاں ہی جلا دوسیا بخدا ایک ہی شخص
ہونے دیتا نہیں یہاں عہدہ ہر ایک ہی شخص
ہو جہاں راہزن اور رہنما ایک ہی شخص
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سد ایک ہی شخص
آج دیا کوئی دے ہما دکھا ایک ہی شخص
کچھ سہی شیخ۔ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعترافوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ پچوڑ
شاعر باری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

ض

عشق کو ترک جنوں سے کیا غرض
دل میں ہواے خضر گر صدق طلب
چرخ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
راہرو کو رہنمائیوں سے کیا غرض
گھر کے محراب ہوتوں سے کیا غرض
انگو چنگ ارنخوں سے کیا غرض
ہما کو تفتیش درہل سے کیا غرض
انگو اپنے اشکِ حزن سے کیا غرض

عشق کو ترک جنوں سے کیا غرض
دل میں ہواے خضر گر صدق طلب
حاجیو ہے ہما کو گھڑالے سے کام
گنگنا لکڑی رو پڑتے ہیں جو
نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا
دوست ہیں جب خیم دل سے بے خبر

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر کی سینہ کیوں حرام لبس اسے تہظار لبس
تھوڑی سی ہے رات اور کمائی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نر دل کے بخار لبس

س

اک ہسم کو ہم برسرِ ایام ہے درپیش
بقاناظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش
مغفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہی چار طرف سے
اور معرکہ گردشِ ایام ہے درپیش
وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز
اب اُس مریضِ صعب کا انجام ہو درپیش
صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی۔ قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہو درپیش
وہ وقت گیا۔ نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا
اب وقتِ خمار مئے گلغام ہے درپیش
امیدِ شفا کا تو جواب ابھی چکا ہے
اب بت کا سنا تھا میں پیغام ہے درپیش

جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زہند
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

ص

ہر شے سے اُنکی مختص میں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو اس میں جیسے دوا ہیں خاص خاص
دل تو اپنا پھر چکا ہے زانِ نیا سے۔ مگر
بہرِ نر دل میں ابھی اُس کی دوا ہیں خاص خاص
گھر زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فضلِ گل
یاد ہیں لیکن وہ نلیل کی صدائیں خاص خاص
زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں حائیں مستجاب
وقت میں کچھ خاص خاص اور ہیں ادھر خاص خاص

عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں کشت درگزر

عجز اپنا ہے کلید باب رضواں اپنے پاس

ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے

عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطان اپنے پاس

بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کشت

رکتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ پڑاں اپنے پاس

خاک میں ہنسنے والا رکھی ہے اکسیر اپنی۔ آپ

ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس

دست بردا ہر من کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں

ہے بھرا اللہ وہ مہرِ سیلیجاں اپنے پاس

دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل

ہے یہ دستاویزِ اختلافِ حال اپنے پاس

کافی ہے خارِ غمِ روزگار بس

چھیرا ب نہ اے تصورِ مرگان یا رہ بس

غجواری اپنی رہنے دے ای غمگسار بس

یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے

گلاشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس

ہر داغِ فضلِ گل کی نشانی ہواے صبا

اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس

ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پسِ بخت

یہاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یا رہ بس

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ۱۔ ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
 ہوتے جاتے ہیں ورنہ ضعیف ۲۔ بنتے جاتے ہیں بستل ممتاز
 چھتے پھرتے ہیں بکات تہو سے ۳۔ گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
 ہے ہنتوں کو ہر گز میں خطر ۴۔ رہنروں نے کیے ہیں ماتھے دراز
 مڈٹیوں کا ہے کھیت تیونچہ بجوم ۵۔ بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تلباز
 ناتوانوں پر گدہ ہیں منڈلاتے ۶۔ گھاتوں پر ہیں ہینس تیر انداز
 تشہ خوں میں بھوکے شیروں کے ۷۔ حیلہ گر روہوں کے عشوہ و ناز
 دشمنوں کے ہیں دست خود جاسوس ۸۔ اور یاروں کے یار ہیں غماز
 ہو گا انجام دیکھئے کیا کچھ ۹۔ ہے پر آشوب جبکہ یہ آغاز
 لے ابھی تک کھلی نہیں لیکن ۱۰۔ غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز
 وقت نازک ہے اپنے بیرے پر ۱۱۔ موج ٹال رہے اور ہونا ساز
 یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے ۱۲۔ یا گیا کشمکش میں ڈوب ہمار
 کام اُسے اپنے سوچے و حالی ۱۳۔ نہیں جس کا شریک اور انباز
 ہے وہ مالک ڈبے خواہ ترے ۱۴۔ چارہ یہاں کیا ہے غیر عجز و نیاز
 ۱۵۔

س

جاذبِ رحمت ہے مقناطیسِ عیساں اپنا پاس

رکھتے ہیں عاصی کمند صیدِ غمراں اپنے پاس

کبھی اے علم منہ پر گھر تھا تمہارا ولی
 شاعری جس پہ کی اب زندہ نہو گی یارو
 غالب و شیفہ و فیروز و آرزو و ذوق
 مومن و علوی و صہبائی و مومنوں کے بعد
 اردو پار کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
 داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر ایں گلشن میں
 رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیرِ زبر
 ہمو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
 یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھا ناہرگز
 اب دکھائے گا یہ شکلیں نرماند ہرگز
 شعر کا نام نہ لے گا کوئی وانا ہرگز
 ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
 نہ سنیکا کوئی ٹبلیل کا ترانہ ہرگز
 اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
 یہاں مناسب نہیں رورو کے رُلانا ہرگز

رنجش و ہفتات و ناز و نیاز
 عشق کی آج اُس میں پاناہوں
 شمع ! اللہ رے تیری عیاری
 اک پتے کی جو ہنہ کدی آج
 ہما و نسبت پہ فخر ہے تیری
 آج منہ کو بھی ناچ اٹھیں گے
 خیر ہے اے فلک کہ چار طرف ^{قلعہ} چل رہی ہیں ہوا میں کچھ ناساز
 ہنسنے دیکھے بہت نشیب و فراز
 دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
 گس تو جہ سے پڑھ رہا ہے نماز
 رنگ و عطر کا گر گیا پرواز
 تو گئی بھول ہم کو خاک جواز
 گر مٹتی کی ہے یہی آواز
 خیر ہے اے فلک کہ چار طرف ^{قلعہ} چل رہی ہیں ہوا میں کچھ ناساز

جتنے رتنے تھے ترے ہو گئے دیراں عشق
 کچ سب کر گئے ولی سے ترے قشاش
 پندرہ پہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
 دہتاں گل کی خزاں میں نہ سنا لے بلبل
 ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مہرب
 صحبتیں اگلی مصوہ ہمیں یاد آئیں گی
 سوجن ل میں ہیں بھانجن کے دیا جیتم
 لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اوسٹا
 چپے چپے پہ ہیں بھیاں گوہر بختا خاک
 ٹپٹ گئے تیرے سٹانیکے نشان بھی اب تو
 وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی نہیں بھول گئے
 جکوزخموں سے حوادث کے چھوٹا بھجیں
 ہم کو گرتو نے رُلا یا تو رُلا یا اسے چرخ
 یا رخ و روئیں گے کیا اپنہ جہاں و تہا ہے
 آخری دو میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
 بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے در زباں
 بھانسی خست ہو سو کر کہیں اے عیش و نشاط

آگے دیرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
 قد ریحاں رہ کے اب اپنی نہ گنونا ہرگز
 نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
 ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلا نا ہرگز
 درواغیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
 کوئی دھپ پرتق نہ دکھانا ہرگز
 دیکھنا برس آنکھیں نہ چرانا ہرگز
 دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
 دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزا نہ ہرگز
 اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
 ایسا بد لا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
 نظر آتا نہیں ایک ایسا گھڑانا ہرگز
 ہم غنیمتوں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
 ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
 بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
 نہ ابھی پسند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
 نہیں سن دو میں بھیاں تیرا ٹھکانا ہرگز

مرا

غمِ وصالِ دل نے بھلایا نہیں ہنوز
 پیغامِ دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز
 لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں
 آیا نہ ہوگا اُسکو تغافل میں کچھ مرا
 ایں میں آگ لگ چکی اور طورِ جبل چکا
 بھیاں دیچکی جواب مہیہ جوابِ خط
 پایا ہے ذوق و شوق میں ہمکو بھرا ہوا
 کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یا
 سرمایہٴ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل
 باتوں میں ہنسنے زہرِ بلا یا نہیں ہنوز
 کس نشہ میں ہے چورِ خدا جانے اسقدر
 حالی نے جامِ مونہ سے لگایا نہیں ہنوز

جیسے جی موت کے تم مونہ میں نہ جانا ہرگز
 عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظرِ باز و نچی
 زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
 چاہت رک طلعتِ مکروہ ہی رقع میں نہاں
 دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
 دیکھنا شیرے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
 زوڈ میں تیرِ صغیرِ شرکاں کی نہ جانا ہرگز
 کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
 توجوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز
 ماتھے تلنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے

آبادہ دہر پرده دری پر ہے قوم کی
 غرت سے اپنی یار و ناکو کچھ آپڑی ہے ضد
 مشکل بہت ہو گو کہ مٹانا سلف کا نام
 گوئے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دل بُبا
 مبروص کو رہے گا نہ غریاں کیئے بغیر
 چھوڑینگے نیمجاں کو نہ بے جاں کیئے بغیر
 مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیئے بغیر
 اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ماں کیئے بغیر
 چھوڑے گا وقت انھیں نہ مسلمان کیئے بغیر
 تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی

حالی کشیگا کاٹنے ہی سے بیستوں

حل ہوں گی شکلیں نہ یہ آساں کیئے بغیر

چھوڑ دینا ہے شکلیں

گھر ہے دشت خیر اور بستی اُجاڑ
 اُجڑ ہو گئی ایک اک گھڑی تجھ پر پہاڑ
 آج تک قصیر اُٹل ہے نامام
 بندھ چکی ہو بار بار کھل کھل کے پاڑ
 ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
 اے طلب نکلا بہت اوچھا پہاڑ
 کھیلنا آتا ہے ہر کو بھی شکار
 پر نہیں زہد کوئی ٹٹی کی آڑ
 دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
 سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ
 عید اور نوروز ہے سب ل کے ساتھ
 دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اُجاڑ
 کھیت رستے پر ہے اور بہر و سوار
 کشت ہے سرسبز اور نیچی ہو بار
 بات دہ خط کی کوئی پکڑ سی گئی
 ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر تارا
 تم نے حالی کھو لکر ناحق نباں
 کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

جانتے ہیں آپ کو پہ پہن زگار دوست اکے ہیں نہ اُسکے آشنا
 عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر
 حضراتیں رو بہا کی رکھتے ہیں ہم اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یعتیں
 کرنی پڑتی ہے کیسی کیج جب کرتے ہیں تقریر کشتِ محضر
 گر کیا عیب سُن پاتے ہیں ہم کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر
 کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر
 ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر
 عیب کچھ گنتے نہیں اُس عیب کو جس سے ہوں اپنے سوا سب بیخبر
 خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں کھینچ کر لاتے ہیں اُس کو سوئے شر
 بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہنر
 دوست اک عالم کے پر طلب کے دوست ایسے یاروں سے حذر یار و حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہوں کون

خواہشِ تخیل ہے حضرت کو مگر

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر دام اٹھتیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر
 گو ہو شفا سے پاس چیتک ہو دمِ مدم بن آئے گی نہ درو کا دریاں کیے بغیر
 بگڑی ہوئی بہت ہر کچھ اس باغ کی ہوا یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب ہمو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ
 قند سے شیریں تیری پہلی نگاہ دوسری قندِ مکرر سے لذیذ
 بھانچہ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو بھوک ہے وہ شیر مادر سے لذیذ
 ہی تجھ میں کس کی بوباس لے صبا بونے بید و مشک و عنبر سے لذیذ
 جو قناعت کے ہیں حالی یہاں انکو فاقے ہیں منہ عفر سے لذیذ

سا

ہے یہ تکیہ تیری عطاؤں پر وہی صبر ہے خطاؤں پر
 رہیں نا آشنا زمانہ سے حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
 رہو و باخبر رہو کہ گماں رہنری کا ہے ہر نماؤں پر
 ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہی کیا مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر
 اُسکے کوچ میں میں بے پرویاں اُٹتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر
 شہسواروں پہ بند ہے جو راہ وقف ہی پچھاں برہنہ پاؤں پر
 نہیں نیمِ حسم کو اُسکی بوند نصیب مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
 نہیں محدود و بخششیں تیری زہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخوہت عفو کی حالی

کیجے کس مومنہ سے ان خطاؤں پر

کرتے ہیں سو موطر جسے جلوہ گر ایک ہوتا ہے اگر ہسم میں ہنر

اگر درِ دل سے پانی بھی اے چارہ گر شفا
 آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد
 یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اُسکی یاد
 آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد
 کرتے رہے خطائیں مذہب کے بعید ہم
 ہوتی رہی ہمیشہ مذہب خطا کے بعد
 آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ حسیہ سر
 تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد
 مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہرِ شر
 بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد
 حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
 دلکش صد سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا بے زاہ
 تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہ
 درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
 تو تیرا اور کوئی ہو گا خدا اے زاہ
 ہم دکھا دیگے کہ زہا اور ہے نیکی کچھ اور
 لکچہ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہ
 قریب حق کے لیے کچھ سوزِ نہاں بھی ہر ضرو
 خشک نفلوں میں دھیر کیا ہو بھلائے زاہ
 میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تے
 تو ہی کہہ آہیں ہے کیا میری خطائے زاہ
 جالِ حیات تک ہی پھھیلا ہوا دینداری کا
 فکر دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہ
 عیبِ حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں
 ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہ

فی

پیاس تیری بوی ساغر سے لذیذ
 بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ
 جسا تو قاتل ہو پھر اُس کے لیے
 کوئی نعمت ہی خنجر سے لذیذ

دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجے کیا حالی۔ نہ کیجے سادگی گر خستیار

بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

تو ایسی ہی کوئی چاٹ اُور دے لگا اس شیخ

تمہیں بھی ہو کوئی یاد ایسی کیمیا اسے شیخ

تماشے دیکھے ہیں یہ ہنسنے بار مالے شیخ

بچھے پہ رکھتے ہیں ہم منحصر تالے شیخ

پھر ایسا کیجیو سہ گز نہ ادعا لے شیخ

ہیں آپ جو لسنے بیڑ کیے نا خدا لے شیخ

شناوری کا یہی گر ہے۔ مرجا لے شیخ

نہایت آپ کی ہے۔ اُنکی ابتداء لے شیخ

پہ خانقاہ سے افردہ دل گیا لے شیخ

مے مُنہاں کا ہے چکا اگر بُرا لے شیخ

ریا کو صدق سے ہی جام مے بدل دیتا

وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر

غرور فقر و غرور غنا میں فرق ہے کیا

زباں پہ ہوتی ہو مُہر اُنکی جو ہیں محرم راز

خبر بھی ہے تمہیں؟ کیا بن رہی ہو بیڑ پر ^۱

وہ دو بتوں سے الگ ہے تہ ہیں جو ہیں تیرا ^۲

گو زن و گور ہیں کسپن سے تارک دینا

کمال حسن عفتیت سے آیا تھا حالی

س

اب خوف کے سوا ہے دھڑکنا بجا کے بعد

ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

بڑھتا ہو اور ذوق گنہ بچاں سزا کے بعد

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور

تغزیرِ حُرُمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب

ستے سے اگتائے اور محنت سے کنیائے نہیں

جھیلے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

برسم حمایت پر ہیں کرتے تحمل کو فرماں روا

انفس پر رکھتے ہیں کوڑا حاکم انوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپ سے نہیں

غم میں رہتے ہیں شگفت شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکین جوانی میں بڑے پالے سے سوا

رہتے ہیں چو پخال پیری میں جوانوں کی طرح

باتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی

پر بجالائے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

اتس کھیتی کے پھٹنے کی انھیں جو یا نہ ہو

ہیں اسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

نئے نئے ہوتے ہیں بے اولسوی ہلاکت میں چار

مہربانی کرتے ہیں ناہم زبانوں کی طرح

کام سے کام اپنے انکو۔ گو ہو عالم کشتہ چین

رہتے ہیں تیشیں دانتوں میں زبانوں کی طرح

لعن سنی سن آفتوں کے پہلے نہیں دیوانہ

شاہدِ حسن کو آرایش کی کچھ حاجت نہیں

سجھ و سجادہ میں سچ اور جُبّت و دستار میں سچ

ہوگر تجھے جس قدر اُتے برستے تم نہیں

اے فضا ہے یہ سب گنہگارِ بے کردارِ سچ

روتی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پیچا دل نہ ایک

نکلے موتی تیرے سب سے چشم گوہر بارِ سچ

خواںِ نعمت لئے ترے اے عاملِ مُردارِ خواں

کر دیتے آفاق کے سب خواں و خواں سالارِ سچ

ہے ادبِ سنڈیہ جو کچھ ہے ریشِ سرکا

ہٹ کے سنڈیہ سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکارِ سچ

گو کہ حالی لکھتا ہوتا دجلی کے آگے سچ ہے

کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی ابے و چارِ سچ

ح

کاٹئے دنِ زندگی گے اُن یگانوں کی طرح

جو سدا رہتے ہیں چوکسِ پاسبانوں کی طرح

منزلِ دُنیا میں ہیں پادِ رکابِ آنکھوں پر

رہتے ہیں مہاں سدا میں مہمانوں کی طرح

زُود سے لغت کی بچکے چلنا تھا
مُفت حالی نے چوٹ کھالی آج

نکچے دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج یہ بھی ہے یار کوئی رنجوں میں رنج
رنج و شادی بھانکے ہیں بے ثبات اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج
تھا قناعت میں نہاں گنج فراغ پر ہمیں بیوقوف ماتھے آیا یہ گنج
فکروں بڑھتے تھے شاید ساتھ تھا ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے سنج
ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا جب کبھی جیتے تھے ہم بے بدل رنج
آگنی مرگ طبعی ہر کو یاد شاخ سے دیکھا جو خود گرتا رنج
راہ اب سیدھی ہو حالی سو دوست ہو چکے طے سب غم و ہج رنج

چ

بزمِ اچھی ہے گو دُنیا ہے اے میخو اچ

یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دُنیا کو دم بھریا رنج

نفس سے سر بہ موتی دانش ز صبر عقل ہوش

ایک دشمن بر سرِ کیں ہو تو ہیں سب یار رنج

شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز

ہو یہ سب اپنی دُکان اور رونق بانا رنج

بھید و اعظا اپنا کھلوا یا عبث دل جلوں کو تو نے گر مایا عبث
 جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی رات بھر یاروں کو چنچوایا عبث
 شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
 کوئی بچھی آنکے اب پھنستا نہیں آپنے جال اپنا پھیلا یا عبث
 اسکتے تھے کبھی مسجد میں ہم تو نے زاہد ہیکو شرایا عبث
 کھیتیاں جلکرتیوں یاروں کی خاک ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث
 قوم کا حالی پُچھنا ہے محال تم نے رو رو سب کو رلوا یا عبث

ج

بات کچھ ہے بن نہ آئی آج بول کر ہمنے مونہ کی کھائی آج
 چُپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ بات بگڑی بنی بنائی آج
 شکوہ کرنے کی خونہ تھی اپنی پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
 بزم ساتی نے دی الٹ ساری خوب بھر بھر کے خم لُٹھائی آج
 مصیبت پر ہے دیر سے یارب نفس اور شرع میں لڑائی آج
 غالب آتا ہے نفس میں یا شرع دیکھنی ہے تری خدائی آج
 چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو نیند پھر رات بھر نہ آئی آج
 گل یہاں کار بار ہیں سب بند کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

جو کہ تجھ کو بنا دیں اے میر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بجاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب میر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ
برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گنیں کھیتی کو چاٹ
تیغ میں پرتش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چنگیاں سی دل میں یہ لیستا ہو کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

ش

باپ کا ہے جی بھی پسروارث
ہو نہر کا بھی اُسکے گروارث
گھر منبر و کا ناخلف نے لیا
تیرا ہے کون اے ہنروارث
فاتح ہو کمانے میت کی
لیگتے ڈھوکے سیم و زروارث
ہوں اگر فوق کسبے آگاہ
کریں میراث سے حذروارث
خاک کرمان گورویش و تبار
ایک میت اور اس قدر وارث
و غطو دین کا حقد حافظ
انبیل کے ہو تم اگر وارث
قوم بے پر ہے دین بے کس ہو
گئے اسلام کے کدھروارث
ہم پہ بیٹھے ہیں تھو دھوکو حریف
جیسے مرفہ کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑے کچھ اگر حالی
گیوں میں میت پہ نوج گروارث

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بڑا سو بار پر ڈرائی ہے بہت آج بھنور کی صورت

انگو حالی بھی بُلالتے ہیں گھر اپنے مہماں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بناتے ہیں مہربانی کی صورت چھپتی نہیں سرگرائی کی صورت

جسے دیکھ کر دل ہو عاشق کا بے گل وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شبِ عہدہ - ہو بارِ عام اُنکے در پر مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غیم دل نے رسوا کیا ہم کو آخر بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہو اس لیش پر رسم کیا خوب کھلتا ذرا دیکھنا شیخ فانی کی صورت

یقین ہے کہ ہم جو سمجھے ہیں مڑا یہی ہو تو ہوں زندگانی کی صورت

سمجھ کر قاتلِ حالی کو دیکھو

مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ط

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

سچ رہی ہے کان میں یہاں لے دی اور مُغنی نے کئی بدلے ہیں ٹھٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت آؤ دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہ گئی راج کسے کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں ہے مگر بچیاں جی کچھ اسے زہا اُچاٹ

جہاں تنہا رہا پر وہ بول اٹھے مری میں فدا کی کم تماشائی بہت
 ہمنے ہر اونٹ کو اعلیٰ کر دیا خاکساری اپنی کام آئی بہت
 کرو یا چپے اوقات دہرنے تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
 گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت
 ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ ہو
 رہت گئی میں ہے رسوائی بہت

اُکے جلتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہی نہ در کی صورت
 کس سے پہچان و قاباندہ رہی ہے ٹیل کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
 ہو غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل ہو گئی اور نہ کچھ شام و سحر کی صورت
 اپنی جیبوں سے میں سارے نمازی ہشیار اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں حضر کی صورت
 دیکھئے شیخ مصور سے کچھ یا نہ کچھ صورت۔ اور آپ سے عجیب بشر کی صورت
 و عظماء اشرف و ذرخ سے جہاں کو تہنہ یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے در کی صورت
 کیا خبر زنا بد قلع کو کہ کیا چیز ہے حرص اُسے دیکھی ہی نہیں کیسے زر کی صورت
 میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر اڑے آئی مرے۔ تسلیم سپر کی صورت
 شوق میں اُسکے مزا۔ درو میں اُسکے لذت ناصحوا اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
 حملہ اپنے پہ بھی اک بعد نہریت ہو ضرور رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت
 رہناؤں کے ہوتے جاتے ہیں احسان خطا راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

پ

یہ ہیں واعظ سب پہ نمونہ آتے ہیں آپ
 ناصح قوم اسپہ کہلاتے ہیں آپ
 بس بہت طعن و ملامت کر چکے
 تینوں زباں رندوں کی کھلوتے ہیں آپ
 ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
 چڑھکے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ
 واعظ ہے اُن کو شرمنا گناہ
 جو گنہ سے اپنے شرارتے ہیں آپ
 کرتے ہیں ایک اک کی تکھیز آپ کیوں؟
 اسپہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ
 کرتے ہیں آباد و وزخ کو حضور
 خلد کو دیران کرواتے ہیں آپ
 چھیر کر واعظ کو حالی حسد سے
 بستر اکیوں اپنا پھسکوتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی تجسراتی بہت
 پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
 وزیر برقع تو نے کیا دکھ لادیا
 جمع ہیں سرو تماشاں بہت
 ہٹ پھٹکی آفریں جاتے ہیں دل
 راس ہی کچھ اُس کو غور آتی بہت
 سرو یا گل آنکھ میں بچھے نہیں
 دل پہ ہو نقش اُسکی رعنائی بہت
 چور تھا زخموں میں اور کتا تھا حُر
 رحمت اس تکلیف میں پائی بہت
 آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
 دوست یہاں تھوڑی ہیں اور بھائی بہت
 وصل کے ہو ہو کے سااں رو گئے
 مینہ نہ برسا اور گھٹا پھجائی بہت

جو کرینگے بھرنیگے خود۔ وعظ تم کو میری خطا سے کیا مطلب
 جنکے معبود عور و علماں ہیں انکو زاهد خا سے کیا مطلب
 کام ہے مردی سے انسان کی ۱ رُحدا یا اتقا سے کیا مطلب
 ہے اگر زند دامن آکو وہ ۲ ہمکو چون و چرا سے کیا مطلب
 صوفی شہر با صفا ہے اگر ۳ ہو۔ ہماری بلا سے کیا مطلب
 نگہتے پیش میں جو حالی
 انکو درد و صفا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہو اب چھیر ٹوٹہ تم کہ میرے بھی مونہ میں باں ہو اب
 وہ دن گئے کہ حوصلہ ضبط راز تھا چہرے اپنے شورش نہاں عیاں ہو اب
 جس دل کو قید ہستی دنیا سے ننگ تھا وہ دل ہے حلقہ زلف بتاں ہو اب
 آسنے لگا جب اُس کی تمنائیں کچھ مزا کہتے ہیں لوگ جان کا اسمیں یاں ہو اب
 لغزش نہو۔ بلا ہے حسینوں کا اتفات اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہر یاں ہو اب
 اک جرعہ شراب نے سب کچھ بھلا دیا ہم میں دراستانہ پیر میاں ہو اب
 ہو وقت نزع آور وہ آیا نہیں سنوز ہاں جذب دل مدد کہ دم ہمتاں ہو اب
 ہو دل غم جہاں سے سبکدوش این لوں بر پڑتا سو جھٹکا کوئی بار گراں ہو اب

حالی تم اور ملازمت پیرے فروش
 وہ علم دیں کہ صر ہے وہ تقویٰ کہاں ہو اب

ٹپکتا ہے شہرِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل بہتلا ہو گیا

اے بیکھنا ہے زور دل بے قرار کا
 وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
 کیا عتبار زندگی متعار کا
 ملتا نہیں محل گلہ روزگار کا
 میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا
 سن لینگے وہ آمل شب انتظار کا
 ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
 پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا
 خانہ خراب خاطر الفتِ شہار کا

حالی بس اب یقین ہے کہ ولی کے ہورے

ہے ذرہ ذرہ مہر نرا اس دیار کا

ب

✓ وردِ دل کو دوا سے کیا مطلب کیمیا کو حلا سے کیا مطلب
چشمہ زندگی ہے۔ ذکرِ جمیل خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر ظیلِ بالِ ہما سے کیا مطلب

نے تند و ظریف حوصلہ اہل بزم تنگ
 رخصی ہیں ہم کہ دوست ہو دشمنی۔ مگر
 کیوں چھڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا راسخے
 بگڑیں نہ بات بات پر کیوں جاتے ہیں و
 ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصہ خیر پر
 مقصود اپنا کچھ نہ ملے لیکن سہتر
 ساقی سے جام بھر کر پلایا نہ جائے گا
 دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
 پوچھینگے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
 ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
 کس کس سے احتلاط بڑھایا نہ جائے گا
 یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی رہیں آپ

قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

عشق آورد دل میں بسوا ہو گیا
 دکھانا پڑیگا مجھے رخم دل
 سبب ہو نہ لب پہ آنا ضرور
 وہ اُمید کیا جس کی ہوا نہ تھا
 ہوا رکھتے رکھتے دم آخر فنا
 نہیں بھولتا اسکی نصبت کا وقت
 سماں کل کارہ کہ آتا ہے یا
 سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا
 نہ دے میری اُمید مجکو جواب
 دلا سا تمھارا بلا ہو گیا
 اگر تیرا اس کا خطا ہو گیا
 میرا شکر اس کا گلا ہو گیا
 وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
 مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
 وہ رورو کے ملنا بلا ہو گیا
 ابھی کیا تھا اور کیا ہے کیا ہو گیا
 وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا
 رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

محبِ غزبِ بہت ہیں لیکن اذن ہم کو نہیں گویا ئی کا
ہوں گے حالی سے بہت آواز
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

(اغماض چلتے وقت مُرت سے دور تھا رو رو کے ہکو آواز رُٹا نا ضرور تھا
تھی نہ نظر نہ محرم دیدار ورنہ بھال ہر خار خنیلِ امین و ہر سنگ طور تھا
درد اکہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز چرچا ہمارے عشق کا نزدیک دور تھا
جانی نہ قدرِ حُرستِ حق پار سانسے کچھ ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا
وُردی کشانِ بزمِ مُغال کا نہ پوچھ حال ایک ایک زند نشہ وحدت میں چور تھا
اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا
روز و روع بھی شبِ ہجر اس سے کم نہ تھا کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا
سپار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ سہر بہر نمازِ غش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ ایک کا کہ آنا ضرور تھا

دل سے خیالِ وست بھلایا نہ جائے گا سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تکو ہزار شہم سہی مجھ کو لاکھ ضبطِ الفتِ مہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
انے لُضائے غیرِ شوِ شرطِ رضائی و سوت زہارِ بارِ عشق اٹھایا نہ جاسے گا
دیکھی ہیں ایسی اُن کی بہت مہربانیاں اب ہم سے موندے میں موت کے جایا نہ جائے گا

رات انکوبات بات پہ سو سوئیے جو اب مج کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
 رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ پچھا طعن قریب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
 تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک لیں جھپٹے گئی مانا کہ اُسکے ماتھے میں تیر و سناں نہ تھا

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہ سار

شب انجن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا وقت پُنجامری رُسوائی کا
 عمر شاید نہ کرے آج وفا کا ٹٹا ہے شب تنہائی کا
 تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
 ایک دن راہ پہ جا پُنجے ہم شوق تھا باد یہ پیمائی کا
 اُس سے نادان ہی بن کر لیئے کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
 سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
 دریاں پائے نظر ہے جہتک ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا
 کچھ تو ہے قدر تماشائی کی ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
 اُسکو چھوڑا تو ہر لیسکن لے ل مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا
 بزم دشمن میں نہ جی سے اُترا پوچھنا کیا تری زیبائی کا
 یہی انجام تھا اسے فصل خزاں گل و بلبل کی شناسائی کا
 مدد اسے جائزہ توفیق کہ یہاں ہو چکا کام تو انائی کا

(ق)

خلوت میں تری صوفی گز نور صفا ہوتا تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا
 تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کمانداری ہم بچکے کہاں جاتے گرتیر خطا ہوتا
 کچھ اپنی حقیقت کی گرتجھ کو خبر ہوتی میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا
 یہ لطف بناوٹ میں دیکھانہ سنا قاصد اُن پڑھ تو ہے تو یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا
 باتوں میں شکایت کی بولائی ہو الفت کی گردل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا
 ہم روزِ وداع اُس سے ہنس نہیں کئے ہو خست روزِ تماہت ہکھو روتے بھی تو کیا ہوتا
 گر صاحبِ دل ہوتے سُن کر مری بیتابی تم کو بھی قلع ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا
 جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھ کو خبرِ ناصح کچھ ہمسے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا
 جو جان سے درگزرے وہ چاہی سو کر گزرے اگر آج نہ تم آتے کیا جانے کیا ہوتا

گلِ حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ

سننے ہی قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

(ق)

پیش از ظہورِ عشق کی کانٹاں نہ تھا تھا خن میں نہ زبان کوئی میہاں نہ تھا
 ہم کو بہار میں بھی سب گلستاں نہ تھا یعنی خزاں سے پہلے ہی دلِ شادمان نہ تھا
 ملتے ہی اُنکے جھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا
 کیا جانتے تھے جائیگا جی ایک نگاہ میں تھی دل کی احتیاط مگر ہم جاں نہ تھا
 سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہی تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
 کچھ میری بنجودی سے تمہارا زیاں نہیں تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
عشق اُس وقت سے سر پر مٹا لاتا تھا
لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہو وہ
بار ما دیکھ چکے تیرے فریب دُنیا
کرتے کیا پیتے اگر نہ عشا سے تا صبح
دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غم عشق
اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ ہی ہے شاید

اب تو تکفیر سے وعظ نہیں مٹتا حالی

کہتے پہلے سے تو دے لیکے بٹایا جاتا

رحمت کا جہاں میں یونہی اک نام ہو گیا
کچھ کرتے ہیں جو بھیاں ہی گشت نما ہیں
بدنام ہی دُنیا میں نکو نام ہے گویا
ناچیز ہیں ہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام میں اُن کا یہی انعام ہے گویا
ہے وقت حیل و رمہی عشرت کے میں ماں
آخر ہوئی رات اور ابھی بچاں شام ہے گویا
آغاز ہی الفت کا بس خبام ہے گویا
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا
کرنائے سے باقی یہی اک کام ہے گویا
جب دیکھئے حالی کو پڑ پائے بیکار

مشکلوں کی جھکوتے حالی خبر
مشکلیں آسان ہی فرمائے گا

وہاں اگر جائیں تو لیکر جائیں کیا
دل میں ہے باقی وہی حرصِ گناہ
پھر کیے سے اپنے ہم پچائیں کیا
اُس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا
ایسے وحشی کو کہیں بہلا میں کیا
کھیلِ قُدرت کے تجھے دکھلائیں کیا
مرحلے اب دیکھتے پیش آئیں کیا
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا
اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا
مان لیجے شیخ جو دعویٰ کرے

ہو چکے حالی غمِ بخوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
کر دیا اُس نے تو ایشہ سے غافل - چچا
اُس کو کیوں جھوٹے گمراہ کو جھلایا جاتا
مالِ ہنگامِ نظر آتا تو چمکایا جاتا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا
دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے

سخن پیر ہیں اپنے رونا پڑے گا یہ دفتر کسیدن ڈبونا پڑے گا
 عزیز و کہاں تک یہ آتش مزاجی تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا
 ریا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی بسا بے ل سے شکوہ و نکودھونا پڑے گا ✓
 بن آئے گی ہرگز نہ بچاں کچھ کیتے بن جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوتے تم نہ سید صحوالی میں حالی

مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کبتک اے ابر کرم تر سائے گا مینہ بھی حرمت کا کبھی برسائے گا
 پھل کچھ لے نکل وفا تجھ میں نہیں جو لگائے گا تجھے سچائے گا
 دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام آج اگر آیا نہیں کل آئے گا
 ذوق سب جاتے رہی جز ذوق درد اک یہ لپکا دیکھئے کب جائے گا
 واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے ^{قطہ} پر مزا آنے کا بیخان کیا پائے گا
 آئے گا اور ہمو شرمائے گا منفیت اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
 عیب سے خالی نہ دغ خط ہے نہ ہم ہم پہ ہونہ آئے گا موندہ کی کھلے گا
 دل کے تیور ہی کہہ دیتے تھر صاف رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا
 باغ و صحرا میں ہے جوتنگ دل جی قفس میں اسکا کیا گھبرائے گا
 رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا ^{قطہ} شجہ تازہ کوئی دکھلائے گا
 ابرو برق آئے ہیں و نو ساتھ ساتھ ^۲ دیکھئے بڑے گایا برسائے گا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے عالی مگر

نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

کہیں الہام متھو نا پڑے گا ۱ کہیں کشف اپنا جلا نا پڑے گا

ہر صوفی صفا کو تجھ میں لے لیں ۲ کرشمہ کوئی دکھلا نا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہی گرنہ ہو درد یہ گر ناصح کو بتلا نا پڑے گا

جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا انھیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہونگا جنھیں مٹونہ انھیں خاصوں پر مٹونہ آنا پڑے گا

رہو صوفِ جہاں کی مشق و اعظ تمھیں سچوں کو پھسلا نا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی انھیں باتوں کو دہرا نا پڑے گا

تعلق کا ہے پھندا پتچ در پتچ ۱ یہ عقدہ ہموں کو سلجھانا پڑے گا

بہت یہاں ٹھوکر کھاتی ہیں ہنر ۲ بس اب دنیا کو ٹھکرا نا پڑے گا

نہیں بو آس کی اس غمگینو میں ۳ کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا

دلِ صحبت سے کوسوں بھاگتا ہی ۴ ہمیں یاروں سے شرمنا پڑے گا

زمانہ کر رہا ہے قطع پیوندہ وفا سے ہم کو بچنا پڑے گا

جو منصوبے ہیں چالی تو شاید ۵ ارادہ فتح فرمانا پڑے گا

بشر پہلو میں دل کھتا ہی جب تک

اُسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

تھا ہوش یاد گل کا دور خزان میں کسکو
لے عندلیبِ نالائ یہ تو نے گل کھلایا
ویراں ہے بلغ تیسر پھولی نہیں سمائی
مردہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا
اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بت بنایا
ڈرتے رہینگے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اُسکا جسے ناحق ہمیں ستایا
وہ خط کی جھوٹوں سے قائل تو ہو گئے ہم
کوئی جواب شافی پر کس سے بن نہ آیا
آیا نہ تھا کبھی بھیاں گویا قدم خزان کا
دو دن میں یوں پلٹ دی کسے چمن کی کایا
تقلیدِ قوم ہی پر گرے مدارِ تحسین
تو ہمیں دوستوں کی تحسین سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظم میں حالی چچا نہ اپنی

جو جو گماں تھے ہمو اُن کا نشان نہ پایا

نفسِ دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اُترے جی سے دل اکٹرایا کرتا رہا
حق نے حسانِ مین کی اور میں نے کھڑاں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چور یوں سے دیدہ و دل کی نہ شرایا کبھی
چھکے چھکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا
طاغیوں کی زدِ سبج بچ کر چلا راہِ خطا
واراں کا اسیلے اکثر خطا کرتا رہا
نفس میں جو نار و آغوش ہوئی پیدا کبھی
اُسکو چیلے دل سے گھر گھر کر داکرتا رہا
سو نہ نہ دیکھیں دستِ پھریرا اگر خانیں کہ میں
اُسے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھانہ استحقاقِ تحسین پر سنی تحسین سدا
حق ہے جو دوں بہتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں
کبرِ نفس اتنا ہی بھیاں نشو و نما کرتا رہا

زمانہ کی خوش بخت چینی کچھ اس کی پرانہ کیجے گا

کمال ہے ضدِ بے کمالی نہیں ملاپ نہیں حرفِ گیترا
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجے گا تو آپ بے جا نہ کیجے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگِ زائد نہ درِ وافت کی آگِ زائد
پھر اور کیا کیجے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجے گا

تمہارا اتحاد و ستارِ حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو

سلوک اُس سے کیئے یہ تمنے تو ہر سے کیا کیا نہ کیجے گا

آنا ہی دورِ ہی سے ہو کہ نظرِ گھر اپنا

جستِ نیکی دل کی کھلا کے جو ہر اپنا

فضل و نہر کا ہو گا جب چاکِ محضر اپنا

ایسوں ہی سے نبھا ہے یارا نہ اکثر اپنا

گڑبھٹے اپنے ہاتھوں ہم چاکِ محضر اپنا

یہ بیاضاعت اپنی اور یہ ہر وقت اپنا

ہو غمِ فیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا

قیدِ خرد میں تے آتے نہیں نظرِ ہم

پیرِ نیاں سے ہو کر تب سرِ خرد ملینگے

بیگانہ دش ہو کر وہ تو ہر ہمارے ڈھب کا

عصمت اپنی تھی خودِ قدرتِ گواہ اپنی

کچھ کذبِ اقترا ہے کچھ کذبِ حقِ نمای

غیرِ دل کو لینگے آخر اپنا بنا کے کیا ہم

اپنوں ہی سے ہر حالی کچھ دل نکد اپنا

یہ تو بتا میں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

خوابِ گراں سے تو نے ناحق نہیں جگایا

معنی کا تے حالی دریا اگر بہایا

اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہو گیا جب آخر

یار بطلب وصل ہو یا ہو طرب وصل جس دن کہ یہ دونوں وہ دن نہ کھانا
 دنیا کی حقیقت نہیں جز حشر و حرام چھل بل میں تم اس زال فسو نگر کی نہ آنا
 افسوس کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی تھا آب بقا گھس میں مگر ہم نے نہ جانا
 یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا
 دنیا میں اگر ہے بھی فرغت کا کوئی دن وہ دن ہے کہ جسدن ہوا سے چھوٹے جانا
 لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمتے بندھی ہی

حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

جاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجئے گار

یہ بھیید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا
 ہولاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اس کو غیر برگز

جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجئے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہر طریقت میں کفر و دعویٰ

یہ کہندو۔ دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ کیجئے گا

اسی میں ہے خیر حضرت دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو

کرے وہ یاد۔ اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجئے گا

کہے اگر کوئی تم کو وعظا کہ کہتے کچھ اور کہتے کچھ ہو

روزانہو کا حالی شاید یہ کم تھا را
 جب دیکھو آنسوؤں نے اس پر غم تھا را
 الفت میں بدم کچھ لذت ہی بڑھتی جا
 چھٹیکہ کھا کے شاید عاشق کو غم تھا را
 عاقل میں شہر میں کم نادان بہت ہیں ا
 ہر صحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تھا را
 و بچو نہیں کوئی بھیاں حیفائے صنم پرستو
 لکش بہت تھا ورنہ بیتِ اصنم تھا را
 گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گم
 اپنی نظر میں ہر گاہ گورن کم تھا را
 وشتِ طلب کے رستو ہو گے سطحِ تم
 آتا نہیں سچ میں کچھ سچ و غم تھا را
 دو مینو آؤ نکو بھی کچھ جم کے جانشینو
 بس خامِ جم ہمارا اور ملکِ جم تھا را
 دیکھا ہی نہیںے برسوں لطفِ ذکرِ تم تھا را
 روسی ہوں یا تیری ہجو ستائیکے کیا
 احسان یہ نہ ہرگز بھوئیے لینگے ہم تھا را
 بھولی ہیں تم نے آنکھیں سے حادثہ ہمار
 ہر لاکھ لاکھ سن کا ایک اک قدم تھا را
 ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیے سو
 گنہ ابھی ہی بھیاں سے خیلِ حشم تھا را
 رستے میں گرنے بھرتے تو تم بھی جا لو گے
 گم ہی تمہیں میں یا رباعِ ارم تھا را
 پھر تیرا دھڑا دھڑا ہو کسی تلاش میں تم
 جلو و رقم تو مانیں ہر دل سے تم کو حالی
 کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ سلم تھا را

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو میں تو نا
 پنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زما نا
 خود ہر وطن سے ہر دواعی کے سفر میں
 جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا
 دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
 گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

عقل و خرد نے تجھے کچھ چپقلش کہاں کی عقل حوسہ دکا تو نے خاک اُڑا کے چھوڑا
 علم و ادب ہے ہیں دُبنے ترے ہمیشہ ہر معرکہ میں تو نے اُن کو دِلا کے چھوڑا
 افسانہ تیرا رنگیں رو داو تیری دلکش شعرو سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اِک بستر سے تیری حالی بچا ہوا تھا

اُسکے بھی دل پہ آخر چہرہ کا لگا کے چھوڑا

دیکھ لے اُمید کیجھ ہم سے نہ تو کنارا تیرا ہی رہ گیا ہے لے دیئے اک سہارا
 یوں بے سبب زمانہ پھر تا نہیں کسی سے اے آسمان کچھ ہمیں تیرا بھی ہے اشارا
 میخانہ کی خرابی جی دیکھ کر بھڑایا مدت کے بعد کل وہاں جانکلے تھے قصدا
 اِک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہو اے زاہد و تمہارا ہے ہمیں کیا اجارا
 دنیا کے خرخوشوں سے حج اُٹھے تھے ہم اول آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
 توفیق نے ہمیشہ لی ثنّتِ چربہ میاں جب ناوڈ لگائی پاس آگیا کنارا
 انصاف سے جو دیکھا نکلے عیب سارے جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
 افسوس سہل دیں بھی نہ سہل دنیا خود کام و خود نما ہیں خود ہیں اور خود آرا
 اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر اسلام ہے فقیہ ہوا مومنوں بہت تمہارا
 کیا پوچھتے ہو کیونکر سب کچھ تھیں ہو چُپ سب کچھ کہا اُنھوں نے پرہنے دم نہ مارا

خالی سے کام ہو بچاں فعلو نے اُسکے کیا کام

اچھا ہے یا بُرا ہے پھر یا رہے ہمارا

اُسٹھے بہت مدعی جیسے کہ ساون میں گھانسن
مزلہ چپد روز پاتی ہے نشو و نما
غیرت حق نے مگر جلد لیا انتقام
مل گئے اٹھ اٹھ کے سب خاک میں ایل
راہ گیا نامِ شجاع کذب میں ضربِ لاشل
اسود و ابن کثیر غوار ہوئے بر سلا
سلسلہ آبِ یاسم نہ ہوتا اگر
حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا
آتے ہی چشمہ دیا تو نے کوئیں نکال
جس کو چلے آتے تھے کھوٹے سب انبیا
بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملت بیضا خدا

تجہ پر صلوٰۃ و سلام رہتا ہوا ہے

روز و شب و صبح و شام قدرِ مال دھن

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا
اُتار تجھے ترساں احرار تجھے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اُس کو گرا کے چھوڑا
راہوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے
گردن کشوں کو کشتِ نیا دکھا کے چھوڑا
کیا ستموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ
جو گنج تو نے تاکا اُس کو ٹٹا کے چھوڑا
جس ہر گز میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر
صنعاں سے رست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا
فرما کر کون کی لی تو نے جان شیریں
اوقیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
یعقوب سے بے شر کو دی تو نے ناصبوی
یوسف سے پار سا پر بہتان لگا کے چھوڑا
لاگ اور لگاؤ دو نو میں دلگداز تیرے
چتر کے دل تھے جن کے انکو مڑا کے چھوڑا

8۔ تاج - ایک عورت پر عین نبوت کا نام ہے جس کا کذب عرب میں ضربِ لاشل ہے چنانچہ کہتے ہیں ہواکن بہمن سے ہم اور
عربی اور یہ کہ کثرتِ ابن کثیر ہے یہ دونوں بھی مدعی نبوت تھے چنانچہ کا قتل کر کے گئے تھے

دعویٰ روشن ترا ثابت بے نسبتند
 قال ترا اور حال نشہ وحسد میں چور
 غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب
 اٹھا اپہیت کو تو عین ضرورت کی وقت
 شان رسالت کی تھی تیری جہیں سے عیاں
 گلہ نبی سعد کا جب کہ چڑاتا تھا تو
 دُور پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں
 رہا بے وقوفتیں و جبرہ گئے دل تھام کر
 خاک تھی جس ملک کی مزرع مشہور فساد
 تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
 چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھر بہت
 تو نے کیا سر حق عارف و عامی پناش
 چوٹ سے حق کی رما دل نہ اچھوتا کوئی
 حجت حق کر چکا دین ترا جب تمام
 دُور ہوئے پیراغ او حسد کات یہود
 بچھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بتکدے

صورت و سیرت تری صدق پر پیرے گوا
 اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا
 دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما
 جیسے کہ ہنگام خطا قبلہ سے اٹھے گھٹا
 گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی خدا
 گلہ آدم تجھے سوئے چکی تھی قضا
 اُتبیوں کے جب بڑی کان میں تیری صدا
 دیکھ کے تیرا قدم ہم قدم نبیسا
 تو نے اُسکیو دیا ارض مقدس بنا
 جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا
 تو نے کیا دام دام قرض سب اُن کا ادا
 ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا
 ایک کے چپکے لگا ایک کو گھائل کیا
 پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جا
 شرک ہوا مضمحل اور کُمانت ہبسا
 ہو گئی تثلیث ماث اور ثنویت فنا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بیکار تجھ کو پایا کبھی نہ سرد گرم کار دیکھا

پر وہ ہوا لاکھ کیس نہ شمر و زید کا	چھپتا نہیں جلال تمہارے شہب کا
مضمون ہو نقش دل میں لائینا سزید کا	کونین سے پھر گناہ دامن سب کا
قتل درمراو سب اکبا کھل گئے	چھوڑا جب آرزو نے بھر و کلید کا
دیکھا ہی تھے عالمِ حمت کو غور سے	ہوشِ حبت میں قحطِ دل نا امید کا
شرمِ کرم کی میں بھی گر پردہ واریاں	انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا
ہو زربانِ جذبہ توفیق درمیاں	یچال استیا کیا ہو قریب بعید کا
ہو آسمان پہ تیرے جگر خوار کا داغ	خونِ بگر میں نشہ ہو جانم بید کا
تسکین نہیں شاہدِ گاہ گاہ سے	یارِ بید روزہ دار ہو شتاقِ عید کا
دورِ رخ ہے گردِ وسیع تو حمت وسیع تر	لا تقنطوا جواب ہو ہلّ عزّیز کا

حالی کی میں اگر ہی شیوا بیایاں

لیگانہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکی اصفات یا بشری القوائے فیک دلیل علی انکاب
تجھے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ بارائے خاک خلقتک خضب الزمان بجا

8: "لَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ لَدُنَّا وَ لَدُنَّا نَبَأٌ رَئِيسٌ" یعنی اہلِ امت کے لیے جنت میں جو کچھ چاہیے سب کچھ ہوگا اور اس کے
پس کچھ اور بھی ہے

نہ ٹہل و گل میں وہاں تعلق نہ سروسر میں پیار دیکھا
 سوار محمل کی جستجو میں ہزاروں دشت طلب میں دوڑے
 نہ محمل آیا نظر نہ ناتہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا
 جولاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھسا بھی قسمت سے بھید پڑا
 بلانا نہ کھوج اُس کا پھر کیوں ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا
 لگن میں تیری نکل گئے جو نہ بچھکے دریائے پر خطر سے
 گئے وہ کو دانچہ بند کر کے نہ وارد کھجنا نہ پار دیکھا
 بچو ہوئے کاہشوں سے یہاں کئی ہی ہیں جوتیرے ہو رہے ہیں
 وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا
 چمن میں بجے لے سبے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
 گل انکی نظروں میں چھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں غار دیکھا
 خبر نہیں یہ کہ کیا ہے کیسا ہے۔ کون ہے۔ اور تو کہاں ہے
 پاپنے میں اور تجھے میں پہننے علاقہ اک استوار دیکھا
 لو کہ نہیں تیرے سب کے یکساں وہ گہر و ترساہول مایساں
 نہ اُنے کچھ تیرا تیرا پانا نہ اُنے کچھ تیرا پیار دیکھا
 سہر بھی دہکتا تو نے تیغ بھی دی گر دیتے ماتھ باندہ سب کے
 جھنیں تھا یہاں خستیاں سب کچھ اُنھیں بھی بے خستیاں دیکھا

کامل ہے جوازل سے وہ ہے کمال تیرا
 باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
 ہے عارفوں کو حیرت اور سبکدوش کو
 ہر دل پہ چھارے ہے رعبِ جمال تیرا
 کاوش میں ہے آگہی دگدہا میں ہی طبعی
 چھوٹے ہوتے ہیں گوجی۔ پڑل بندھو ہیں
 اگر حکم تیرے لاکھوں پھاٹ لیتے رہیں
 لیکن ٹلانا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
 پھندا ہے تیرے کیونکر جانے کل کے کوئی
 آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
 آنکلی نظر میں شوکت جیتی نہیں کسی کی
 دل ہو کہ جان۔ تجھ سے کیونکر غور رکھتے
 دل ہو زوال سے دل اُس کا قوی زیادہ
 ہو پاس دوستوں کے تیری یہ نشانی
 بیگانگی میں حالی یہ رنگِ آشنائی
 سن سن کے سروشنیکے قال اہل حال تیرا
 رشتہ میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزاح و شگوار دیکھا
 نہ اس سفر میں ٹکان دیکھی نہ اس نشے میں خم و دیکھا
 نہ جی اُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
 رہے سدا نامراد جو بھیاں اُنھیں بھی آسِ دوار دیکھا
 سُنِجِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ اس روز جس چمن میں

یہ تو کہتے ہو کہ انجام بُرا ہے۔ لیکن
 یہ بتاؤ کہ بُرا ہوتا ہے کیا۔ انجام؟
 بُرے انجام سے جب کہ پُرگیا خود کام
 گو کہ رکھتے ہیں یقین موت کا سب بختمِ خام
 مرنے والے ہی کو ہر موت کی لذت معلوم
 قوم کی پاسداری

اک سلمان خاص انگیزیوں پتھائیوں تختِ چین
 چاہتے ہیں۔ نفع نہ چھپنے اپنے اہل ملک کو
 کا خانہ کا یہ رحس کے کبھی چاکو نہ لیں
 غور و فیچہ میں جو بھانسنے لینی پڑتی پڑھیں
 الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
 سُن کے حالی نے کہا۔ ہو حصر انگیزیوں کیا
 میں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کو
 کھینچاں جیسی تنگ جاتے ہیں پاسِ قوم میں
 ہاں بیری اس عیب سے دیکھیں ہر نہادین سے
 اور قوموں سے انھیں لوگوں کو یہ ہمتیاز
 ہو گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو بچا
 پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
 گو کہ اُنکے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
 اُسکا ہو چہ پارہ ہندی بیچنے والا اگر
 اُنکو لدن سے تنگائیں بس چلے اُنکا اگر
 جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر
 ایک سے ہو ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر
 یہ خصلت ہو کہ مجبور اس پر طبع بشر
 اچھے اچھے رہتا اور حق پسند اور داد گہر
 چشم بد و ترست مر حوم اسے جان پھر
 حمایہ کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
 جس قدر ہو اسے اپنی اور یگانوں کو خطر

ہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھنٹوں کا وقت
 فوج ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں مختلف
 انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب کے زیادہ موردِ آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
 دو میں اُنہیں سے نہایت جانگزا
 ایک فکر اُس آنے والے وقت کی
 شک نہیں ہے جسکے آنے میں ذرا
 دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی
 زخمِ جن کا جسم ہے تلوار کا
 اور بھی حیوانِ ناطق کے لیتے
 ہیں بہت سی رحمتیں اُنکے سوا
 پر گدھے اور اور حیوانات سب
 رہتے ہیں دور۔ ان گزند و نسے سدا
 کیسا انِ آلام سے رہتا نچنت
 اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا
 چند و بازی کا انجام

ایک متولے سے چند ٹوکے وہ تھا ہونے جب
 پوچھا صاحب نے کہ اس کام کا آخر انجام؟
 بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
 زندگانی کو و دواع اور جوانی کو سلام
 آنکھ میں اپنے پرانے کی ٹھہرنابے قدر
 شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام
 جس سے عقبی ہو درست ایسا نہ بنا کوئی بیج
 جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام
 ہم پر آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
 نفس کش کے مگر ماتھے میں ہے اپنی نام
 کہا صاحب نے کہ انجام ہو معلوم اگر
 نے نہ اس نہ پہلا بل کا کوئی بھول کے نام

گو آدمی کا حلقہ کیسا ہی ہو قوی
پر بھول چوک ہے بشریت کا تقضا
ہوتا ہے اُس سے کار نمایاں کوئی اگر
لڑتا ہے بار بار بیاں اُس کو بر ملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہتے
ہر بار اپنی بیج کا پیرا یہ اک جُدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُس کو یاد
یاروں سے میں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہتے
آخر بشر کا خاصہ ہے ہوا و ر خطا
فضول خرچی کا انجام

سے پہ راہ کے بیٹھا تھا اگلے طرف
جہاں سے ہو کے گذرتے تھے صبح خیر کہیں
ہر اک سے ایک دم مانگتا تھا بے کم و بیش
سخی ہوا میں کہ نمینک غریب ہو کہ آسیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولت مند
کہ جس کا ٹھکانا کوئی اسراف میں ہمیشہ غلط گیر
ہوا جو ایک دن اُس راہ سے گذرا اسکا
درم اک اُس نے بھی چاہا کہ کیجے نذر فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت
کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شغیر
پلوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار
کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اُلٹے اُلٹے رہے تو آپ کو بھی
ہماری طرح سے ہوتا ہے ایک رزق فقیر
سو وقت ہو یہی لینے کا خود بدولت
دکھائے دیکھتے پھر اسکے بعد کیا تقدیر

اختلاف مذہب فح نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اٹھ جائے لیل و شب سے
چو آتا ہو باہم اسل مذہب میں خلاف

نہیں کام کات کو اندازہ ہرگز جدھر ڈھل گئے۔ ہو رہی بس اُدھر کے
 جو گانے بجانے پہ آتی طبیعت تو چنچ اٹھے دودن میں ہمسائی گھر کے
 جو بحرے میں بٹھجو تو اٹھو نہ جب تک کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کے
 اگر پل پڑے چو سراور گنج پر تو فرصت ملے شاید اب تلوامر کے
 پڑ امرغ بازی کا لپس کا تو جانو کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگِ تر کے
 چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں ڈر گھر کے
 جو ہر دم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو کہ چھوڑینگے اب آپ دن کو بھر کے
 جو پینے پہ آو تو پی جاؤ اتنی میں پاتوں کے ہوشِ جسمین سر کے
 جو کھانا تو سجد جو پیا تو ات گت غرض یہ کہ سرکار میں پیٹ بھر کے
 طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموں کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدر سے ہوتا ہو ہر بشر کو لال کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صفا و کبار
 یہ صدر گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے تو اور بھی اُسے دیتا ہے افعالِ فشا
 یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طبیب ملول جو چل بسے کوئی اُنکے علاج میں بیمار
 وہ جانتے ہیں کہ ٹھپ جائیگی خطا ہم پر کیا ملال کا اپنے گرسجگہ ظہار
 اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

جنہوں نے آپ کو سب سمجھ لیا ہے بڑا بڑائی دیکھ نہیں سکے تغیر کی زہار
کام اچھا کرنا چاہتے نہ جلد

اُسے کی تاخیر نے جقدر اچھا کیا
کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
بلکہ میں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پچھتا کوئی نہیں
گلے میں مبرم

انگٹا تھا ماتھے پھیلائے دھاڑتھا کہیں
اک برہمن موتی کے سامنے باص نیاز
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں
آن نکلا بانو اک مانگٹا کھاتا اُدھر
تاکہ پوجے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہر کر شر مگیں
جی میں آیا چھپ کر قابل برہمن کو کرے
بانو ابولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ ہیں
موتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
ناحق اتنی التجا میں اُسکے آگے تو نے کیں
موتی کچھ تجھ کو دے گی اور نہ دے سکتی ہوؤ
دے۔ نہ دے وہ اس کچھ بڑا نہیں ہے پتیں
ہنسکے برہمن نے کہا ہے مانگٹا بندہ کا کام
ماتھے پھیلاتے ہیں لیکن پاؤ پھیلاتے نہیں
برہمن یہ تہہ ڈھنسی تم جیسے ڈھیلوں کی طرح
نہ عہد رالی

تم اے خود پرست طبیعت کے بندو ذرا وصف اپنے سنو کان دھو گے

خوشامد پر نہ اُن کی بھولنا تم وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت ✓
 کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت ✓
 تدبیر قیام سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہوسن توح وصال پاؤں جو جانے کے لیے تفسر قہ ڈالو
 اور عقل خلاف اسکے تھی یہ شہرہ فیتی یہ حرف سبک بھول کے مونہ سے نہ نکالو
 پر راتے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر مانو اسے۔ اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
 کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو۔ لیکن جو بات سبک ہو اسے مونہ سے نہ نکالو
 مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر مردوں کی حکومت میں ہو ملکوں کی بُری گت
 لیکن عجب خلاف اسکے۔ ہے عورت کا جہاں راج وصال ملک ہو سر سبز اور آباد رعیت
 فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار قبضہ میں ہو وصال عورتوں کے دولت و کنت
 اور سر یہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی سمجھو کہ ہے اُس ملک میں مردوں کی حکومت
 مغرور کی پہچان

غور زید کی کرتا ہے گز شکایت غم تو سمجھو۔ کرتا ہے اپنے غم و رکا اقرار

پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت
بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ طبیب بیمار کو کچھ اس سے سوال اُن کی ہے حاجت
عصمتِ بی بی از بے چادری

اے پیو آؤ ہنستے ہو کیا سُنجوں پتہ اخلاق میں کچھ اُن کے اگر آگیا بگاڑ
تم زو سے نفس کی جو بھی تک پکڑ ہوئے ہو جب تک کہ پڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
اسباب جو کج جمع ہیں منعم کے گرد و پیش گرم کوہوں نصیب تو دنیا کو دو آجاڑ
سچ کہاں ہے

دیکھ لو جا کے خزانوں میں کُتبِ خانوں کے دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
سچ کو تحریر میں پاؤ گے نہ تقریر میں سچ کہیں ہو تو وہ سینوں میں ہو انسانوں کے
اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ گارِ بگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہو وقتِ باز پرس اپنے ماتحتوں کے سرِ پتے ہیں تھوپ اپنی خطا
خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ کے جو لوگ تمہاری ہر دم اسے اربابِ دولت

پر جو سچ پوچھو۔ نہیں متانون میں جان کچھ مٹری کے جالے سے سوا
اُس میں بھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں اور ہلا سکتے تھیں کچھ دست و پا
پر اُسے دیتے ہیں توڑاک آن میں جو گت رکھتے ہیں ہاتھو نہیں دزا
حق میں کم زوروں کے ہو قانون وہ اور نظر میں درندوں کی ہولا

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شانزادہ اٹھارہ سال کا ہو تختِ پدر پر اُس کو منع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ اُن مقتنون نے عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی کہتے ہیں وہ عیثِ ہوت قانون یہ بنانا
نزدیک اُنکے گویا بر عزمِ عقل و دانش ہے کنگدُم سے آسان میٹم کو بس ملانا

حرص

اٹلے وعظ میں ہو کیکہ کلام و اعظ قدرِ قلیل ہے سب مال و سالِ نیا
گویا کہ حرص اُگی اس سے بچھی نہیں ہے جقدر فراہم پائل سکے مالِ نیا
اَمْر او عقل

جاتے ہیں اگر پاپس اسیروں کے خروید وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت

فرمایا کہ روتی کی جگہ بوتے اگر آؤں ہوتا نہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا
ماروں نہ سمجھا کہ بوتے خدا کی محکوم ہے جو میری رعایا و برپا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا اپنے کو خدا جس نے عالم کو بنایا
جو کھوں میں یوں اٹا مخلوق کو اپنی اک سفدہ ناکس کی بنا اسکو عایا
رشک

ظاہر مردوں کی طینت میں نہیں شک بقدر ہے طینت میں چہ بنا عورتوں کی جاگزین
ایک شہزادی کہ اکلاتی تھی جو باپ کی تخت شاہی پر ہوئی بعد از پدر نشین
سلطنت میں اُچی تھامردوں کو کلی اختیار عورتیں اس کی حکومت میں نہ تھیں
مرد ہی تھے اُسکے محرم مرد ہی اُسکے مشیر عورت کا پتا دربار میں اُسکے کہیں
تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے نیم تاکہ کوئی سوزن اُس پر نہ کر بیٹھے کہیں
مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں نفوس بات کی حُسن بیاں سے اُس نے دھی صورت بل
ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت مجھے ایسے نفرت کہ ہے مردوں کی صورت و نشین
قانون

کہتے ہیں ہندوستان پر فرض ماننا قانون کا بعد از خدا

متوکل کا تیر چڑیا پر ہو گیا اتفاق سے جو خطا
 ابن حمدوں ندیم تھا حاضر کی خلیفہ کی مع اور یہ کہا
 "وجن کو خلق خدا پہ شفقت ہو خوں بہانا نہیں رہ رکھتے روا
 جانہ سکتی تھی بچکے تیر سے وہ تو نے دی قصداً انکی جان بچا
 ابن حمدوں نے کی یہ دانائی کہ خوشامد سے یوں اُسے تھپکا
 دوز تھا ورنہ کیا خلیفہ سے ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
 جائے کج شک ابن حمدوں پر تیر کا اپنے امتحان کرتا
 ابن حمدوں کی جان گوجائی دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا
 رعیت پر نا اہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگاتا ہے جب اسکے فرعون کا تھا مصر ہی نے مفر چلایا
 وہ خطہ ملعون تھا یہی حکمی بدولت تھا دل میں خدائی کا خیال اُسکے سمایا
 میں بھی سے اُس باغی طاغی کے علی الرغم اک بندہ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
 کہتے ہیں حبیب ایک غلام حبشی تھا جس پر نہ پڑا تھا خود ہوش کا سایا
 کی سلطنت مصر کی باگ اُسکے حوالے نا اہل کے پنجب میں امانی کو پھنسایا
 باڑی گئی تہ ایک برس نیل کی رو میں یہ حادثہ آ اُسکو کسانوں نے سنایا

حالی نے کہا ”اُس ہی چیز اور وفا اور
 اُس مہر وفا کی نہیں بنی یہ پڑی چھینٹ
 ہم غم غم ہیں مکیوں پہ وہ عاشق ہو مکاں کی
 گھر دل پہ بیج یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
 ناصح مخلص و راصل غرض میں تین

منصور نے یہ جعفر صادق سے عرض کی
 کرتے رہیں گے آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
 فرمایا ”ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
 اور جسے ہے یہ نصیحت وہ بالیقین
 خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدام مامول کے بہت گستاخ تھے
 گوئی آقا حکیہ خوش حلاق ہوتا ہے بہت
 پر جھج پوچھو تو ہونا خادموں کا شوق چشم
 اکھو دیا ہیبت کو اپنی جنے اور تمکین کو
 ایک دن خادم کی گستاخی پر مامول نے کہا
 پیش خدمت اُسکے بد حلاق ہوتے ہیں سدا
 ہے دلیل اسکی کہ ہے خود خلق آقا کا بُرا
 اُسنے گویا ڈھا دیا رکن کیں حلاق کا
 خوشامد کرنے کی ضرورت

برکت اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جنیں ملاپ
دہ انھیں حاجت اعوان نہ تلاش نصیب
پر نہیں لڑے جس قوم میں اور کمبختی
نہ ملاؤ اُنکے لئے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
ایک ٹکانے میں ناجب یہ سخن نہ مایا
اتفاق اور اتفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
وصفاں نہ ملت کی ضرورت ہی نہ کچھ پھوٹکاؤ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
پر مجھے خوب ہو اللہ کی عادت معلوم
بُعدِ صوری مانعِ قرب معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لئے شہر میں اک گھر
جب اہل محلہ سے چلا ہو کے وہ خست
ہمایہ و حجاب لگے کرنے سب افسوس
بلی کہ جو بے عقل ہے دم دیتی ہے گھر پر
جا اپنے محلہ سے کہیں دور بنایا
دل و حُبِ دلی سے عزیزوں کا بھڑکایا
اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
اتنی بھی محبت تھیں گھر سے نہیں آیا؟

روئے عہد کی فیاضی

کی تیش شہر کی تعریف یاروں نے بہت
 بولے آج اُس کا نہیں مہاں نوانی میں نظیر
 خصلت کے حکام کا اودنے اشار چاہیے
 یادگارِ حبسِ بی ایمانِ دولت کی نہیں
 پاکلی یا بخت۔ جو سواری اُسکے پاس
 کیا کلکتر کیا کشنر کیا سپاہی کیا سن
 جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں بن تاہم
 عیب بھی اُسکے کوئی آہ نہ کرو یا رویاں
 بریںیل تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا
 عاملانِ شہر مدعو اُسکے رہتے ہیں سدا
 پھر کوئی دیکھے سخاوت اُس کی اور بخل و عطا
 انہیں صرف اُس کی رقم ہو سب کے چند سے
 اہلکاروں کے لیے ہی وقف ہے چون و چرا
 اُس کی ہمت کے میں سب مداح بے سود و ریا
 جوڑ کر ماتھ۔ اُنے حالی نے بصدنت کہا
 سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا نشانے لگا
 ایمان کی تعریف

فقیر نے ایمان کی جو کی تعریف
 کہا "فتیلہ اقرار باللسان جو ضرر
 تو دی چراغ سے اُسکو بہ آہ تاب مثال
 جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال
 نہیں و فرستیلہ کا جہیں احتمال
 کہا کسی نے کہ نکلا جو ان دونوں کی تیل

8 بیٹے کرو سنو آمل جو بغیر تیل کے بھی جل سکتا ہے۔ گویا عجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے ۱۲

یعنی کہ لاکھ پروں میں کوئی چھپاؤ عیب اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القسمہ جبکہ دیکھتے جاہل ہو یا کس ازار میں خودی کے ہی چارہ بستلا

حکمہ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفس دہل ہمارے میں ہو گر کبھی حکمہ پر اُسکے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھی کیاں تھیں نفس کی جن کو نادانی سے حملے اُسکے ٹھیراتے تھے ہم
جب کیا حکمہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال زور بازو پر ہمیشہ جکے اتراتے تھے ہم
جن قوم میں نسل اس ہو نہیں نخل تناید ناہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا جب کرتے ہو تم کرتے ہو سرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے۔ پر نخل سے کمتر ہی جس سے کہ انسان کو باطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا یاروں کے لیے ہے یہ بیان موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلفا سوقت جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تو نگر پھر نہیں نہیں نخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہی نہ ثروت ہی نہ اقبال گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا نسل فداک
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی پرواز کی ہے چو نیٹوں کو جیسے ہدایت

جو اُن سے تیر بوش میں سو سو طرحے
 کہتا ہوا ایک کیسی حماقت ہوتی ہے آج
 کہتا ہوا دو پہر کہ گیا ہو کے منفعل
 پردہ میں زیر کی کے چھپاتا ہے بخل یہ
 کچھ۔ ایسے کہ ہم بھی انھیں میں ہی ہوں شمار
 کچھ۔ ایسے کہ اپنا ہوں نصف آشکار
 کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے بڑا کوئی
 کہتا ہے ایک گڑھے خوشامد کا ادھی
 دھوکا ہنر کا دیکھے چھپاتا ہے عیب
 چُپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
 کہتا ہے سپہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ
 قانع ہے وہ انھیں پہ پہ ہو کر وصف جو بیاں
 کہتا ہے زید عمر و شدت سے ساوہ لوح
 کہتا ہے عمر و زید بھی کہتا ہے عیب ہیں
 یہ اسکا اور وہ اسکا بیاں کر کے کوئی عیب
 غیبت۔ اُسید ہے کہ نہوتی جہان میں
 حالی جو پترے کھل ہی ہیں جہان کے
 پردوں میں کرتے ہیں یہی مضمون کو ادا
 کبھل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دیا
 سائل کئی ب میں نے دیا مال جب دکھا
 ادب کے بیوقوف جتنا ہے وہ سخا
 اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
 کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
 ہے عریض صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا
 پرچائے آدمی کو میں کہہ کہہ کے ہم بُرا
 اور مونہ سے دُرد لکے دکھاتا ہے وہ صفا
 یعنی کہ یہ بیان ہے سب رست اور بجا
 اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
 اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
 گنتا ہے سب کو نیک۔ اچھا ہو یا بُرا
 بد ہو کہ نیک۔ اسکی زباں سے نہیں بچا
 ہر اک ہی اپنی اپنی بڑائی نکالتا
 ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خود ستا
 شاید کہ اس سے آپ کا ہو گا یہ مدعا

کالے اور گورے کی صحت کا مدیکل امتحان

دو ملازم - ایک کالا اور گورا دو کھرا
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں راہ میں دو نو کے باہم ہو گئی کچھ پشت مش
صدمہ پہنچا جس سے بلی کو بہت مسکین کی
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
آخر ش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگزشت
دی سند گورے کو لکھ تھی جمیں نقدی مرض
یعنی اک کالا نہ جن گورے کے ٹکے سے مر
اور کہا کالے سے "مکمل نہیں سکتی سند
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مری جائے

دو سپر اسپیدل - مگر پہلا سوار راہوا
کیونکہ بیماری کی خصلت کے تھے دونوں سنگار
کو کھ میں کالے کی اک ٹکا دیا گورے نے مار
آ کے گھوڑے سے لیا سائیں نے اُسکو اُتار
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند با
ضیاب اپنے پاؤں اور ضرب ڈولی میں سوار
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و زار
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہ سار
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
آے بابا اُن کی بیماری کا کیونکہ عتبار

خود ستائی

اے دل بشروہ کوین جو خود ستائیں
پر خود ستائیوں کے ہیں عنوان جدا جدا
جو یور فرود سے مست ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی بر ملا

اگر زیراتنے اجنبیوں سے نہیں نفو
 جتنے کہ یہ عزیز غریبوں سے ہیں خفا
 اہل غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں
 شایستگی کا زہر ہے جب سے انہیں چڑھا
 اسراف

ایک شریف نے یہ مسکے کہا
 کب تک اے ناداں چپ مال دوز
 تو۔ جو یوں رکھتا ہے دولت جو بچر
 ہوسدا دنیا ہی میں رہنا مگر؟
 ہنکے مسکے کہا اے سادہ لوح
 زر ٹٹا نارنگاں اور سقد ر؟
 آج ہی گویا نصیب دشمنان
 آپ کا دنیا سے ہے غم سفر
 پاس نیک نامی

اے نیک نام شکر اللہ کا ادا
 جنے بنایا نیک تجھے کرنے نیک نام
 ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک
 پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
 حاشا کہ تجھ کو خوف خدا کا ہو قید
 جتنا کہ خوفِ طغی و تشنہ خاص عام
 غرور نیک نامی

گئی ہر حد سے گذر شیخ کی نیک نامی
 گمان بد کبھی اُس کی طرف نہیں جاتا
 جو اُسکے عیب قسم سے بیان کرے کوئی
 خود اُس کو عیب کا اپنے یقین نہیں آتا

لوگ جب عیب ہمارا کوئی سن پاتے ہیں
گو کہ کرتے ہیں تاسف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو سرج ان کو کمال
گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار
اور جو ہو گوش زد ان کے کوئی خوبی اپنی
خوش تو پڑتی ہے بنانی انھیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم اُنکے
کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زہار
نشد احمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا
نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ طیار
شاید لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب مال
انگریز کے سوانہ کسی سے تھا مانگتا
دستک اسی جب یہی دیکھی گئی روش
پوچھا کسی نے اُس سے کہ ہکا سب کیا
بولاکہ عادت اسیلے کی ہے یہ اختیار
چھٹ جائے تاکہ مجھے یہ بچکا سوال کا
پہلے جو بھاگو انوں سے ملتی تھی روز بھیک
آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب ہے سوال کا اس قوم پر مداء
منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا
امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لٹ
گر چند روز اور راہ ان سے سابقہ
آیا جواب سن کے یہ اُسکا بہت پسند
کی آفریں اور اُس سے مخاطب کیوں کہا
نقد ہیں جو کہ ملک میں تسلیم یافتہ
حق میں ترے مفید ہیں اُن سے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندوؤں کے حق میں ہیں بخیل
اہل وطن پر ان کی مگر جان ہر فردا
پر جو کہ دسیدوں میں ہیں تسلیم یافتہ
دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پیچھا

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا گھیر لی عقل صواب اندیش کی سب تو نے جا
 تنہ کے عادت نے کہا کیا عقل ہو مجھے لگا میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل درے
 شعر کو سلطنت میں وصل دنیا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہولے چاہیے گر رونقِ علم زباں
 شاعروں کو سلطنت کا کیجے ٹکرن جن پہ اسکی سب رکائیں ہیں عیاں
 رے صائب ہو بظاہر اور تیں گو کیا اس کا نہیں کچھ اتھاں
 شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ ہو بہت کم برخلاف اسکے گماں
 سلطنت کا چرخِ حافظ ہو جب شاعروں کے ہاتھ ہو اس کی غماں
 اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
 ایک پران میں سے چل سکتا نہیں دوسرے کا جادو ہے حسنِ بیاں
 ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں
 لوگ کسی کی خوبیاں سن کر اتنے خوش نہیں ہوتے
 جتنے کہ اُس کے عیب سن کر

اپنے عیبوں کے میں ہم جتنے کہ منوں حالی اُس قدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مالِ ندیشی
 ہو غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
 سو دے کچھ تجھ غربت نہ زیاں سے پرہیز
 نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
 نہ جوانی میں تجھے صبر نہ پیری میں شکیب
 کہیں جائے نہ بھٹک منزل مقصود سے تو
 ماتھے و صندوق لذتِ فانی سے نہیں گر منظور
 نفس نے عقل سے کی عرض کد و خضر طریق
 پر نہیں حکم ترا کوئی۔ عمل کے قابل
 نقد کو چھوڑنا اور نیہ کی رکھنی امید
 ہی یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا
 ایک بچھو کے سے کتا ہے کہے قابِ طعام
 کیونکہ امید پہ اک مادہ نعمت کی
 عقل نے سُن کے کہا خوف ہو تجھے ای نفس
 حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں طبلِ سرسبز
 جاں بلب بھوک سے ہو گر سنبہ بالفرض اگر
 نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھو یہ لقمہ نقد

دروہیں تیرے ہی واسطے سب دریاں
 جھکا آتا ہے نظر بیشتر از صبحِ زیاں
 تیرے نزدیک ہے در و اور دو آبِ یکساں
 یہ بھی ہے غنیمت کوئی۔ موت کا ہر چہ گماں
 کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں
 دیکھ۔ جاتا ہے کہ ہر اور تجھے جانا ہو کہاں
 عیشِ باقی و حیاتِ ابدی سے حراماں
 و غطر تیرے ہے زیبا کہ نہ دیکھے جاں
 گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سرا سر ہواں
 کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جسزنا داں
 سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جہرِ قرباں
 ایک مدعا سے کرتا ہے پس زناں داں
 سال بھر صبر کرے گر سنگی میں انساں
 جُربزہ تیرا تجھے دیکھے پس نچائے کہاں
 کیجئے لاکھ بیاں اُس پہ دلیل و برہاں
 زہرِ دانستہ کرے نوش۔ نہیں ہمکاں
 اسکے کھانے میں نہیں جاں کی خیر و ناواں

اول تو سوچتا ہی نہیں عیب دست کو
اور سوچتا ہے تو نہیں اتنا زبان پر
پراکب بار دشمن لگرو کچھ پائے عیب
سو سوطن سے وہ اسے کرتا ہوتا ہو اگر
دشمن سے بڑھکے کوئی نہیں آدھی دوست
منکدر اپنے حال کی احسان ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بگال
رکتا ہو جو کہ بہت کے عیب اس سے مستتر
گو قول ہوتین پہ جو تھی سخن کی تہ
افسوس جو حکیم کی پہنچی نہ دھماں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں سفید
عیب انکے دوست کیوں جتا لنگے خنجر
اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے انہو عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوتے ہرگز
جن کو خدانے جو ہر قابل دیا ہے بھال
موقوف غیبت انکی نہ دشمن نہ دوست پر

سخن ساری

ہے مرد سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کسی بند نہ اسکو
موجود سخن گوہوں جہاں صاں میں طیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو
دونوں سے کوئی نہ تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ میں جس وقت کہ موجود ہوں دونو
عقل و نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرسے خوار و زلیل
اپنے دعووں پہ بیاں کر کے دلیل و برہان

پھر دیکھنا کہ رس و چپ گرد و پیش سے لگتی ہے کیسی آگے زور و سیم کی جھڑی
دنیا طلب کو چاہیے اباہ فریب ہو دنیا پہ جب تک کہ مسلط ہو ابلی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے لے خدا پرست دل میں کہیں نشان نہیں تیرے یقین کا
جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں سو سے ہوتی نہیں قبول تیری ایک اگر دعا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست جس کا یقین ہو تیرے یقین سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مزادیں ہے عمر بھر گوجاہت اُس کی اُنے ہوئی ہے نہ ہو روا
اتما نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور امید اس کی روزنروں ہو اور تجبا
تو بندہ غرض ہے۔ وہ رخصتی ضیا پہ ہو وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندہ خدا

استفادہ

لیجئے بھیک دوڑ کر۔ گر پے گد اگری کا یہ جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور چلے
ہو یہی اصل کتاب۔ ہو چنے سے مستفید ترک ملے۔ یا سزا ملے۔ درس ملے۔ ادب ملے
لایق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے
فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہو کہ ”گر غور کیجئے ہو حق میں سب کے دوست و دشمن بغیر

ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد
 دو نو۔ نزدیک قربت میں ہوں باہر
 جیتے جی مر گئی بس اُن کی طرف سے گویا
 جا کے پردیس میں بی بی کو دیا بیاہ اگر
 چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کھیتا
 پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بڑ
 بد مزاجی ہو جمالت ہو۔ کہ ہو بد چلنی
 کچھ بُرائی نہیں۔ دو توتا ہو داماد اگر
 وہ یہی ناشدنی ریت ہو جس کے کار
 بکریاں بھٹیڑیں سے پانی ہیں پیوند کثر
 جاہلیت میں تو تھی اک ہی آفت کہ ماں
 گاڑو سیاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
 زندہ در گور سار تھے ہیں اوستہ جگر
 ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
 اپنا او بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں خجام
 جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر
 سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
 برسوں تا ملاش میں وجہ معاش کی
 وہ شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
 لیکن نہ اُس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
 اخبار بھی نکال کے سخت آزمائی کی
 تدبیر یہ بھی اُس کی نہ تقدیر سے چلی
 روزی کی خاطر اُس نے کیے سیکڑوں حقین
 پر کی کہیں نصیب ہے اُس کے نہ یادی
 راہ طلب ہیں جب ہوئی گشتگی بہت
 اک خضر بے خستہ نے آئے کئے بیری
 جھٹک کر کہا یہ کان میں اُس کے آج کل
 سنا ہوں چھپ ہی ہو تصانیف احمدی
 جا۔ اور لفظ لفظ کو اُس کے چھپ کر
 مزدور اس کی چھاپ کو جو ہوئے چلی

اُردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑ
 پنجاہ کو مس اُس سے نہ پورب نہ دکن کو
 ببل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
 کیا عالم گلشن کی خبر زراغ و زغن کو
 حالی کی زباں گریبش نہیں لبّی ہو
 خالص نہ تو کیجے کیا لے کے لبّی کو
 ہر خند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
 پہنچے گا نہ وہ نافہ آہوئے حستن کو
 مانا کہ ہے بے ساختہ پر اُس کے بیان میں
 کیا پھونکیئے اِس ساختہ بے ساختہ پن کو
 یہ دوست نے حالی کے سُنی جب کہ تعلق
 حق کہنے سے وہ رکھ نکا باز و ہن کو
 کچھ شعر تھے یاد اُنکے پڑھے اور یہ پوچھا
 کیوں صابو عزت اسی اُردو سے حرف کو
 سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں مگر کے ایسے
 کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
 حالی کو تو بد نام کیا اُس کے وطن نے
 پر آپ نے بد نام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب
 کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
 سنگدل باپ سے گود سے لیکر ماں کی
 گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں نہ جا کر
 رسم اب بھی ہی دنیا میں ہو جاری لیکن
 جو کہ اندھے ہیں ہی کے نہیں کچھ انگو خبر
 لوگ بیٹی کے لئے ڈھونڈتے ہیں جی پوٹ
 سب اہل انھیں ہوتا ہے یہ منظور نظر
 ایسے گھر یا بیٹے بیٹی کو جو ہو آسودہ
 اور وہ دھرم سے جو ذات میں ہو فضل تر
 جانے لگتے ہیں سارے سارے سارے مرد
 اُنکے معلوم ہوں عادت و خصلت کبیر

کہ نیش وہ جماعت ہے کم از کم
زباں جکی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہو
نہیں جو اسے میں اپنی مذبذبت
وہ نیش کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جہیں حد تین مفقود ہوں سب
زباں اس کی نہ ہو مفہوم اُس کو
ہوں آدم تک جد اس کے جد و آب
جو حد لا شریک اس کا خدا ہو
تو لا کھوں اُس کے ہوں محبوب و درت
صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گذرا کہیں مینے لکچھلا اک غلام
اُس کے تیلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُس کو کی
عرض کی "ایک اک رُواں ہو جس بدن کا ناغہ
اختیار اُس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی"
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں کھتے خیال
عذر تیلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونچہ جسم آدمی میں پیش اسل معترف
کوئی چیز اُس کی نہیں ہے امانت گور کی
دلی کی شاعری کا منزل

اک دور سے چالی کے کہا از روِ اُصفاف
کر تے ہیں پسند اجل زباں اُس کے سخن کو
چند ہل زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا
بولے کہ "نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہوا زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیب زباں اُس کے دہن کو
معلوم ہے۔ حالی کا ہے جو مولد و منشا
اُردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو

بے سز کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف
 حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
 پاتے تھے آقا کو وہ بہوتے تھے جب اُس سے ہوا
 تھی نہ جسے تنخواہ لو کر کے لینے کوئی فتوح
 رہتا تھا اک اک شرائط نامہ ہر لو کر کے پاس
 اگر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
 حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں
 وصال سوا تنخواہ کے۔ تھا جس کا آقا ذمہ دار
 دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
 ایک دن آقا تھا اک مُنہ زور گھوٹے پروا
 دفعۃً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
 کی بہت کوشش نہ چھوٹی پانوں سے لیکن کتاب
 تھا مگر سائیں ایسا سنگدل اور بے وفا
 دور ہی سے تھا اسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا

کام سے مُہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
 ذکر کیا۔ نکلے جو پھوٹے مُنہ سے اُس کے آفریں
 نکتے پھولے مُونہ چڑھا۔ ماتھے پہ بل بروہیں
 آکے ہو جاتے تھے خائف جو کہ ہوتے تھے میں
 فرض جمیں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعین
 زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے نگین
 تاکہ یہ درخواست۔ کچھیں اُچی ہے نہیں
 تھیں گرین جتنی وہ ساری نوکروں کے تھیں
 تھے گردہ سب کے سب آقا کے مارا ستیں
 تھک گئے جب نہ ور کرتے کرتے دستِ نازیں
 اور گر اسوار صبر ریزیں سے بالائے زمیں
 کی نظر میں کی جانب۔ کہ ہوا اگر تھیں
 دیکھتا تھا اور اُس سے من نہ ہوتا تھا العین
 دیکھ لو سکر اس میں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب

اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوشش جاگناہ
مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے۔ ورنہ ہزاروں پھرتے ہیں تجلج سادہ لوح تباہ
یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں بر خوردا وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ
آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا۔ حاصل جو آزادی نہیں قدرداں اُن سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سد محکوم رہتے آتے ہیں قدر آزادی کی جتنی چھو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا بینہ کو ہے زیادہ قدر دینا دردِ م
تعرّف الاشیاء بالاضداد ہے قول حکیم دیگا قیدی سے زیادہ کون آزادی پُر م
سُن کے ایک آزاد نے یہ لاف چٹکے سے کہا ہو سفر موری کے کیڑے کے لیئے باغِ م
انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں ”آزاد ہو جانا ہو جب لیتا ہوساں یہاں غلام اگر کرمت ہو یہاں انگلستان کی
اُس کی حرب میں غلاموں نے جو ہیں رکھ قدم اور گنگر پانوں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی
قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیسیا کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد یہاں آزاد رہ سکتا نہیں وہ رہے ہو کر غلام۔ اسکی ہوا جن کو لگی

8 یعنی چٹکے موری کے کیڑے کو موری ہی میں کرم نہ ہو اور دھانے کہیں جاننا نہیں چاہتے بلکہ جو تو ہیں وہی محکوم ہیں پانی کی بڑی، غلامی ہی غلامی ہے

قرض لیکر حج کو جانے کی ضرورت

قریب ہو مجھ جس قرض لیکے اک یوں اُ
 کہا یہ اُس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت
 کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
 نہ نان و نفقہ نہ زرد وزن سے خاطر جمع
 سنا یہ۔ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
 وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
 خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی
 جنھیں فراغت و تنگی میں ہو اُسی سے ہمد
 وہ سُن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
 ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں
 یہ سُن کے شیخ نے دیکھا اُدھر کہ کہیں
 بلا کے پاس پھر آہستہ اُس سے فرمایا
 قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کادوں کے
 خدا کے حکم ہیں بسنی تمام حکمت پر
 نماز و روزہ ہو۔ یا ہو طوافِ عمرہ و حج
 چلا بہ نیت حج۔ گھسے سوئے بیت اللہ
 کیا ہے آپ پہ شاعر نے جسیر یا اکراہ
 وطن میں چھوڑ کے طغفال کو بجاں تباہ
 نہ زاد و رجسہ کا ساز و برگ خاطر خواہ
 کہ رو کتابے سُلمیں کو حج سے اے گمراہ
 تنگین و خاتمِ طوبیٰ و نشان و تخت و کلاہ
 پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے بز و بحر کی رلہ
 جنھیں سلاست و آفت میں ہو اُسی کی پناہ
 اُمید لطف کی رکھنی ہے میسر باں سے گنا
 طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں غرتِ جاہ
 ہو مدعی نہ تجتس میں بچاں کوئی حمرہ
 ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ
 جو ان خام کی دھماں تک نہیں پہنچتی نگاہ
 فتوح جن میں ہو دنیا و دیں کی خاطر خواہ
 حصول جیسے کہ ہوتا ہے انے قبیر الہ

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زہد نے کہا ”زینت و سبب پہ جو اگل اترتے ہیں۔ اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے“
حالی نے کہا ”جنکو ہے اترنے سے نفرت اترائے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے“

سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
ہو مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود و قول
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہو اس حجت کو عام
بعض کہتے ہیں کہ ”شر سے تیرے سب ایریں
پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عبد الفول
ایسی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ
بعض کہتے ہیں شعار اسلام کی ہر لباس
بعض بتلاتے ہیں کچے اور بعض فرماتے ہیں کچے
نہیں منہ منہ ہے لیکن پیاں کرنا ضرور
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر

بعض کے نزدیک تو حید اس کی حد نام ہے
جو ہیں مثال سکے اپنی کف کا الزام ہے
جس سے غیر از اصل قبلہ جو ہے وہ کام ہے
بس مسلمانوں میں داری اس کا نام ہے
کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اسے وہ خام ہے
اور سب کا لفظ یا راغیا ر سب کے عام ہے
جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
حصہ کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے
جو سلم آج کل نزدیک خاص عام ہے
سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

اقوال مختلفہ میں سے جو عمل رائج ہو اس کو مذہب منہور کہتے ہیں *

اے بزم سفیرانِ دول کے سخن آرا
 ہر خرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہو
 یہ سچ ہے کہ جادو ہی بیاں میں ہے لیکز
 کچھ سربانی کا سری و ضنگ نیا ہو
 ظاہر ہے غصہ میں بیاں سے تری بخش
 نہ لطف میں کچھ طرز بیاں اُس سے جدا ہو
 ہو دلیں نہاں ایک شکایات کا طومار
 اولیٰ بچو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہو
 جو صبح کی باتیں ہیں وہیں شہدِ شیریں
 اور جنگ میں کچھ لطف سخن اُس سے سوا ہو
 گر سوچتے تو سیکڑوں پہلو میں مفر کے
 اور سینے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہو
 دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
 گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانے کیا ہو
 کھلتا نہیں کچھ اسکے سوا تیری بیاں سے
 اک مرغ ہے خوش اوجہ کہ کچھ بول رہا ہو
 تھے لب پہ اظہارِ پاب کے کھلا یہ
 انسان کو اخفا کے لیے نطق بلا ہو
 بدی کر کے نیک نامی کی توقع رکھنی

نامِ صفت و بے رحم اک ضلع کا حکم
 بڑا وہ سے نالاں تھی بہت جس کے عیت
 جب دورہ کو اٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر
 تھا پوچھتا ایک ایک سے ازرا و شرارت
 ہیں گنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیا
 کرتے ہیں ہماری وہ ستائش کہ مذمت
 تھی اُسکی مثال ایسی کہ اک شخص بد آواز
 جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
 گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے
 ہر بار لپکتا تھا بصد تیری و سرعت
 ہوتا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری
 آواز خوش آئند و یا قابلِ نفرت

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ علم تیرا کہاں میں اپنے تئیں
 واہ واسنتے سنتے یا ریل کی ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقتیں
 الغرض ایک روز صحر میں جب کہ تھے ساتھ سب جلیں و قرین
 مشق تیرا گئی میں تھا مصروف کر رہے تھے خوشامدی تمہیں
 آکے دیکھا جو اک ظیفہ نے حال وجہ تمہیں ہوئی نہ ذہن نشیں
 تیر جتنے کمان سے چھوٹے پائے سبے اصول بے آئیں
 جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا تیرا حاجگہ کے کوئی تیریں
 ایک جاتا تھا چھٹ کے سو شمال ایک جاتا تھا پھٹ کے سو وہیں
 کچھ جو شوخی ظریف کو سو بھی رکھکے بالائے طاق سب تسکین
 خاک تو دے پہ جا کے ہو بیٹھا لوگ کرتے رہے چٹاں و چنیں
 ناوک انداز بولا چلا کر کوئی تجھ کو جنوں ہواے مسکین
 یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے یا کہ دو بھر ہی تجھ کو جانِ حریفیں
 عرض کی چارہ کیا ہے اس کے ہوا جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
 زو سے ان بے پناہ تیروں کی کہیں جاں دار کو امان نہیں
 بھکو ہر پھر کے کرش جہت میں ضو اس کی اک جگہ ملی ہی نہیں

پوشکل سچین

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں
 کیجئے تصنیف اور تالیف میں سعی و یلغ
 جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجئے
 اس میں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجئے
 دیکھئے معنی کے نظم نثر میں دریا ہا
 اور نہ ہو کر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
 اور سخن کی داد چسپیر و جواں سے لیجئے
 شاعروں اور منشیوں پرستہ چینی کیجئے
 بے تمیزی اپنا سے زمان

از رو فخر آبگینہ سے یہ یہ کرنے کہا
 جس تیری کس پسند اور قدر و قیمت تیری
 جو وجود اسے بہ ستم دل تیرا برابر اور عدم
 تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ کم نہیں کا علم
 اس حال کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
 گو کہ ہے ترسہ ترا مجھ سے بڑا سے محترم
 میں مقبرہ ایسے اس بازار پارسیاں میں کم
 تجھ سے الٹا لیکن اچھے پڑتے ہیں ہم
 تیرے جو ہر گونہ نہیں موجود اپنی ذات میں
 ایک خود پسند امیر زادہ کی توضیح

کہتے ہیں اک امیر زادہ کو
 خصلتیں جو امیر زادوں میں
 تھا خدنگ فنگنی کا شوق کہیں
 لازمی ہیں وہ انہیں بھی سب خصلتیں
 گو کہ رکھتا نہ تھا ہنس کوئی
 اسے تھا خود پسند اور خود میں

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں بچھپا
 اے شعرِ راہِ بہت پہ توجہ کہ پڑ لیا
 محمود و جان آپ کو گر ہے ایسا تو
 کرنی ہے فتحِ گزشتہ دنیا تو نے نکل
 اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
 ہوتی ہے سچ کی قدر پہ پتھر یوں کب بعد
 بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
 جو قدر واد ہو اپنا اُسے مستم سمجھ
 اسکے خلاف ہو تو سمجھ اُسکو شاذ تو
 حالی کو تجھ پہ ناز ہے کرا سپہ ناز تو
 مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریمانِ جوانی کی بہارِ آخرِ حریف
 اپنی رو واد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
 طبع رنگیں تھی عے عشق کی جب متوالی
 اب کہ الفت ہو نہ چاہت نہ جوانی نہ نہنگ
 جو غزل لکھتے تھے۔ ہوتی تھی سہمِ حالی
 اگر غزل لکھتے تو کیا۔ لکھتے غزل میں خسہ
 سر سے سودا سے تھی۔ عشق سے دل جو خالی
 آپ بیٹی نہ ہو جو۔ ہے وہ کہانی بے لطف
 نہ ہی چیز وہ مضمون سو بھانے والی
 ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیسروں کے بیاں
 گرچہ ہوں لفظِ فصیح اور زباں شکالی
 کھینچے وصلِ صنم کی کبھی مضنی تصویر
 لائے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
 تاکہ بھر کاتے جوانوں کے دل۔ آتشِ کطرح
 کیجئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
 وہ ہو جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
 ”محبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی“
 پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہونہ مثل

نکتہ چینی

لیگتی اُن کو آخر کا بحر فنا کی موج بہا
اہل ہنر کا نام و نشان قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زبید و غفر سہنے صاحب دیواں نام خدا
اب چاہو۔ استاد گنو یا ہمیں سمجھو تم بکت
ہم ہیں وہی ناچینہ رگر گزرا موت اُس کے بڑا
شعر کی طرف خطاب

اے شعر و لہریں نہ تو تو غم نہیں پر تجھ پر چیف ہی۔ جو نہ وہ دل گذارتو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آیتواپنی نہ باز تو
جو ہر بے رستی کا اگر تیری ذات میں خمین روزگار سے ہے بے نیاز تو
خُن اپنا گرد کھا نہیں سکتا جان کو لپے کو دیکھ اور کراپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہی بحر حقیقت کو موج خیز دھوکے کا غرق کر کے رہیگا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایساں شاعری قبلہ ہوا اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گریز جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھا لوگ معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو
چُپ چاپ اپنے سج کئے جادلوں میں گھر او سچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
جو نابلد میں اُن کو بتا جو رہن کے راہ گر چاہتا ہے خشن کی عمر و راز تو

قطعات

چھوٹوں کا بڑا بننا

چند خطوط اک دانا نے کھینچے یاروں سے یہ کہا
 دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
 ہو کوئی؟ جو بے ماتہ لگائے دے یوں نہیں چھوٹے خط کو بڑھا
 ایک نے جتنے خط تھے بڑے اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
 جب نہ رما دھاں پیش نظر خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
 دیکھا اٹھا کر اکھ جدر تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
 گل کی ہر یارو بات کہتی قوم میں باقی جان ذرا
 قوم میں عیا حال ہے اب آدمیوں کا کال نہ تھا
 تھے موجود ادیبوں میں افسوس غشی کے ہوتا
 منشیوں میں ایسے تھے بہت جنہ کہ نازاں تھی انشا
 شعر میں تھے استاد اکثر سحر بیاں اور نکتہ سرا

حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں۔ اور جس کوشش و جانفشانی کے ساتھ کہ کڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورے میں سرگرم رہتی ہے اُسی کوشش و جانفشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور پا در ہوا عمارتیں پختے رہیں یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

» درکار خانہ کہ بنالیش پے غفلت ست ہشیار زیستن نہ ز قانونِ حکمت ست «

» نَزُوْحٌ وَنُعْدُوْ بِحَاجَاتِنَا وَحَاجَةٌ مِّنْ عَاسٍ لَا تَقْنَعُ
وَيَسْلُبُهُ الْمَوْتُ الْآقَابَةَ وَيَمْنَعُهُ الْمَوْتُ مَا يَشْتَبِي
مَمَوْتُ مِمَّ الْمَرْءِ حَاجَاتُهُ وَيَبْقَى لَهُ حَاجَةٌ مَا بَقِيَ «

8 ترجمہ ہم اپنے کاموں میں صبح شام سرگرم ہیں۔ اور جو شخص زندہ ہے اسکا کام ختم نہیں ہو سکتا۔ موت ہی اس کے پورے اُردو کی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اُس کے سامنے ہی مریں گی جب تک وہ زندہ ہے کوئی نہ کوئی خواہش اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے ۱۲

ظاہر ہے کہ سویلریشن جیسا کہ شعر و شاعری کا قائل کہا جاتا ہے اسکا ہر پیمانہ اس ایک ہی پیمانے پر ٹرنے لگا ہے۔ شعر جیسا کہ درجہ میں لیجائے کی اجازت نہ تھی اسکو روز بروز زیادہ تر درجہ میں کے ساتھ بالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پہلے جونی جونی اور نوج نوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوقِ معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا ان کے نزدیک عقل و دانش سے انہر شعرا تا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے ادب پر مدی خواں کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرض کہ شاعرانہ مذاق یونانیوں و مالک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جسے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چرغ بہت جلد ہمیشہ کے لئے گل ہوئے گا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں یونان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصل بیان نہ کر لے ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی۔ اسی لئے معرفتِ مدہ میں مطلق شاعری پر کسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اور چند باتیں جو خاص اس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دریا چہ میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگرچہ کچھ تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مفہم اور دریا چہ لکھنا تو درکنار۔ سرے سے شعر کہنے ہی کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

” آچھ مادر کار داریم کھشہ رے درکار نیست “

مگر بدتر اہمات والارض نے اس خرابہ آباد نما کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے ہیں دھوکے کو

ستیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے۔ اور کبھی ایسے کہ اسنے انکی دولت میں کسی قدر اپنی کھائی بھی شامل کی ہی جو انکے پاس نہ تھی اپنے ستیں اُنپر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی ایسے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دار الغرور و دار الجن ہی۔ اور کبھی اُسکی بڑائی و عظمت ایسے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعہ آخرت ہی وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اُس کی غریبوں کے سبب سے ستایش کرتا ہے اور کبھی اُس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت۔ مگر وہ کبھی اُن حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اُسکے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گو یا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ ایک نادان سچے کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اُسکے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھ کر لوگ متعجب ہوں۔ مگر جب تک شاعر کا سادل اُن کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا اُن کے دماغ میں نہ ہو اُنکا تعجب رفع ہونا شکل ہی۔

» ہزیرِ شاخ گل افنی گزیدِ بیل را نو اگر ان بخورده گزند را چه خبر «

یہ چند اصول جو اوپر بیان کئے گئے اُنسے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے۔ کیونکہ جس طرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اُچھلتا ہے۔ اسی طرح نکتہ چینوں کی زبان۔ بند کرنے سے اور زیادہ کھلتی ہے۔ دوسرے نکتہ چینوں سے کان اُٹھ کر مانوس ہو گئے ہیں کہ جس طرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا۔ اسی طرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس اُن کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورتِ وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچہ میں یہ چند باتیں جناب

اُس تصنیف کو عیب لگاتا ہے۔ اہل طبع شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا بلکہ اُسکا بیسیا ختم پن
 ظاہر کرتا ہے جسکو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیئے۔ فلسفی یا مؤرخ ہر ایک چیز پر اُسکے تمام پہلو
 دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے۔ اور اسلئے ضرور ہے کہ اُسکا بیان جامع و مانع ہو۔ لیکن
 شاعر کا یہ کام نہیں ہے۔ بلکہ اُسکا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اُسکے سامنے آئے۔ اور
 اُس کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اُسکے دل کو بے چین کر دے اُسکو اُس طرح بیان کرے پھر
 جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اُسکو اُس دوسری
 کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تاکہ اُسکو حقائق
 و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے۔ بلکہ جسطرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کی کبھی
 روکار کا۔ کبھی پچھت کا۔ کبھی اس ضلع کا اور کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ہے۔ اسی طرح
 شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ شاعر ایک
 چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بُری
 چیز کی تعریف۔ کیونکہ خیر محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو۔ اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر
 کا پہلو موجود ہے۔ عقل۔ علم۔ زہد۔ دولت۔ عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی
 ہیں۔ مگر شعرا نے انکی جا بجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی۔ نادانی۔ رندی۔ فقر۔ ذلت اور رسوائی
 عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا انکے اکثر مدح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے
 اس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدامت کے مقابلہ میں اسلئے کہ وہ اُستاد اور موجد بن گئے اپنے

تھے اور جنے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی
اُسے میکبت۔ جولیت۔ کیٹھرائن۔ ڈزچوونا۔ اور بعض آوریڈیوں کے ایسے اصلی کیہ کٹر دھکا
ہیں جن کا اُس سوسائٹی پر جس میں اس کی عمر گزری تھی کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا بلکہ ان میں فردوس
اور ہندوستان میں انیس۔ رزم کے بیان میں صد بابا میں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں جنہ
معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود اُن پر گزرے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کس قدر شاعر کی برارت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی اُس کو وعظ و
ناصح کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ناصح کی غرض براہِ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے۔ بخلاف
شاعر کے کہ اُس کا اصل مقصد فطرت انسانی کی کُرید۔ اور واقعاتِ دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس
کھانی ہے اور بس۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لئے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چچ اٹھتا ہے۔
ناصح مشفق میں یاروں کے نہ مُصلح اور مُشر۔ درمندانے نہ اُنکے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر نالہ بے اختیار بلبلِ نالاں ہیں ہم
پس اگر شاعر کا کوئی قول اُسکے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اُس کو وعظ یا ناصح
قرار دیکر یہ الزام دینا نہیں چاہیے کہ ”وَأَنذَرُونِ النَّاسَ بِالْبَیْرِ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ“۔ بلکہ
اُنکی طرف سے یہ عند کرنا چاہیے کہ ”أَنْفُسَهُمْ يَفْقَهُ لَوْنَ مَا لَا يَفْقَهُونَ“

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہی
بلکہ اُسکے کلام کی پہچان ہی یہ بتانی گئی ہے کما قال اللہ تعالیٰ ”وَلَوْ كُنَّا مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ
لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا“، مگر طرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا

باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر دکھاتا ہے۔ اور گھر کے بھید کی طرح چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے۔ اسلئے سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھڑکرا رہا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم از زیادہ۔ پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریان ظاہر کر رہا ہے۔

میں عاشقی کی گھاتیں معلوم کوساری
حالی سے بدگمانی بجا نہیں ہمازی

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ غرہ ہو سکے کہ اُس میں خطرِ انسانی کے
و قائل و غواض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جسکی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب
اور خراباتی شاعر جس پر پہیز گاری کی کبھی پھینٹ نہ پڑی ہو وہ پرہیز گاروں کی سوسائٹی کا
ایسا صحیح نقشہ کھینچ دیتا ہو کہ خود اُس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ
سکتے۔ اس طرح ایک دوسرا شاعر جسے پرہیز گاروں اور پارساؤں کے حلقہ سے کبھی قدم باہر نہیں
رکھا وہ رُنود و او باں کی صحبتوں کا ایسا چربا اُتار دیتا ہے کہ گویا اُنھیں میں سے ایک نے اپنی
حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ ابو لو اس نے بار ماخلیفہ سے ایک مصرع سُکر جنہیں رات کے
تخلیہ اور عیش و عشرت کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا۔ اُس مصرع کی تضمین میں
ایسے واقعات بیان کر دیئے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اُٹھتا تھا ” قَاتَلَتْ اَللّٰهُ
كَانَتْ كُنْتُ نَالِشْنَا “ شکِ پیر جسکے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنے والے

کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی اُنکو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورت وقت اقوال سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں اُن کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اُسکو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات درباغیاں میں خصلاتی مضامین نمایاں ہیں اور ایسے گئے جو شاید کہیں کہیں مطائبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں مگر انوری و سعدی و شغائی کے مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عجب و خود پسندی اور اور اسی قسم کے۔ اخلاق و غلط و زہد و صوفی و شیخ و ملا پر کھلے گئے۔ نہ ایسے کہ لغو و بابت اس فرقہ علیہ کی مذمت مقصود تھی۔ بلکہ ایسے کہ ان خصلات کے بیان کرنے کا اس سے وضاحت کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبہ جیسا اُجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں۔ مگر جب ظلم کو زیادہ ہونا کہ صورت میں دکھانا منظور ہو تا ہی تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہی طرح ریا و عجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے مگر جب اُسکو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈرا نی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعری کی علت غالبی ہے۔

شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اُسکو بصورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ہکو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود ہر باتوں سے پاک ہو کر اور دلوں کو اُن سے

سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی حقیقت شاعری کا بھید انہیں قابل خیالات میں چمپا ہوا تھا جو سبب غایت
ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اسے بیل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی کٹان ہو

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہو ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود

میں لاسکے۔ اُسکی بڑی دوزیہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر ان میں

ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونہ کا۔ یا برتنی

ایک تخت کو بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے۔ اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب

دینے میں کسی ایسے مصلح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامری میں موجود

ہو۔ وہ مصلح کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو در قرعہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔

خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں۔ یا زمین۔ آسمان۔ چاند۔ سورج۔ پہاڑ اور دریا جیسی شائد

چیزوں سے۔ یا پتھر۔ مٹری اور بھٹنے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات

کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی۔ اُسکی مثال

اُس مہار کیسی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصلح

کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔

” ترسم نہ رسی کجہ لے اعرابی کاین کہ تو میروی بہرستان مت “

الغرض جب شاعری کی لئے کھلی۔ معمولی شکار چھوڑ کر عبقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین

پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزول ماندہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانہ کے حالات دیکھ کر جو

سخت ضرورت ہو کہ طرز بیان میں قدم کی طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے۔ جسے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ اور قدرہ کا دل سے شکر گزار ہو جو اُس کے لئے ایسے مجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعہ کو اور نیز ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی ایسے اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں۔ اور نہ طرز بیان ہی میں کوئی ایسی جدت ہو جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور یہ سمجھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھیں کہ ”هَذَا الَّذِي رُذِقْنَا مِنْ قَبْلُ“ پس اُن کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرزِ ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں دُعا بھی غور فرمائیں گے تو اُن کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں۔ اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں۔ یا کسی کے ذہن کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و نا شاعر کے دل میں ہمیشہ گذرتے ہیں اور ہر وقت اُن کے پیش نظر ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ لیے پامال اور تبذیل ہیں انکو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور اُن کی طرف بہت کم التفات کیا گیا۔ اور پائیدہ شاعری کو اُن سے دربار الوداع

8 قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھائے گا تو وہ کہیں گے هَذَا الَّذِي رُذِقْنَا مِنْ قَبْلُ رِيعًا تو ہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزہ اور لذت جُدا ہوگی ۱۱

بلکہ بعض اوقات اُس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش۔ تحسین و آفرین کے لالچ۔ جلب منفعت کی توقع۔ یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود کرنے والے اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگرچہ ہم اُس وقت نہ ہونگے۔ مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ اور پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا۔ اور جھوٹ برسات کے سبزہ کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

تَمُوتُ اِذَا الْمَخْتَصِمِينَ اَصُولُ ۝

وَلَمَّا قَدْ رَأَيْنَا مَنْ فُروِعَ كَشِيرَةٍ ۝

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر تپا اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے موج۔ ہجا۔ غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید۔ مناجات۔ اخلاق اور عظمت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہو کہ متاخرین قدیم شعر کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر اُن کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ناک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہو کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لئے اُسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے۔ اور اپنی وضع۔ صورت اور لباس کی چہیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کر دے۔ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی

8 ترجمہ: ہنہ شاعر کثرت و بختی دہی میں جن کی خبر اس قابل نہیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں ۱۱

طور پر وقتاً بعد وقت شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں مہین پہلا کلام جو عالمِ جبل و نادانی یا خلاصہ زندگی کی نشانی ہے وہ بھی کیسے تلف ہو جانے کے بعد جسدِ برہما ہے اب تک محفوظ ہو۔ انسان کی طبیعت کا مقصد ہے کہ جو کام اُسکی تھوڑی یا بہت کوشش سے سر انجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا بُرا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو وہ اُسکو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ اور خاص عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے جس شخص کے ساتھ کہ وہ اُعرابی جنے کبھی آبِ شیر میں کاغذ نہ بچھتا تھا ایک کھاری پانی کے چشمہ سے مشک بھر کر یاروں رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا۔ وہ اُس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو گلبلب امریکا دریافت کر کے اِڑ پلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جہیں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھتے مردود ہو یا مقبول۔ ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پہلاس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانہ کے خیالات میں پہلے زمانہ کی نسبت حائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے۔ اور جیسی کہ امید کیجاتی ہے ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو بچے معلوم ہوتے ہیں ایسے بچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہر کو بھی معلوم نہیں۔ تا بدیگر ان چہ رسد۔ جیسا کام محض بچے جوش اور ولولہ سے ہوتا ہو ویسا ہی

۱۱ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی راجہ رشید کے زمانہ میں ایک بدوی جسے کبھی جیل کے شیر میں پانی کا مزہ نہ ملتا تھا اُس کو محض ایک چشمہ ملا۔ جس کا پانی اگرچہ وجہ کے پانی سے کچھ نیک نہ رکھتا تھا۔ لیکن جیسا شور مچا کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا۔ اُس سے کیسے شہا تھا۔ وہ خوشی خوشی اُس کی ایک مشک بھر کر بغداد میں پہنچا۔ یہ خلیفہ کے دربار میں اُس کو بطور ایک عقیق نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اُس کو بچھا تو بالکل کھاری پانی تھا۔ مگر اُس کی بددیہی بدوی ہر ظاہر نہیں ہوتے دی۔ اور اُس کو انعام دے کر رخصت کیا۔ اور حکم دیا کہ یہ شخص وجہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔ ۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کچھ کذب و افتراء ہے کچھ کذبِ حق ثواب ہے یہ ہی بضاعتِ اپنی اور یہ ہے فقر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا ^{ماشوق} عشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا۔
 اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اُس جوش اور ولولہ سے ہوا ہے۔ جو عشق اور محبت کی بدولت انسان
 کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور شعر کی ذات میں جو ایک آتشگیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں
 کسی آگ کی شہتالاک کا محتاج ہے۔ پھر قوم کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ بانہ
 حدیثِ سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہدِ رعنا سے سخن کا نظارہ ایک پیر زال کی صورت میں کیا جائے
 اور شرابِ ارغوانی کی جگہ سرکہ بے نمک سے ضیافتِ طبع کی جائے۔ غرض کہ ایک مدت تک یہ حال رہا
 کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اُس شعر کا ہلاک
 کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شاعر عام پر
 پڑے جس پر بیگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ۔ راہ کی ہمواری۔ اور رہگزر کی فضا چھوڑ کر

دیوان حالی

جس میں قطعات - غزلیات - قصیدے - مرثیے

ترکیب بند - رباعیاں - تارخیں - او

اور متفرق اشعار شامل

ہیں

بااینہم اگر مقتضائے بشریت کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ہمارے کسی ہموطن کو ناگوار گذرے تو ہم نہایت عاجزی اور ادب کے معافی کے خواستگار ہیں۔ اور چونکہ یہ مضمون اردو لٹریچر میں جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے بالکل نیا ہے اسلئے ممکن ہے کہ اگر بالفرض اس میں کچھ خوبیاں ہوں تو اُن کے ساتھ کچھ لعنیں اور خطائیں بھی پائی جائیں۔ مگر چہ خدا نے تو یہ قاعدہ بتایا ہے کہ ”وَالْحَسَنَاتِ يَذْهَبْنَ السَّيِّئَاتِ“، مگر انسان نے اُنکی جگہ یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ”إِنَّ السَّيِّئَاتِ يَذْهَبْنَ الْحَسَنَاتِ“ پس اس انسانی قاعدہ کے موافق ہم کو یہ سید رکھنی تو نہیں چاہیے کہ اس مضمون کی غلطیوں کے ساتھ اُنکی خوبیاں بھی (اگر کچھ ہوں) ظاہر کی جائیں گی۔ لیکن اگر صرف غلطیوں کے دکھانے ہی پر کتف کیا جائے اور خوبیوں کو بہ تکلف بُرائیوں کی صورت میں ظاہر کیا جائے تو بھی ہم اپنے تئیں نہایت خوش قسمت تصور کریں گے۔

8 یعنی نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ پس دوسرے فقرہ کے یہ معنی ہونگے کہ بدیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں ۱۲

الطاف حسین حالی

کتبہ مصنف اہلباء و فقیر محمد الدین عفا اللہ عنہ و زہدہ رزق علیہ السلام دایا نا کا بلا ”جند یا لوی“

کی محتاج ہے۔ ہم نے اپنی ناچیز رائیں جو اس مضمون میں شاعری کی اصلاح کے متعلق ظاہر کی ہیں گواہیوں سے ایک رے بھی تسلیم نہ کی جائے۔ لیکن اس مضمون سے ملک میں عموماً یہ خیال پھیل جائے کہ فی الواقع ہماری شاعری اصلاح طلب ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہجو پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے منزل کا یقین ہے۔

اگرچہ اردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم المشہور شاعروں کے کلام پر صراحتاً نکتہ چینی کی جائے کیونکہ عمارت کا بودا بن جیسا بنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہی وطن اجماعی اعتراضات کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہو۔ اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اٹھ نہیں کیا گیا جو خاص اس کے کلام سے خصوصیت رکھتا ہو۔ بلکہ شاعری کے عام طریقہ پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا ہے نقل کر دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص پر بالخصوص اعتراض کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ شاعری کے عام طریقہ کی خرابی ظاہر کرنی مقصود ہے۔ جس میں اس شخص کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک ممکن تھا کسی پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کیا۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اپنی شاعری اصول مسئلہ سے ناواقف ہے۔ یا اُسے کوئی گریمر یا عروض کی غلطی کی ہے۔ یا کوئی ایسی فرگشت کی ہے جس سے قدیم طریقہ کے موافق اس کی شاعری پر حرف آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ایسا اعتراض کیے ہیں جو نہ صرف اردو شاعری بلکہ تمام ایشیائی شاعری پر وارد ہوتے ہیں۔

ہر ایک خاص وجہ سے زیادہ تر پورب میں ہوتی تھی۔ اُس مشنوی میں جیسا کہ ہم نے
 پنے بعض اجاب سے سنا ہو۔ تقریباً ۴۰-۴۵ شعر اسی قسم کے ہیں جیسے کہ شوق نے
 بہارِ عشق میں اختلاط کے موقع پر اُسے بہت زیادہ لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق
 ایسی صاف زبان برتنے کا خیال اُس مشنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اور چونکہ وہ ایک شوخ طبع
 آدمی تھا۔ اور ہجیات کے محاورات پر بھی اُس کو زیادہ عبور تھا اُس نے اپنی مشنوی کی بنیاد
 خواب و خیال کے اُنھیں ۴۰-۴۵ شعروں پر رکھی۔ اور اُن محاملات کو جو خواجہ میر انیس کے
 اُس ضمیمہ مختصر طور پر بیان ہوئے تھے۔ اپنی مشنوی میں زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کیا
 اور جس قسم کے محاوروں کی اُنھوں نے بنیاد قائم کی تھی شوق نے اُس پر ایک عمارت چُن دی
 اسکا بڑا ثبوت یہ ہے کہ خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے
 بہارِ عشق میں موجود ہیں جن میں سے ایک دو شعر بکواس بھی یاد ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ
 موجودہ حالت میں خواب و خیال کو بہارِ عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی۔

اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ اس کی نسبت بہ امید رکھنی کہ ہمارے دیر
 سال شاعر جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ اس مضمون کی طرف التفات کریں گے
 یا اسکو قابلِ التفات سمجھیں گے محض بے جا ہے۔ اور یہ خیال کرنا بھی فضول ہے کہ کچھ ہمیں
 لکھا گیا ہے وہ سب واجبِ تسلیم ہے۔ بہتہ بہکوا اپنے نوجوان ہموطنوں سے جو شاعری کا
 چسکا رکھتے ہیں اور زمانہ کے تیور پہچانتے ہیں یہ اُمید ہے کہ وہ شاید اس مضمون کو چھیں
 اور کم سے کم اسقدر تسلیم کریں کہ اُردو شاعری کی موجودہ حالت بلاشبہ صلاح یا تعمیر

اکثر ترجیح دی ہے۔ ردیف و قافیہ میں عروضیوں کی بے جا قیدوں کی بھی چنداں پابندی نہیں کی۔ مگر محاصل مقصود ردیف و قافیہ سے ہوتا ہے۔ اُسکو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً

کوئی مریا ہے کیوں؟ بلا جائے ہم بہویشیاں یہ کیا جانیں

اس ردیف کو ہمارے شعرا ضرور غلط بتائیں گے۔ مگر ردیف کا جو اصل مقصد یہی وہ اس سے بخوبی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ سامع کو یہ شعر سن کر واحد اور جمع کا فرق مطلق محسوس نہیں ہوتا اور یہی ردیف کا حاصل ہے۔ حتمی لحاظ کے موقع پر جس بے تکلفی کے ساتھ معاملات کی تصویر اُس نے کھینچی ہے۔ اُس کی نسبت سوا اسکے اُور کیا کہا جائے کہ ”چور کی ماں گٹھنوں میں سر دے اور روئے“ افسوس ہے کہ شوق کی مثنویوں کی اس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جاسکتی کہ جو شاعری اُس نے ایسی اُن مومل مثنویوں کے لکھنے میں صرف کی ہے اگر وہ اسکو اچھی جگہ صرف کرتا اور روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فرشتے کا کام لیتا تو آج اُردو زبان میں اُسکی مثنویوں کا جواب نہ ہوتا۔

یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ نواب مرزا شوق کو اپنے اسکول کے برخلاف مثنوی میں ایسی صاف اور با محاورہ زبان برتنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ کیونکہ جب سوسائٹی کا رخ دوسری طرف پھرا ہوا ہوتا ہے تو اُسکے مخالف رخ بدلنے کے لئے کسی خارجی تحریک کا ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر دہلوی نے جو ایک مثنوی لکھی ہے۔ جکا نام غالباً **خواب و خیال** رکھا تھا اور جسکی

میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ محاط
 کے قابل ہیں۔ شوق غالباً واجد علی شاہ کے اخیر زمانہ سلطنت میں یہ مثنویاں لکھی ہیں
 ان میں سے تین مثنویوں میں اُسے اپنی بوالہوسی اور کامجونی کی سرگزشت بیان کی ہے
 یا یوں کہو کہ لپے اور پرافترابانہا ہے۔ اور ایک مثنوی یعنی لذتِ عشق میں ایک قصہ
 بالکل بدرِ منیر کے قصے سے ملتا جلتا اُسی کی بحر میں لکھا ہے۔ ان مثنویوں میں اکثر مقامات سے
 اُن موزوں اور خلافِ تہذیب ہیں کہ ایک مدت سے ان تمام مثنویوں کا چھپنا حکماً بند کر دیا
 گیا ہے۔ لیکن اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک انکو بدرِ منیر پر
 ترجیح دی جاسکتی ہے۔ وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جوابِ متروک ہو گئے ہیں اور شوق
 اور بھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں۔ ان میں ایک قسم کا بیانِ زبان کی گھلاوٹ
 روزمرہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی ہر جگہ کے محاط سے بمقابلہ بدرِ منیر
 کے بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اسطرح برتا ہے کہ نشر
 میں بھی ایسی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔ اگرچہ ان مثنویوں میں بدرِ منیر کی
 طرح ہر موقع کا سین نہیں دکھایا گیا۔ جس سے شاعر کی قدرتِ بیان کا پورا پورا اندازہ ہو سکے
 مگر جو کچھ اُسے بیان کیا ہے خواہ وہ اہل ہو اور خواہ اُن موزوں۔ اُس میں حسنِ بیان کا پورا
 پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اُسے برخلاف عام شعراے لکھنوی کے لفظی رعایتوں کا مطلق
 التزام نہیں کیا۔ اور اردو کے عام روزمرہ کو صحتِ الفاظ پر جسے اہل لکھنوی سخت پابند ہیں

آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچ دی ہے۔ اور مسلمانوں کے اخیر دور میں سلاطین و اُمراء کے ہاں جو جو حالتیں ایسے موقعوں پر گذرتی تھیں اور جو معاملات پیش آتے تھے انکا بعینہ چربا بازار دیا ہے۔ میر حسن کے بعد اور مثنویوں میں بھی بدرِ منیر کی ریس سے یہ تمام سینہ کھانے کا قصد کیا گیا ہے۔ لیکن کثیر راہِ است بہت دور جا پڑے ہیں۔ ایک صاحب بازار کی تعریفیں کرتے ہیں کہ "وہاں ناز و شوخی و انداز کی جس بچتی ہے (یعنی کوئی جنس دستیاب نہیں ہوتی) ٹھنڈی سانسوں کا بازار گرم رہتا ہے (یعنی بازار میں بالکل رونق نہیں) (دراغ دل کا سکہ ہر طرف بھنایا جاتا ہے (یعنی سکہ رائج کی ریزگاری نہیں ملتی) (خارجہ گاہ کے کانٹے میں زرجان بنتا ہے (یعنی نہ وہاں سونا ہے نہ سونا تو لئے گاٹا) (میوہ فروش سیبِ قنہ بچتے ہیں (یعنی سیب نہیں ملتے) (ترکاری کی جگہ جو بن بکتا ہے (یعنی ترکاری نہیں ملتی) (حلوائیوں کی دوکان پر شیرہ جان کی مٹھائی بنتی ہے (یعنی لڈو پیڑے اور بالوشاہی وغیرہ کا قحط ہے) (بازار میں آبِ گوہر کا چھڑکا ہوتا ہے اور مردِ ماہ کا کٹورا بجاتا ہے (یعنی بازار میں خاک اڑتی ہے اور ہر وقت سناٹا رہتا ہے) (اسی طرح جو سین دکھانا چاہتا ہے اُس میں محض الفاظ کا طلسم باندھا ہے۔ معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھا۔ بہر حال اردو کی عشقیہ مثنویوں میں ہمارے نزدیک اکثر عبارتِ بارات سے بدرِ منیر کے برابر آجکے کی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ البتہ اُس میں کچھ الفاظ و محاورات ایسے ضرور ہیں جو کہ اب متروک ہو گئے ہیں۔ لیکن آج سے تشراسی برس پہلے کی مثنوی کا حُسن اور زیور یہی ہے کہ اُس میں ایسے الفاظ و محاورے موجود ہوں۔

اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں۔
میر تقی کے بعد میر حسن دہلوی کی مثنوی بدیر **میر حسن** نے ہندوستان
میں جو سچی شہرت اور قبولیت حاصل کی ہے۔ وہ نہ اُس سے پہلے اور نہ اُس کے بعد لرج
کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ خیال کہ میر تقی کے مثنویوں سے میر حسن کو کچھ مدد ملی گی
یا کچھ رہبری ہوئی ہوگی، ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ قصہ کی شان جو میر حسن کی مثنوی
میں ہے میر تقی کی مثنویوں میں اُسکا کہیں پتا بھی نہیں۔

اگر اس بات سے قطع نظر کر لی جائے کہ قدیم قصوں کی طرح اس مثنوی کی بنیاد
بھی دیو افسانوں پر رکھی گئی ہے تو یہ کمنا کچھ بے جا نہیں ہے۔ کہ میر حسن نے قصہ نگاری کے
عام فرائض پورے پورے ادا کر دیئے ہیں۔ سلطنت کی شان و شوکت۔ تختگاہ کی رونق اور
چل پہل۔ بلاولزی کی حالت میں یاس و ناامیدی اور دنیا سے دل برداشتگی جو تیشیوں کی
نقشبگو۔ شانزادہ کی ولادت اور چھٹی کی تقریب۔ نلچ رنگ اور گانے بجانے کے ٹھاٹھ۔ باغوں
اور بہر قسم کی محفلوں کے سہ۔ سواریوں کے جلوس۔ حلام میں نہانے کی کیفیت اور حالت
سکانون کی آرائش۔ شانہ لباس اور جواہرات اور زیورات کا بیان۔ خواجگاہ کا نقشہ۔ جوانی کی
عنیدہ کا عالم۔ رنج اور غم کے عالم میں محسوس اور باغوں کی بے رونقی۔ عاشق و معشوق کی پہلی
ملقات اور اُس میں شہم و حجاب کا پاس و محاط۔ عشق و محبت کا بیان۔ حُسنِ جمال کا بیان۔ جد
کا بیان۔ معجائب کا بیان۔ خوشی کا بیان۔ نسبت کے پیغام و سلام۔ بیاہ شادی کے سامان
پچھڑے ہوؤں کا ملنا اور اُس حالت کا نقشہ۔ غرض کہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہے اُس کی

بیش پائی جاتی ہیں۔ مگر غزل میں اُن کی کھپت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ غزل میں اگر ایک شعر بھی ضائع اور عمدہ نکال آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے۔ وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پُرکُن اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ لیکن مثنوی میں جِسٹہ جِسٹہ اشعار کا صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس ان اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں نہ بچے۔ مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جو وقت میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اُس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی بالائینہ میر کی مثنوی کثیر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے۔ باوجودیکہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انھوں نے کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور مطالب کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے جیسا کہ ایک شائق و ماہر استاد اور کاتب ہے۔ اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بمقابلہ اُن اشعار کے جن میں پُرانے محاورے یا فارسیت غالب ہو کچھ کم نہیں ہیں۔ صد ماہ اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زباں زد چلے جاتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے۔ انھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ نہ اُن میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا سماں بیان کیا گیا ہے۔ نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے۔ مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہیں دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز

سوافق ایراد کلام کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اسکو زیادہ اہم سمجھ کر خصوصیت کے ساتھ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ان آٹھ باتوں کے سوا قصہ نگاری کے اور بھی فرائض ہیں۔ مگر یہاں صرف انہیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے ہم وطنوں کو شاعری کی اصلاح کا خیال ہوگا تو ان کو کسی کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے خود ان کی طبیعت ان کی رہنمائی کرے گی۔

اب ہم خاص ان مشنویوں پر جو ہمارے نزدیک کسی نہ کسی حیثیت سے امتیاز رکھتی ہیں ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ اب تک اردو میں جتنی عشقیہ مشنویاں ہماری نظر سے گزری ہیں ان میں سے صرف تین شخصوں کی مشنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوئے ہیں۔ اول میر تقی جنوں نے غالباً سب سے اول جذبہ عشقیہ قصے اردو مشنوی میں بیان کیے ہیں۔ جس زمانہ میں میر نے یہ مشنویاں لکھی ہیں اسوقت اردو زبان پر فارسی بہت غالب تھی اور مشنوی کا کوئی نمونہ اردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔ اسکے سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی۔ مگر مشنوی کا راستہ صاف ہوتے تک ابھی بہت زمانہ درکا تھا اسی لئے میر کی مشنویوں میں فارسی ترکیبیں فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اردو زبان متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس انداز سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار بلاشبہ کہ یہ قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات جو اب متروک ہو گئے ہیں میر کی مشنوی میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں بھی کم

انکی سمجھ میں کچھ نہیں آ سکتا۔ رہی دوسری بات سو اسکا خیال تو ہمارے شعر نے کبھی بھول کر بھی نہیں کیا بلکہ جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں وہاں اور بھی زیادہ پھیل پڑتے ہیں۔ اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کھلم کھلا بیان کرتے ہیں۔ افسوس کہ ہم ایسے موقعوں کی زیادہ صاف اور کھلی ہوئی مثالیں نہیں دے سکتے۔ صرف تصحیح اور کنایہ کی صورت زیادہ ذہن نشین کرنے کے لیے یہاں ایک سری مثال پر کثرت کرتے ہیں خواجہ میراثی دہلوی اپنی مشنوی خواب و خیال میں اختلاط کے موقع پر کہتے ہیں۔

”ما تھا پانی میں مانپتے جانا کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا“

دوسرے مصرع میں اس بات کی کچھ تصحیح نہیں کی گئی کہ کیا چیر کھلتی جاتی تھی اور کس چیز کو بار بار ڈھانپا جاتا تھا۔ یہ طلب اس سے بہتر لفظوں میں ادھنیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسے موقع پر چیر بولا بھی یونہی جاتا ہے کہ سینے یا چھاتی یا محرم غیبہ کا صراحتہ نام نہیں لیا جاتا۔ اسی طلب کو نواب مرزا شوق نے بہار عشق میں اسطرح ادا کیا ہے

”ما تھا پانی میں مانپتے جانا چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا“

شوق نے اتنا پردہ تو رکھا ہے کہ لباس ہی کے نام پر کثرت کیا ہے سینے وغیرہ کا نام نہیں لیا۔ مگر پردہ ایسا باریک ہے کہ اس میں بدن جھلکتا نظر آتا ہے۔

تصحیح کچھ بے شرمی بے حیائی ہی کے موقع پر بدنام نہیں ہوتی۔ بلکہ قصہ میں اکثر مقام ایسے آجاتے ہیں کہ اگر دماغ رمز و کنایہ سے کام نہ لیا جائے تو کلام نہایت سبک اور کم وزن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بحث فی الواقع چوتھی دفعہ سے علافہ رکھتی ہے جس میں مقتضائے حال

خیر مصرع سے صاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ایک طرف دھان کھڑے تھے اور ایک طرف
سرسوں پھول رہی تھی۔ مگر یہ بات واقع کے خلاف ہی کیونکہ دھان جنہیف میں بڑھتے
ہیں اور سرسوں بروج میں گیہوں کے ساتھ بوئی جاتی ہے

یامثلًا ششوی طلسم الفت میں جبکہ شاہزادہ جان جہان کا ہاز غرق ہوا ہے
اور جان جہاں اور سب اہل ہاز ڈوب چکے ہیں۔ اسطرح بیان کرتا ہے۔

دوسرے دن وہ گوہر بکیتا جمیل کر محنت محیط بلا
مثل خورشید ڈوب کر نکلا زندہ اک تخت پر گر نکلا

یعنی جان جہان ایک رات اور ایک دن ڈوبے رہنے کے بعد زندہ دریا سے نکلا اور نکلا
بھی ایک تختہ پر بیٹھا ہوا۔ اول تو اس قدر عصر کے بعد زندہ نکلنا اور پھر قصر دریا سے
ایک تختہ پر بیٹھے ہوئے نکلنا۔ بالکل تجسیر اور شاہدہ کے خلاف ہے

۸۔ بطرح اُن اہم اوصاف وری باتوں کو جن پر قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت
کے ساتھ بیان کرنا ضرور ہے۔ اسطرح اُن ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں مگر
وکنایہ میں بیان کرنا ضرور ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری مشنویوں میں دونوں باتوں کا بہت
کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً گل بکاولی کے قصہ میں سارے قصہ کی بنیاد صرف اس بات پر
رکھی گئی ہے کہ زین الملک کے جب پانچواں بیٹا پیدا ہوا تو بنجیویوں نے چکم لگایا کہ اگر بادشاہ
اس بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیگا تو اسکی بیسنائی جاتی رہے گی۔ مگر گلزار نسیم میں اس
بات کو ایسا نا کافی طور پر بیان کیا ہے کہ اگر گل بکاولی کا قصہ پہلے سے کسی کو معلوم نہ ہو تو

کھینچ مارا کسی پہ ہنس کے اگال بچ سے مونہ کیسا ہو گیا لال

دور سے ہنس کے اک کو شاد کیا قرب پر وہ کیسا کو یاد کیا

یوں ہی وہ دن تمام ہوتا ہے کیا کہوں قتل عام ہوتا ہے

دو گھڑی دن رہے سے تار شام جلوہ آرا یہی وہ ہمہ لہذا

غرض کہاں تک لکھوں دور تک ایسے ہی اشعار جتنے نہ صرف بے پردگی بلکہ غایت درجہ کا بیسواپن پایا جاتا ہے چلے جاتے ہیں۔ اس بیان میں اور اوپر کے دونوں شعروں کے بیان میں جو منافات ہے وہ ظاہر ہے ایسی مثالیں اس مشنوی میں اور گزرا نسیم میں بہت ہیں۔ مگر اور مشنویاں بھی اس سے بالکل پاک نہیں ہیں۔

۷۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضرور ہے کہ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے

جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ جسطرح ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر قصہ کی

بنیاد رکھنی آج کل زیبا نہیں ہے۔ اسی طرح قصہ کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی

جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس قصہ نگار کی اتنی بے سلیقگی

ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی لاعلمی اور دنیا کے حالات سے ناواقفیت اور ضروری اس طرح

حاصل کرنے سے بے پروائی ثابت ہوتی ہے مثلاً بدزبیر میں ایک خاص موقع اور وقت

کا سماں اس طرح بیان کیا ہے۔

وہ گانے کا عالم وہ حُرنِ بتاں وہ گلشن کی خوبی وہ دکنِ کاسماں

درختوں کی کچھ چھانواں اور کچھ وہ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا پتہ

جو کاریگر کسی انسان کی مورت پتھر یا دھات کی بناتا ہے ظاہر ہے کہ وہ مورت انسان کی نقل ہوتی ہے نہ اصلی انسان۔ لیکن کاریگر کا فرض یہ کہ اُس میں اور اصلی انسان میں ایک جان پڑنے کے سوا اور کوئی نسر ق محسوس نہ ہو۔ اس طرح قصہ نگار کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ قصہ کھل واقعات کی شکل میں بیان کیا جائے۔ اس مطلب کے ذہن نشین کرنے کے لئے ہم چند شعر مشنوی طلسم الفت کے نقل کرتے ہیں۔ ایک قصہ گو۔ شانہزادہ عشق آبادیہ جہان جہان سے حُن آباد کی شہزادی عالم آرا کا حال اپنی آنکھوں دیکھا بیان کر رہا ہے۔ کہ جب میں حُن آباد میں پہنچا تو ایک شخص نے مجھے عالم آرا کے حُن جال ذکر کرنے کے بعد کہا

” دیکھنا بھی تو اُس کا مشکل ہے کہ وہ لیلی میان محل ہے “

” آدمی کیا ملاکے پر وہ ہے بلکہ چشمِ فلک سے پر وہ ہے “

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو بڑے اتہام کے ساتھ پر وہ میں رکھا جاتا ہے۔ مگر اسی بیان میں اُس کا ذکر ہوتے ہوئے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ باغ میں جس دریا میں جا کر وہ بیٹھتی ہے وہاں۔

” تر بامِ اردہام رہتا ہے مجمعِ خاص و عام رہتا ہے “

” مشقِ جور و ستم کسی پر ہے چشمِ لطف و کرم کسی پر ہے “

” ناز سے ایک سے کلام کیا ایک کو غمِ نہر سے تمام کیا “

” وصل کا ایک سے کیا اقرار ایک مشتاق سے کیا انکار “

” دُہری فقروں میں اک کو نالِ دیا ٹھٹھے بازی میں اک کو ڈالِ دیا “

مثنوی گلزار نسیم میں بھی لفظی رعایتوں کا بہت التزام کیا گیا ہے۔ اُس نے بھی
پکا ولی کا حال تاج السک کے فراق میں کچھ مختصر لکھا ہے۔ وہ اس طرح بیان کرتا ہے:

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گزری بے خور و خواب نائل ہوئی اُس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ ہیأت میں مثال رہ گئی وہ

اس بیان میں بھی تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا
اور ظاہر اُسے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں۔ اُسکو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ
کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی۔ پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ کپڑوں کی عوض رنگ بدلتی تھی
وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ قصہ میں اس بات کا بھی لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ ایک بیان دو کے بیان کی تکذیب
نہ کرے۔ کیونکہ اس سے قصہ نگار کا پھوڑ بن ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ سچ منہج اس شیل کا مصداق
ہوتا ہے کہ ”در و غلور احافظہ نباشد“ آج کل جو شایستہ ملکوں میں ناول لکھے جاتے ہیں
انکا تو کیا ذکر ہے۔ ایشیا کے قدیم زمانہ کے قصہ نویسوں نے بھی اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھا
ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کے منافی نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ قصہ میں کسی خاص واقعہ کا
بیان نہیں ہوتا۔ مگر قصہ نگار اُسکو ایک واقعہ ہی کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ پس اُسکو ایسے
طور پر بیان کرنا جس سے جا بجا انکی غلط بیانی ثابت ہو اصول قصہ نگاری کے خلاف ہے

گو کہ دردِ جگرِ صاحب تھا ضبط آٹھوں پہر صاحب تھا
گاہ آنکھیں لگی ہوئیں چھتے مشورے گاہ دردِ فقر سے
دل سے کہنا کبھی نہیں کر دل دربار کا یہ زعم ہے ہل
کچھ تو ہید جی میں تھی کچھ یاس گاہ درجہ یقیس کا گاہ ہیرا

یہ شنوی لکھنو کے ایک مشہور شاعر آفتاب الدولہ مہر الملک خواجہ سعد علیاں بہادر
شمس جنگِ تخلص بہ **فلسف** کی ہے۔ سنا ہے کہ اکثر اہل لکھنؤ اس کو اعلیٰ درجہ کی شنوی
سمجھتے ہیں۔ شاید ایسی ہی ہو۔ مگر افسوس ہے کہ وہ زمانہ حال کے مذاق سے بالکل آشتی نہیں رکھتی
جو شعر بننے اس مقام پر اس سے نقل کیے ہیں۔ انہی کچھ خصوصیت نہیں جو بلکہ اس شنوی کا
تمام بیان اول سے آخر تک اسی قبیل کا ہے۔ لفظی رعایتوں میں معنی کا سرشتہ اکثر ماتھے سے
جاتا رہتا ہے۔ اور کوئی حالت یا سہا جیسا کہ چاہیے بیان نہیں ہو سکتا۔ اول کے چاروں شعروں
میں پہلے مصرعوں کا تو بمشکل کچھ مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ مگر آخر کے چاروں مصرعوں کا مطلب
ہماری سمجھ میں طاق نہیں آیا۔ ان کے بعد بھی کچھ مصرعے ایطرح کے ہیں۔ باقی جن شعروں
یا مصرعوں کا مفہوم کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ ان میں کوئی بات سیدھی طرح نہیں بیاں کی مثلاً
”اُسکو کسی کی شرم باقی نہیں رہی تھی“ اسکو یوں بیان کیا ہے کہ ”اُسکو شرم سے
شرم آنے لگی“ یا ”رات میں وہ خاموش رہتی تھی۔“ اسکی جگہ ”وہ خاموشی سے ہمکلام
رہتی تھی“ یا ”وہ خود فراموش رہتی تھی“ اسکی جگہ ”اُسکو خود فراموشی یاد رہتی تھی“
غرض کہ کل اشعار کا حال جیسا کہ ظاہر ہے ایسا ہی ہے یا اس سے بھی زیادہ روایہ اور ان خیر

پان کے بدلے خونِ دل کھٹا دیکھ کر مہندی پانہ پھینک لانا ✓
 رات دن ہم کلامِ خاموشی یاد ہر دم زخودِ فراموشی
 گرم صحبت تھی سرد آہوں سے سر پہ بھی گر گیا نگاہوں سے ✓
 ناتوانی بھی زور کرنے لگی لاغری منکر گور کرنے لگی ✓
 آشنا دو دواہ لب سے ہوا اوج سوزِ دل اس سبب ہوا
 شدتیں دردِ دل کی سننے لگی یاس پہلو کے پاس رہنے لگی
 رنگِ خونِ جگر بھی لانے لگا آنکھ سے جاے اشک آنے لگا
 سرگرائی بھی سر اٹھانے لگی بیکراری سے چین پانے لگی ✓
 کاجل اور آئینہ سے آٹھ پہر چشم پوشی تھی اُس کو نہ نظر ✓
 روز افزوں تھا شوقِ کم سخن زردی رنگِ رخ پہ غلہ بنی
 چوٹی بھولے سے بھی نہ گدھواتی پیچ و تاب اور کنگھی سے کھاتی ✓
 فکرِ سنِ سن کے لاکھے کا وہ نگار ہونٹ اسپنہ چباتی سو سو بار
 ہمنشینوں سے ہو گئی نفرت کنجِ عزت سے رہتی تھی خلوت
 خنچی لب جو کرتی مومنہ زور صاف کر جاتی اسکی غمخوری
 بدلے ہنسنے کے روزِ روزِ ناخدا خاکِ سدا کی جا بچھونا تھا
 خاصہ جوقت کوئی لاتی تھی گھڑیوں اُکائی اُسکو آتی تھی
 کوفت کھانے سے بڑھ جیتی تھی خونِ دل جائے آبِ پیشی تھی ✓

جہاں بیٹھ جانا پھر وہاں سے نہ اٹھنا۔ اگر کسی نے اُٹھنے کو کہا تو اُٹھ کھڑا ہونا نہیں تو بیٹھے رہنا۔ کسی نے حال پوچھا تو خیر و عافیت کہی۔ کسی نے بات کی تو جواب دیدیا کر بے ٹھکانے کسی نے کھانے کو کہا تو کہا بہت اچھا نہیں تو کچھ نہیں۔ ہر کام اور دل کے کئے سے کرنا نہیں تو کچھ نہ کرنا۔ دل ہی دل میں کسی سے سوال جواب کرنے۔ دن رات کسی کی صورت آنکھوں کے سامنے رہنی۔ زبان سے باتیں کرنی اور دل میں اُداس رہنا۔ جو کھلا ہو تو کھلا ہی ہے جو کرتی میلی ہے تو میلی ہی ہے۔ جو سی نہیں ملی تو یو نہیں ہی۔ جو گنگھی نہیں کی تو بے گنگھی ہی ہے۔ نہ سرمہ سے مطلب نہ کاجل سے غرض۔ مگر بغیر بناؤ سنگار کے بھی بھلا لگنا اور بگڑنے سے اور زیادہ بننا۔ یہ سب ایسی سچی اور پتے کی باتیں ہیں جو ہمیشہ ایسی حالتوں میں واقع ہو کرتی ہیں۔ اگرچہ شوق کا بیان اور شہنویوں کی نسبت نہایت عمدہ ہو۔ مگر جیسی چچی ملی باتیں **میسر حسن** نے بیان کی ہیں ویسی شوق کے بار بہت کم ہیں۔

جو لوگ صنعت الفاظ پر فریفتہ ہوتے ہیں اور لفظی مناسبتوں پر جان دیتے ہیں وہ کسی نیچر حالت کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ یہی جدائی اور ترغار کا بیان **طہر لعل** میں اس طرح کیا گیا ہے۔

شرم اُسکو چاہے آنے لگی بے جاہی کے ناز اُٹھانے لگی ✓
کم وقاری کی قدر بڑھنے لگی چشم تر بھی نظر پر چڑھنے لگی
ٹھنڈی سانوں کا دم نہ بھرنے لگی سوزِ لعلت کا پاس کرنے لگی

وہ گرمی سے سُخِ تمتمایا ہوا وہ رونے سے سُند بھر بھرا ہوا
 وہ سوچی ہوئی بڑیاں اور گال وہ آنکھوں میں ٹورے پڑے لال لال
 غرض کیا بیاں ہو کہ جو حال تھا جو دیکھے وہ رووے یہ احوال تھا
 اگرچہ اس نظم میں اول کی چند بیتوں کے سوا سارا بیان بہت صاف اور نیچرل ہے مگر حسین
 نے شوق سے تقریباً ستر برس پہلے جب کہ زبان اُردو کی ابتدائی حالت تھی، اسی مقام

کا سانس سے زیادہ نیچرل طور پر پابند ہے۔ وہ کہتا ہے۔
 خفا زندگانی سے ہونے لگی بہانے سے جا جا کے سونے لگی
 مٹھرنے لگا جان میں اضطراب لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
 نہ اگلا سا ہنستا نہ وہ بولتا نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولتا
 جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اُسے محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
 کہا اگر کسی نے کہ بیوی چلو تو اٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
 جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
 کسی نے جو کچھ بات کی بات کی پہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
 کہا اگر کسی نے کہ کچھ کھائیے کہا خیر بہتر ہے سن گویئے
 جو پانی پلانا تو پینا اُسے غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے
 نہ کھانے کی سند اور نہ پینے کا ہوش بھر دل میں اُسکے محبت کا ہوش
 کسی نے کہا سیر کیجے ذرا کہا سیر سے دل ہے سیر بھرا

نہ پہلو میں پایا جو اس یار کو ہوا صدمہ اک جان بہار کو
 ذرا یاد بھولی نہ اس ماہ کی جو کروٹ بھی لی دل سے اک آہ کی
 نظر آگیا چاندنی میں جو باغ ہوا تازہ اس غم سے اک دل پہ داغ
 ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی جو چلنے لگی یہ فرقت کی آتش سے جلنے لگی
 سحر تک دل اس کا بھٹکتا رہا کہ پہلو میں کانٹا کھٹکتا رہا
 تصور جو تھا اس گل اندام کا کوئی پہلو نکلا نہ آرام کا
 ترپتی تھی پر سنج جاتا نہ تھا کسی طرح آرام آتا نہ تھا
 خدا کو دے بنیاد اس چاہ کی جدھر پھر گیا منہ اُدھر آہ کی
 کبھی ہو گئے دو نور خار زرد کبھی ہو گئے دست پادو نو سرد
 کبھی رنگ رنج کے بدلنے لگے کبھی شعلے منہ سے نکلنے لگے
 کبھی ضبط وہ چاہ کرنے لگی کبھی چیخ کر آہ کرنے لگی
 کبھی جان جینے سے عاری ہوئی کبھی غش کی صورت سی طاری ہوئی
 نہ پسند آئی ہر گز سحر ہو گئی یہ شب اسکے غم میں بسر ہو گئی
 اڑے آتشیاں سے اپنے پرند ہوئی بانگ اللہ اکبر بلند
 ہوا پھر تو یہ شاہنشاہ کی حال کہ گٹ کر ہو جوں ماہ کامل ہلال
 تلاطم میں شب بھر طبعیت رہی نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی
 بہت آگیا فراق اوقات میں وہ کھینا ہوا جانا ہر بات میں

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے بدن کو چڑائے ہوئے ناز سے
 سنہ آنچل سے اپنا چھپائے ہو بجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
 پینے پینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہو یا سن
 گھڑی دو ملک وہ مہ و آفتاب رب شرم سے پائے بند بجا ب

۵۔ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان غیب کی بیان کی جائے وہ لفظاً اور معنی میں
 عادت کے موافق ایسی ہونی چاہیے جیسی کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے۔ اس موقع پر ہم بطور مثال
 کے شوق اور **میسر حسن** دونوں کی مشنوبوں سے کچھ کچھ اشعار نقل کرتے ہیں۔

شوق جدائی کے زمانہ میں ملکہ کی حالت اس طرح بیان کرتا ہے۔
 نہ رونے سے دم بھر تامل کیا نہ خاصہ بھی دن بھر تامل کیا
 یہ نقشہ چین کا سب بدل ہوا کہ گلزار جو تھا وہ جنگل ہوا
 وہ آتش کہہ سب چین گل کا تھا صدا سوز کی نالہ بلبل کا تھا
 دکھائی دیا یوں نہ نہر و نکاب کہ ملکہ کی گویا ہے چشم پر آب
 تھے رقا صطاوس جو بلبل کے نمونہ تھے ملکہ کے ہر داغ کے
 لگے خوشے جو صبر ستور تھے وہ سب زخم ملکہ کے انگور تھے
 شجر جتنے تھے صوت غم تھے جو تھے سرودہ سنخ لیا تم تھے سب
 صبا نے چین میں اُڑائی تھی خاک دل ملکہ تھا شل گل چاک چاک
 ہوا دن تو رونے میں اُس کا بھر قیامت مگر رات آنی نظر

میں وہاں ہی ہے تو بھی اُسکی گفتگو ایک محض جنبی مرد کے ساتھ ایسی کھلی ڈٹلی اور بے حجابانہ دنیا
 شوق کا اظہار ایسے تقاضے کے ساتھ کہ جس سے دوسرے کو نفرت ہو جائے کس قدر بے عمل اور
 بے موقع ہے۔ پھر وزیر زادہ کی پہلی ہی گفتگو دخت و وزیر کی نسبت ایسی عامیانہ اور عشق کا
 اظہار ایسے بھونڈے پن کے ساتھ۔ اور پھر دخت و وزیر کا پختنیوں کی طرح جواب دینا یہ تمام باتیں
 بلاغت کے بالکل خلاف ہیں۔ میر حسن نے بدر زبیر میں بعینہ ایسے ہی موقع پر یعنی جبکہ پہلی
 پہل بے نظیر۔ بدر زبیر کے باغ میں آیا ہے اور بدر زبیر اُسکو دیکھ کر فریفتہ ہو گئی ہے۔ یوں
 بیان کیا ہے۔

کہ وہ ناز میں کچھ بھپک موند چھپا کمر اور چوٹی کا عالم دکھا

چلی اُسکے آگے سے موند موڑ کر وہیں نیم بیل اُسے چھوڑ کر

ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی پھپھا موند کو اور مسکراتی چلی

”یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں“

یہ کستی ہوئی آن کی آن میں چھپی جا کے اپنے وہ دالان میں

دیا ماتھے سے چھوڑ پردہ شتاب چھپا ابر تار یک میں آفتاب

اس بیان میں شوق کے بیان کی نسبت موقع اور محل کا جیسا کہ ظاہر ہے زیادہ خیال کیا گیا

ہو۔ اسکے بعد عین ملاقات کے وقت بھی میر حسن کے بیان میں شرم و حجاب کا بہت لحاظ پایا

جاتا ہے۔ چنانچہ اُس موقع کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

بزور اُسکو لا کر بٹھایا جو دھال نہ پوچھ اُس گھسٹری کی ادا کا بیاں

سوتوں کے سر پر چاکٹری ہوئی ہیں۔ اور اپنے قہقہے لگائے ہیں کہ وہ جاگ اٹھے ہیں۔ اس وقت شاہزادہ نے جو دیکھا کہ شام ہو گئی ہے وہ وہاں سے چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور بادشاہ شاہزادی اُس سے اس طرح گفتگو کرتی ہے۔

کہا ہنسکے ملکہ نے اے سہیلیں مجھے تیری فرقت گوارا نہیں
مرا کتنا اس وقت کا مان لے نہیں جان دیدوں گی یہ جان لے
خدارا نہ ٹالو مری بات کو یہیں آج رہ جاؤ اب رات کو
اسکے بعد وزیر زادہ ملکہ سے کہتا ہے کہ اگر آپ میری اک عرض قبول کر لیں تو نہ میں سوئے
جدا ہوں گا اور نہ شاہزادہ یہاں سے جائے گا۔ اسکے بعد کہتا ہے۔

کھڑی ہے جو یہ پاس دختِ وزیر حقیقت میں ہے یہ نہایت شریف
انیلا پن اس کا مجھے بھگایا کروں کیا دل اس پر مرا آگیا
مجھے اسکو دیدیجئے گر حضور تو ساری سہ فرنگی ہو جائے دو
یہ شکر دختِ وزیر۔ وزیر زادہ سے کہتی ہے۔

سمجھنا نہ دل میں ذرا بھگ کو نیک سناؤں گی سو گر کہے گا تو ایک
نہ ملکہ کی باتوں پہ معرور ہو ہوا کھا ذرا چل چنے دور ہو
ذرا ہوش کی لے تو اپنے خبر میں جوتی نہ ماروں ترے نام پہ

اول تو عورت ذات۔ دوسرے بادشاہ زادی۔ پھر پہلی ملاقات۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ
شاہزادہ پر بائیل ہو گئی ہے اور اسکو اپنے اوپر بائیل کرنا چاہتی ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ

مقتضائے حال کے خلاف ہیں۔

ایک جگہ جب کہ شاہنژادہ کو غش آگیا ہے اور یہی بڑھیا ملکہ جو اُسکی ماں ہے محل کے اندر گھبرا رہی ہے۔ اور بار بار اُس کی خبر باہر سے منگواتی ہے۔ ایک خواص باہر سے کہتی آئی ہے۔

”لو گو بت لاؤ تو کہاں ہیں حضور کدو کیا بیٹھی کرتی ہوا ہے حور“
پھر تھوڑی دیر کے بعد آؤر نوکریں آکر یہ کہتی ہیں۔

”دوڑ سی دوڑ ہو رہی ہے حضور باہر اندر یہی ہے ذکر اے حور“

دو نو جگہ ایک مصرع میں ملکہ سالخور کو حضور اور دو کے مصرع میں اے حور کنا اور پھر نوکروں کا اور وہ بھی نہایت تشویش کی حالت میں کنا بالکل مقتضائے حال کے خلاف ہے۔
نواب مرزا شوق لکھنوی نے جو چار مثنویاں یعنی بہار عشق، زہر عشق، لذت عشق اور فریب عشق لکھی ہیں۔ اگرچہ انکو روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی جڑبجی کے لحاظ سے میں تمام اردو کی موجودہ مثنویوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن قطع نظر اسکے کہ وہ حد سے زیادہ انورال و خلاف تہذیب ہیں۔ اُن میں بھی مقتضائے حال کے موافق ایراد کلام کا بہت کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً لذت عشق میں اُس موقع پر جہاں بادشاہنژادہ اور وزیرزادہ اپنے ساتھ والوں سے بچھ کر کسی باغ میں دم لینے کو ٹھہرے ہیں اور رستے کی تکان سے ایک چبوترہ پر پڑ کے سو رہے ہیں وہاں اُس شہر کی شاہنژادی جو باغ کی مالک ہے اور اُسکے ساتھ وزیرزادی دو نو باغ کی سیر کو آئی ہیں اور اُن نو

ایک دن بادشاہ حسن آباد
اندر وں محل تھا بادل شاد
محور حوت تھا ست عشرت تھا
اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا
عرض کی اختلاط میں اگر
اُس پر پروئے تھلیہ پا کر
ہو چکی ہیں سلامتی سے جا
لڑکیوں کا نہیں کچھ آپ کو دھیا
ہاں مگر یہ خیال ہے ہر دم
اور باتوں کا تو نہیں کچھ غم
طاقت جسم دے چکی ہے جوب
کہ میں بٹھی ہوئی ہوں پا پہ کاب
اُردو چاروں کی ہوں مہال
سب مہیا ہیں کوچ کے سا
کچھ ہی دن اب سفر میں باقی ہیں
انکاسہر تو دیکھ لیتی ہیں
تیرے کہنے ہی کہتے کیا ہے
بن کے کہنے لگا وہ عالی جاہ
جس کا خود خیال ہے مجھ کو
تیرے جتن بھی کہاں ہے مجھ کو
مبھگو غیروں میں قبول نہیں
اُنے جرنج کچھ حصول نہیں
یہ بھی بالفرض گر کر دل منظور
تو یہ مجھے کبھی نہ ہواے حور

اس تقریر میں بھی کثیر الفاظ بالکل بے محل اور بے موقع استعمال ہوئے ہیں۔ بادشاہ خود
شیخ کافی ہے اور اُسکی ملکہ بھی عجوز سا بخورد ہے۔ وہ خود جاسا کہتی ہے کہ میں پادور کا بیٹی
ہوں یا ورچیاں ہوں اور چنیں ہوں۔ باوجود اسکے ایسے الفاظ استعمال کرنے کہ ”اپنی بی بی“
سے گرم خلوت تھا یا محور حوت اور ست عشرت تھا۔ یا اُس پر پروئے یعنی بڑھیا نے اختلاط
اگر عرض کی۔ یا بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اسے ماہ اور کہیں اسے حور کہنا یہ سب باتیں

کہ میں سلطان خسرواں ہوں آج
 بگشتا ہوں میں افسر قدیم
 میرے قبضے میں ہیں کئی ایام
 وہ مراد باد ہے اور بدولت
 بھگود ہی ہے خدائے ملاقات
 آج چاہوں تو بان دے قاریاں
 زور دکھلانے پر ہیں آؤں اگر
 میں دلاور وہ ہوں ہر شاک
 سرکش آگے پاؤں پستہ تیا
 ہاک پر ہے رگڑتے ہیں

اس بیان کی بے ربطی بھی ظاہر ہے کہ وزیر نے جس بادشاہ کی طرف سے نسبت کو بیان کیا ہے
 اور جس کا منصب عجز و انکسار کرنے کا ہے۔ انکی طرف سے ایسی مقبول گئیہ بیکیاں کیا
 اسکے بعد جب وزیر حسن آباد شیدا کی تقریر کر کے نے بادشاہ کے پاس واپس گیا ہے
 اور وہاں جا کر اُسے شیدا کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہ اُسے جواب میں

کہتا ہے۔

ہاں کہو جلد فوج ہوتیار
 مابدولت کے لاؤ تو ہتھیار

دیکھیں تو کتنا حوصلہ ہے اسے
 ہمسے غم مقابلہ ہے اسے
 لوہا دکھلانے کو یہ آیا ہے
 ہس کو کیا موم کا بنایا ہے
 کثرت فوج پر یہ بھولا ہے

بادشاہ اسکا کیا ہے یہ کیا ہے
 یہ تمام تقریر ایسی سبک اور کم وزن ہے کہ ہرگز کسی بادشاہ کے مونہ سے زیب نہیں دیتی بلکہ

ایرا دہیں کیا گیا۔ تاریخ کے بیان میں مؤرخ خود واقعات کے قبضہ میں ہوتا ہے اور قصہ میں واقعات اُس کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ تاریخ میں جس واقعہ کی صحت بخوبی ثابت ہو جائے اُس کی جواب دہی مؤرخ کے ذمہ باقی نہیں رہتی بہتہ اُس کا یہ فرض ہے کہ اُس کے سبب کا تفحص کرے اور بتائے کہ کیوں ایسا واقعہ ہوا۔ بخلاف قصہ کے کہ اُس کے بیان میں جو بے ربطی پائی جائے گی اُس کا ذمہ دار خود قصہ کا بنانے والا ہے۔ اول تو نسبت کے پیغام کو پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے طے نہ کرنا اور دفعۃً وزیر اور شاہزادہ کے ساتھ ایک لشکر جرار روانہ کر دینا پھر وزیر کا فوج کشیر لیکر اور مہینوں کا رستہ طے کر کے حسن آباد کی شہر پناہ تک پہنچ جانا اور بادشاہ حسن آباد کو اُس کے حال اور اُس کے ارادہ کی مطاق خبر ہونی پھر اُس کا حال دریافت کرنے کے لیے بادشاہ کا وزیر کو مع فوج کشیر کے بھیجنا پھر وزیر کا بادشاہ کی طرف سے مہمان کے ساتھ ایسی گفت کو کرنا جیسی کہ بازار یوں میں ہوتی ہے یعنی یہ اگر کچھ اور ارادہ ہو تو میں اُس سے بھی باہر نہیں ہوں میں بس اتنی ہی راہ دیکھتا تھا اب یہ کیا ہے بسم اللہ بالکل مقتضائے مقام کے خلاف ہے۔

اس کے بعد **شیدا** وزیر۔ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے نسبت کا پیغام دینے کے بعد کہتا ہے

جاہ و شمت کا کچھ اگر ہو خیال	تو یہ چاہا ہے اے ہمایوں فال
آپ ہیں اپنے شہر کے سلاطین	بندہ ہے تاج بخش باج ستا
دل میں انصاف کیجئے تو صریح	ہر طرح سے ہے بندہ کو ترجیح

خبر آمد کی اُسکی عام ہوئی خلق و ہشت زدہ تمام ہوئی
 اتنے میں تمہاں کے شہر پار گئی خبر اُسکے ورود کی گذری
 کہ کسی شہر کا کوئی سردار لیکے ہمراہ لشکر بیا
 اُسکے اُتر ہے قرب شہر پنا مستعد جنگ ہے وہ ذی جا
 سنتے ہی وہ کمال گھبرا یا وزرا کو بلا کے فرمایا
 دیکھو تو کس کا لشکر اُتر ہے کون ہم پر غنیم آیا ہے
 الغرض اک وزیر بات دبیر اپنی ہمراہ لیکے فوج کشیر
 تھا فروکش جہاں وہ ہم پایہ وجہاں ملاقات کے لئے آیا
 سنتے ہی پاس یہ کیا اُس نے بے تکلف بلایا اُس نے
 تالپ فرش لینے کو آیا ملکے پہلو میں اپنے بٹھلایا
 پہلے تو ذکر ادھر اُدھر کیا بعد اک طور سے یہ اُس نے کہا
 کہ جہاں دار جو ہمارا ہے اُس فلک قدر نے یہ پوچھا ہے
 آپنے کی ہے کیوں دھڑکلیف کس ارادہ پہ لائے ہیں تشریف
 سیر کا عزم ہے تو گھر ہے یہ ہر مسافر کا رہنما ہے یہ
 دل میں گراور کچھ ارادہ ہو تو میں باہر نہیں ابھی آؤ
 فقط اتنی ہی دیکھتا تھا میں اُ دیر پھر کس لئے ہے بسم اللہ

اس بیان میں قطع نظر لفظی کمزوریوں کے بڑی کسر یہی ہے کہ کلام مقتضائے حال کے موزون

مطالب ایسی صفائی سے ادا کیئے جائیں کہ اگر انھیں مطالب کو شریں بیان کیا جائے تو
شرکاً بیان نظم سے کچھ زیادہ واضح اور صاف اور مربوط نہ ہو۔ البتہ نظم کا بیان شری سے ضرر
استقدر ممتاز ہونا چاہیے کہ نظم کی طرز بیان شری سے زیادہ موثر اور دلکش و دلاویز نہ ہو۔

پیش تنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب
ایسی بنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں
جلی جائے اور دونوں کے بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت متقدّر
نہ مانی جائے تب تک کلام جیسا کہ چاہیے مربوط اور مستظم نہ ہو مثلاً **گلزار نسیم** میں کہتا ہے
”خوش ہوتے تھے طفلِ رحیمیں ہے ثابت یہ ہوا ستارہ ہیں سے“
”پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سیکھے گا کسی کو“

جو مطلب کہ صاحبِ تنوی ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ”لوگ تو اس طفلِ رحیمیں کو
دیکھ کر خوش ہوتے تھے مگر بچہ میوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ یہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر
یہ ایسا پیارا ہے کہ اسکو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکتیگا کیونکہ اسکو دیکھتے ہی بینائی جاتی رہیگی“
ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کہ کئی لفظ بڑھائے اور کئی لفظ بدلے نہ جائیں
تب تک یہ مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا۔ اور پہلا
مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا یا مثلاً
اسی تنوی میں ہے۔

”نور آنکھ کا کہتے ہیں پر کو چشما تھی نصیب اس پدر کو“

حال بھی جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اس زمانہ کے متفقین اور مذاق سے ہمراہ و تراویق
بقیہ تر ہے۔ جو قصے ان مشنویوں میں بیان کیے گئے ہیں ان میں قطع نظر اسکے کہ بیان
اور فوق العادہ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے۔ اکثر مشنویوں میں شاعری

فرائض بھی پورے پورے ادا نہیں ہوتے۔ مشنوی میں علاوہ ان فرائض کے جو غزل یا
قصیدے میں واجب الادا ہیں کچھ اور شے لفظ بھی ہیں جن کی مراعات نہایت ضروری ہے
از انجملہ ایک لفظ کلام ہے جو کہ مشنوی اور سہر سہر مسلسل نظم کی جان ہے۔ غزل و قصیدہ میں
ایک شعر کو دوسرے شعر سے جیسا کہ ظاہر ہے کچھ ربط نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ بخلاف مشنوی

کے کہ اس میں ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہیے جیسے رباعی کی ہر کڑی کو
سری کڑی سے ہوتا ہے اسی لئے جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے
نئے مشنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں ہو سکتے۔ باورچیوں میں یہ مقولہ مشہور
ہے کہ پھلی پکانے والے سے دیگ اچھی نہیں پک سکتی۔ جو نسبت پہلی کو دیگ کے
ساتھ ہے وہی نسبت غزل کو مشنوی کے ساتھ ہے۔ جس طرح پہلی پکانے والے کو دیگ
ساتھ ہے وہی نسبت غزل کو مشنوی کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ پہلے طرح جو لوگ غزل میں منہمک ہو جاتے
کے منہمک پانی اور آئینہ کا اندازہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ یہی طرح جو لوگ غزل میں منہمک ہو جاتے
ہیں اور ان پر غزلیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے وہ مشنوی کی ترتیب اور نظام سے اکثر
عہدہ برآ نہیں ہوتے۔

جس نظم میں کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی فرضی قصہ بیان کیا جاتا ہے اس میں منہمک
آفرینی اور بلند پروازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ

کے ساتھ طے کر جائے مثلاً شاہنامہ میں جہاں رستم اور سہراب کو لڑایا ہے وہاں فردوسی یا اس قصہ بنانے والے کو دو متضاد باتیں ثابت کرنی منظور ہیں۔ ایک سہراب کا رستم سے بہت زیادہ قوی اور تیز و مند رہنا۔ دوسرے رستم کے ہاتھ سے آخر کار اُسکو قتل کرنا۔ پہلی بات تو اُسے اس طرح ثابت کی ہے کہ پہلے مقابلہ میں سہراب رستم کو کچھڑ دیا ہے مگر اب دوسری بات بغیر کچے ثابت نہیں ہو سکتی کہ رستم میں غیر معمولی طاقت خود بخود پیدا ہو جائے۔ پس اس غرض کے لئے یہ بات گھڑی گئی کہ رستم نے جوانی میں جبکہ وہ اپنی طاقت اور زور سے تنگ آگیا تھا خدا سے دعا کی تھی کہ میری طاقت کم ہو جائے۔ چنانچہ اُسکی اصلی طاقت بہت کم ہو گئی تھی اب سہراب کے مغلوب ہو کر اُسے پھر دعا کی کہ میری اصلی طاقت مجھ کو بجا چنانچہ اُسکی اصلی طاقت جو خدا کے ہاں امانت رکھی تھی اُسکو واپس مل گئی اور دوسرا تیسرا مقابلہ میں وہ سہراب پر غالب آگیا۔ لیکن اس زمانہ میں ایسے ڈھکوسلوں سے کچھ کام نہیں چلتا آج کل کسی کو ایسا مرحلہ پیش آئے تو وہ اُسکو اس طرح طے کر سکتا ہے کہ رستم جو کسی سے مغلوب نہ ہوا تھا اور جسکی شہرت تمام ایران اور توران میں ضرب المثل تھی۔ ایک لوٹڈے کے ہاتھ سے پچھڑ کر اُسکی غیبت سخت جوش میں آئی اور اپنی عمر بھر کی ناموری اور عزت قائم رکھنے کا ولولہ اُسکے دل میں نہایت زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ گو وہ طاقت میں سہراب کے بہت کم تھا مگر سپہگری کے کرتبوں اور تجربوں میں سہراب کو اُس سے کچھ نسبت تھی۔ لہذا دوسرے یا تیسرے مقابلہ میں جوش غیرت اور پاپس عزت اور فن سپہگری کی مشافی سے اُسے سہراب کو مار رکھا۔ رہی یہ بات کہ حنلاقی مضامین جو اکثر قدیم زمانہ کے نامور شعرا نے سو پر نچرل باتوں کے

مطلب یہ ہے کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے لئے
 ظلمت تھا پس جب تک دو سرے مصرع کے الفاظ بدلے نہ جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا
 ”آتا تھا شکار گاہ سے شاہ نظر آ رہا کیا پدر نے ناگاہ“
 یہ دونوں مصرعے بھی مربوط نہیں ہیں کیونکہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاہ اور شخص
 اور پدر اور شخص ہے حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے پس دوسرا مصرع یوں
 ہونا چاہیے ”بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ“۔
 ۱۔ بہر حال شنوی میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا خاصا کج رہے کہ اُنہیں تاریخ یا قصہ بیان

کیا جائے نہایت ضرور ہے۔
 ۲۔ دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ جو قصہ شنوی میں بیان کیا جائے اُسکی
 بنیاد ناممکن اور فوق العادہ باتوں پر نہ رکھی جائے۔ اگرچہ قصوں اور کہانیوں میں ایسی باتیں
 بیان کرنے کا دستور نہ صرف ایشیا میں بلکہ ہم و بیش تمام دنیا میں قدیم سے چلا آتا ہے
 اور جب تک کہ انسان کا علم محدود تھا ایسی باتوں کا اثر لوگوں کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ
 ہوتا تھا۔ لیکن اب علم نے اُس ظلم کو توڑ دیا ہے۔ اب بچائے اسکے کہ اُن باتوں کو لوگوں کے
 دل پر کچھ اثر ہو اور اُن پر ہنسی آتی ہے اور انکی حقارت کی جاتی ہے اور بعض اسکے کہ اُن سے
 کچھ تعجب پیدا ہو شاعر کی حماقت اور سادہ لوحی معلوم ہوتی ہے۔ اب شاعر یا ناولسٹ
 کی یاقوت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ جو مرطے پہلے محالات کے ذریعہ سے طے کیے جاتے
 تھے اور جن کا عاودہ ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ انکو علم اور فلسفہ کے موافق نہایت آسان

”رات دن جگمگاتا ہے میلا ہے مہر و مہ کا کٹورا بجتا ہے“

یاشنآ ایسے بازار کی نسبت ایک تو یہ کہنا کہ ”وہاں چھڑ کاؤ سے ہر وقت زمین خم رہتی ہے“ اور ایک یہ کہ ”وہاں گلاب اور کیوڑے کا نہیں بلکہ آب گوہر کا چھڑ کاؤ ہوتا ہے“ پس آج کل ایسے مبالغے باعث شرم سمجھے جاتے ہیں۔ اور بجائے اسکے کہ اُنے سامع کے دل پر کوئی نقش بیٹھے یا شاعر کی لیاقت ظاہر ہو اُسکی لغویت اور بے سلیقگی پائی جاتی ہے۔

۴۔ متضادے حال کے موافق کلام ایراد کرنا خاص کر قصہ کے بیان میں ایسا ضروری ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بلاغت کا بھید صرف اسی بات میں چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت وسیع بحث ہے مگر ہم یہاں صرف چند مثالیں دیکھیں اس مطلب کو ناظرین کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔

مثلاً ثنوی طلسم لفت میں اُس موقع پر جب کہ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے شیدائے اپنے شہزادہ کے لیے نسبت کا پیغام لیکر شہر حُسن آباد میں شامانہ جاہ و حشم کے ساتھ پہنچا اور حُسن آباد کے بادشاہ نے اُسکے آنے کی خبر سنکر اپنے وزیر کو اُس سے گفتگو کرنے کے لیے بھیجا ہے وہاں صاحب ثنوی اس طرح بیان کرتا ہے۔

جاتے ہی اُسے قرب شہر نہاہ خیمہ اپنا کیا بشوکت و جاہ

بکہ دانائے روزگار تھا وہ مرد میدان کا زرار تھا وہ

رُعب پہلے ہی سے بٹھانے کو صولت و دبیدہ دکھانے کو

کی اُسی روز شکر آرائی کثرت فوج سب کو دکھلائی

پیرایہ میں بیان کیے ہیں یا ابشایستہ ملکوں میں بیان کرتے ہیں یہ ایک دوسرا عالم ہے
 انکا مطلب ایسے پیرے ختیا کرنے سے اخلاقی نتائج نکالنے اور کلام کو تعجب انگیز کر کے
 اُس میں اثر پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ ناممکن باتوں کا لوگوں کو یقین دلانا اور اُن کو واقعات کا
 لباس پہنانا یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص جانوروں کے پیرایہ میں خصائل انسانی ظاہر
 کرتا ہے۔ اور اُن سے اخلاقی نتائج استخراج کرتا ہے اور دوسرا شخص بغیر اس مقصد کے
 جانوروں کی حکایتیں طے سوج بیان کرتا ہے کہ گو یا وہ اُن میں فی الواقع تمام خصائل انسانی
 ثابت کرنا اور لوگوں کو انکا یقین دلانا چاہتا ہے۔ اس میں اور اُس میں بہت بڑا فرق ہے پس
 بے سرو پا قصے لکھنے سے خاص کر اس زمانہ میں حیناب کرنا چاہیے۔

۳۔ مبالغہ کو اہل بلاغت نے صنائع معنوی اور محسنات کلام میں شمار کیا ہے۔ مگر افسوس کہ
 اُس کی کئی بڑھتے بڑھتے اب وہ اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ کلام کو بے قدر و سبک اور کم وزن
 کر دیتا ہے۔ اتنا سے اتنا درجہ کا مبالغہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو کچھ کسی چیز
 کی تعریف یا بوج یا ذم میں کہا جائے گو وہ اُس چیز کے حق میں صحیح نہ ہو مگر کسی نہ کسی چیز پر
 صادق آسکتا ہو۔ نہ یہ کہ دنیا میں کوئی چیز اُسکی مصداق نہ ہو۔ اور مبالغہ کی غایت یہ ہوتی چلائی
 کہ جو مطلب بیان کرنا منظور ہے مبالغہ کے سبب اُسکا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت
 کے ساتھ ہو۔ نہ یہ کہ اُسکا راسخا یقین بھی جاتا رہے۔ مثلاً کسی پر رونق بازار کی نسبت ایک
 تو یہ کہنا کہ ”وہاں صبح سے شام تک کٹورا بچتا ہے“ (اگرچہ وہاں کسی وقت بھی کٹورا
 نہ بچتا ہو) اور ایک اُسکی تعریف اس طرح کرنی۔

اور قافیوں کی نشست اور روزمرہ کا سرشتہ ماتھ سے نہ جائے ہر شخص کا کام نہیں ہے
ترجیع بند بھی مسلسل مضامین کی گوں نہیں ہے۔ کیونکہ اُس میں ہر بند کے آخر
وہی ایک ترجیع کا شعر بار بار آتا ہے جو سہ کلام کو منقطع کر دیتا ہے ترکیب
کے اگر تمام بندوں میں بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی ہی دقت پیش آتی ہے
کیونکہ اُس کے ایک بند میں صرف ایک پوائنٹ عم کی سے بیان ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر پوائنٹ
کی وسعت یکساں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہوتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے
بڑے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک بند دو تین بیت کا ہو اور دوسرا پندرہ میں بیت کا۔ اور
بات اُس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزو خطیم ہے۔

الغرض حبشی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں اُن میں کوئی صنف
سلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مشنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے
جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ عرب کی شاعری
میں مشنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں
ظاہر ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جاسکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی
ہیں۔ اسی لئے عرب شاپنامہ کو قرآن مجسم کہتے ہیں۔ اور اسی لئے مشنوی معنوی کی
نسبت ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ کہا گیا ہے۔

اردو میں چند چھوٹی چھوٹی عشقیہ مشنویوں کے سوا اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں ظاہر
آج تک کوئی چھوٹی یا بڑی مشنوی کسی مسلم الثبوت اُستاد نے نہیں لکھی عشقیہ مشنویوں کا

بے لاگ مرثیوں اور کوخل میں ہوتا ہے۔ سیواسطے ہمارے قدیم شعرا کا خمیر عرب کی خاک
 پاک سے تھا جب کوئی برگزیدہ آدمی قوم میں سے اٹھ جاتا تھا اس کے مرثیے ویسے ہی شوق اور جوش
 و خروش کیساتھ لکھتے تھے جیسے کہ کسی زندگی میں جہیہ قصیدہ انشا کرتے تھے۔ ہر ایک کے مرثیوں
 پر شعرا بر قبیل کیے جاتے تھے مگر لوگ ان کے مرثیے لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ معن بن اند
 کا مرثیہ لکھنے پر خلیفہ وقت نے ایک شاعر کو کمال حیرت کیساتھ دربار سے نکلوا دیا۔ اسپر بھی اس کے
 بیشمار مرثیے لکھے گئے۔ ابو اسحاق صابی کا مرثیہ علم کے شریف مرتضیٰ نے باوجود اختلاف
 نہ ہر کے ایسے سوز و گداز کے ساتھ لکھا ہے جیسے کوئی اپنے عزیز و یگانے کی موت پر افسوس
 کرتا ہے اور اس کے علم فضل کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ یہی طرح ہزار ہا مرثیہ اہل علم اہل کمال
 بہادروں۔ فیاضوں۔ نیکوں۔ بادشاہوں۔ ملایق و زریروں اور دیگر ممتاز لوگوں کی وفات پر لکھا

گیا ہے۔

مرثیہ

لیکن جو شخص مرثیہ لکھنے میں کمال حاصل کرنا چاہے۔ اس کے لیے اس
 نئی طرز کے مرثیہ سے بہتر کوئی رہنما اردو شاعری میں نہیں مل سکتا۔ جو باتیں ان بزرگوں کے
 کلام میں مرثیت کی شان کے برخلاف ہیں اگر ان سے قطع نظر کر جائے تو طالب فن کو اس سے
 نہایت عمدہ سبق مل سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قصیدہ اول تو اردو میں بمقابلہ
 فارسی اور عربی کے اس قدر کم لکھا گیا ہے کہ گویا بالکل نہیں لکھا گیا۔ دوسرے اس کا کوئی نمونہ
 اردو میں ایسا نشان نہیں دیا جاسکتا جس کے قدم قدم چلنا چاہیے۔ اول سودا اور آخر ذوق
 صرف یہ دو شخص ہیں جنہوں نے ایران کے قصیدہ گوئیوں کی روش پر کم و بیش قصیدے

جو ایک کو دوسرے کیساتھ ہوتی جتنے اور بے ریا عظیم جو ایک۔ دوسرے کی نسبت کرتا
 اُسکے اظہار کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ حمد و خواجہ علم میں بنجر سوتا ہو اور اُس سے
 کسی نفع کی امید یا ضرر کا خوف باقی نہ رہا ہو اب اگر شاعر کا دل فی الحقیقہ علائقِ دنیوی سے
 ایسا پاک ہے کہ مقربانِ درگاہ الہی کے سوا کسی کی موت سے متاثر و متغیہ نہیں ہوتا۔ اُسکو
 اکابر و ناموس کے مرثیے لکھنے کی تکلیف دینی بلاشبہ تکلیفِ مالایطاق ہوگی۔ لیکن اگر اُسکے
 پہلو میں ایسا پاک دل نہیں ہے بلکہ وہ عام انسانوں کیساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور دنیا و داروں کی
 موت پر بھی اُسکا دل سچا ہے تو اُسکو اپنی فطرت کا مقتضی ضرور پورا کرنا چاہیے۔

یہ سچ ہے کہ جناب سید الشہداء اور اُنکے عزیزوں اور ساتھیوں کے آلامِ مصائب
 کا بیان بشرطیکہ اُس میں بناوٹ اور تصنع اور صنعت شاعری کا اظہار نہ ہو ایک مسلمان کے
 ایمان کو تازہ کرتا ہے۔ اور اُس سے خاندانِ نبوت کیساتھ مرثیہ محبت و خلاص جو کہ اسلام
 کی جڑ ہے مضبوط ہوتا ہے۔ اور اُنکے بے نظیر صبر و استقلال کی پیروی کرنا سابقِ جاہل ہوتا ہے
 لیکن جس طرح ان تمام باتوں کی ضرورت ہو اسی طرح قوم میں قومیت کی روح پھونکنے کی بھی ضرورت
 ہو اور وہ اسی طرح پھونکی جاتی ہے کہ قوم کے افراد میں ایک خاندان کے ممبروں کے دوسرے
 کیساتھ ہمدردی کریں۔ اُنکی مساعیج میں اُنکی قدر کریں۔ اُنکے نیک کاموں میں تعین و مددگار ہوں
 زندگی میں اُنکی نیکیوں کو چکائیں۔ اُنکے کمالات کو شہرت دیں اور مرنے کے بعد اُن کی
 ایسی یادگاریں قائم کریں جو صفحہ ہستی سے کبھی مٹنے والی نہوں۔ یہی قصیدہ جو حمد و جہ کی
 زندگی میں لکھے جاتے ہیں انہیں اُنکی خوبیوں کا ایسا ثبوت نہیں ہوتا جیسا کہ اُسکے مرنے کے بعد

اول تو یہ امید نہیں کہ اس خاص طرز میں اب کوئی شخص اُنکا سا کمال حاصل کر سکے۔ دوسرے
 مرثیہ میں ^{لڑنا} نرم و نرم اور فخر و خود ستائی اور سراپا وغیرہ کو دخل کرنا ایسی ہی تہیدیں اور توہینیں
 بانڈھنے۔ گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں ناز و خیا لیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور
 شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں اور عینہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص
 اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہارِ حزن و ملال کے لئے سوچ سوچ کر نگیں اور مسیح فقرے
 انشاکرے۔ اور بجائے حزن و ملال کے اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار کرے ہم یہ نہیں کہتے
 کہ مرثیہ کی ترتیب میں مطلق فکر و غور کرنا اور صنعت شاعری سے بالکل کام لینا نہیں چاہیے
 بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو شاعری کا سارا کمال زبان کی صفائی و مضمون کی سادگی
 و بے تکلفی۔ کلام کے موثر بنانے اور آواز کو آند کر دکھانے میں صرف کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ
 اشعار جو بے انتہاف کرد و غور اور کاٹ چھانٹ کے بعد مرتب ہوئے ہیں ایسے معلوم ہوں
 کہ گویا بیاختہ شاعر کی قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ تیسرے مرثیہ کو صرف اقلہ کر بلا کے ساتھ
 مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دُھراتے رہنا اگر محض بہت حصولِ ثواب ہو تو
 کچھ مضائقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ وسیع ہونے چاہئیں۔
 کے معنی ہیں کیسی موت پر جی کرنا اور اُس کے محامد و محاسن بیان کر کے اُسکا نام دنیا میں نہ
 کرنا۔ پس شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے اُسکا یہ فرض ہونا چاہیے کہ جب کسی کی موت
 سے اُسکے یا اُسکی قوم یا خاندان کے دل کو فی الواقع صدمہ پہنچے اُس کیفیت یا حالت کو
 جہاں تک ممکن ہو درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے۔ کیونکہ خالص محبت

ایک خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبی کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے باوجودیکہ
 دشمنوں کا ساتھ دینے میں اُسکو ہر طرح دولت و جاہ و منصب کی توقع ہے اور اُسکا ساتھ چھوڑنے
 میں جان و مال و خاندان کی تباہی کا یقین ^{ہے} واثق ہے۔ جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے وہاں کوئی
 ترغیب یا تقریب ایسی نہیں جو اُسکا دل ظلم و بے دردی و بے دینی اور حب جاہ و ثروت سے
 ہٹا کر رحم و بہادری و دینداری کی طرف مائل کر سکے اُسکو ہر طرف سے ہی آواز آتی ہے کہ جلد قتل
 جمیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اُتار دینے، عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے لیجئے اور
 حاکم سے چلکر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسرے طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا
 جسکے لالچ میں وہ ان تمام فائدوں سے قطع نظر کر کے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے بلکہ خلاف
 اُسکے طرح حکمی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ بالآخر وہ تمام دنیوی منفعتوں اور ^{مصلحتوں} ^{مصلحتوں}
 پر خاک ڈالکر ان ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نصرت میں اپنی جان دینے کو فوراً غلطی سمجھتا ہے
 اور سب سے پہلے خاندان نبوت پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔

چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبی کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دل کے
 مقابلہ میں استقامت و قیامت ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے گشتہ
 اور تحریف پاتے ہیں۔ خود اُسکے ساتھیوں اور رفیقوں کو اُٹھائے راہ میں اُسکا ساتھ چھوڑ
 چھوڑ کر اور اُنھیں چڑا کر جاتے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے لیے اُسکا ساتھ دینے میں کوئی نفع ^{جل}
 اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سمجھتی بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اُسکی رفاقت کی بدولت بھوک
 اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آرہی ہے۔ نہ کوئی رشتہ ہو نہ قربت ہی جو اُس کی

ہیں کو کیا مونہ دکھاؤنگا یہ چچا گو خود بھی تین دن کی پیاس سے بیقرار ہے مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن پیاسی تہیجی کی بے قراری کی سطح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ شکیزہ گلے میں ڈال اور جان تھیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا دریا میں گھوڑا جاڑا لٹا ہے دریا کا سردار و شیر پانی لہریں مار رہا ہے۔ اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے۔ دل قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ دوپہلے پانی میں پیاس ٹھکتی ہی مگر غیرت اور حیثیت اجازت نہیں دیتی کہ ننھے ننھے بچوں کی پیاس ٹھکنے سے اپنی پیاس ٹھجالے۔ وہ شکیزہ بھر کر اسی طرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے تاکہ جلدی جا کر بچوں کے خشک طاق میں پانی چوڑے۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے ہیں۔ سپر بھی اس کو اپنے بازو کا کچھ خیال نہیں۔ اگر ہے تو شکیزہ کی فکری کہ مبادا پانی ضائع ہو جائے اور بچے پیاس سے بچاں وہ سب حربے اپنے اوپر لیتا ہی مگر شک ہے آنچ نہیں آنے دیتا جب تک کہ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا۔

بی بیوں خاوندوں کو اور ماتیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی اور مونہ سے سانس تک نہیں نکالتی صرف اس خیال سے کہ جس مہربانی اور سرپرستی ^{Patron} کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں اُسکے دل میں آئے اور وہ اپنے دل میں ہمے عجوبے ہو رہے اُسکی اور اُسکی اولاد کی خیر منائی ہیں اپنے بچپڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی۔

دو صغیر بن بھائی ہیں جو صرف اس قصور پر کہ نبی کے نواسے کے رشتہ دار ہیں حاکم کے حکم سے وجہ قتل ٹھیرے ہیں۔ جلاد دونوں کے سر پر تلوار تلے کھڑا ہے۔ بڑا بھائی مٹیوں کرتا ہے کہ پہلے میرا تار۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ پہلے مجھے وار کر۔

چھائی ہوئی ہے۔ مگر انہیں سے کوئی چیز اس کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی وہ کہہ راج کی طرح اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔ اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔

وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے اور نواسے کے خون کی پیاسی ہے جو چند نفوس کے مقابلہ کے لئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ لے کر آتے ہیں اور اپنی تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں کہ جو ایذا میں اور کلیف میں آدم سے تا ایندیم کسی ذی روح نے کسی ذی روح کو نہیں دیں وہ سب اپنے نبی کے دب بندوں اور جگر کے ٹخروں پر ختم کیا ہیں جو حرص و طمع کے نشے میں دین۔ ایمان۔ رحم۔ انصاف۔ آدمیت۔ ہمدردی اور تمام فضائل انسانی سے دست بردار ہو کر خدا کا گھر ڈھالنے یعنی خاندان نبوت کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر تیار اور مکر بستہ ہیں۔ یہ انکو بد عادت ہے۔ نا انجی شکایت کرتا ہے۔ نہ اپنے غصے ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جنکے ماننے کا وہ دعوے کرتے ہیں انکو جاتا ہے۔ اور انکے فرائض جو خاندان نبوت کیا تھے انکو بجا لانے چاہئیں انھیں یاد دلاتا ہے۔

چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دلیں یہ اُمنگ ہے کہ سب پہلے میں اپنی جان خاندان پر نشان کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آماج میں بھائی بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے ہوں جگر بند کو چھونک دوں۔ بھائی۔ بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار اور یہ ان جنگ کا خواہش تھا ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا ذریعہ ^{قربانی} سب سے پہلے میں ہوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کر دے۔ بھائی اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مار گئے تو

سارا کتب باتین روزه سے پیاسا ہے۔ اُسکے ہاتھ نہ تھے سچے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں
اور یہ سب کچھ اسی لیے ہو کہ وہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ بالہ نہ وہ اپنے ارادہ
اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے

پر سب سے بڑا ثابت قدم ہے۔ کسی سخی اور کسی مصیبت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے
اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے

میں اپنا اور سب غریبوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ خیمہ اور سب کا لٹنا یا قیام نہ کرنا
اسی ہونا۔ عورتوں کی بے روائی اور بادیہ چالی۔ یہ سب کتب گویا آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں
مگر وہ ان سب کو گوارا کرتا ہے اور ہر سب سے بہت اُسکے ہاتھ پر بیعت سے اُسکے ہاتھ پر بیعت سے

بیعت کرے اور اسکی حکومت کو تسلیم کرے۔
وہ اپنے بھائی بیٹے بھتیجے اور بھانجوں کو نہایت ٹھہرنا کے ساتھ صلح اور آراستہ کرے

ایک ایک کو نہروں کیساتھ لڑنے کے لیے بھیج رہا ہے اُسکے بازو تلواروں سے کٹتے اُنکے
کلچے برچھپوں سے چھداتے اور اُنکی چھاتیاں تیروں سے چھتے دیکھتا ہے۔ ایک ایک کی

لاش کا ندھے پر رکھ کر لاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے زمین میں دفن کرتا ہے۔ خیمہ میں عورتوں
کرام سے ہر وقت ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی۔ بیٹی اور بہنوں کی دلخوشی و غم میں وہیں

ناسور ڈال رہی ہیں۔ چھ مہینے کا شیر خوار بچہ اپنے رحم کا تیر کھا کر گود میں مرغ بن گیا۔ کھانسی کی طرح تڑپ
رہا ہے۔ اُسکے حلق سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آچکے ہیں اور بچہ بھی

کوئی دم کا دھماکا نہیں آتا۔ اب سب بلاؤں کا سامنا ہے اور مصائب آفات کی گھنٹہ گھنٹا چاروں طرف
کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ اب سب بلاؤں کا سامنا ہے اور مصائب آفات کی گھنٹہ گھنٹا چاروں طرف

اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر حنلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک
اُردو شاعری میں حنلاقی نظم کہلانیکا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام ٹھیکر سکتا ہے بلکہ جس ^{علی}
وجہ کے حنلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیے ہیں انکی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں
بھی وہ شکل سے ملے گی۔

فضائل حنلاق کا نمونہ اس سے اعلیٰ اور بشرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے
نبی کا نواسہ آگے ہر مسلمان کا سر جھکنا چاہیے تھا اور جو کونے بے انتہا امیدیں مہونی چاہیں
تھیں وہ چند غریبوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ گیتان
کی تو اور گرمی ہے۔ عورتیں صغیرین بچے اور سارے کنبہ باہمراہ ہے۔ مدینے سے کوفہ تک مہنبل کی
راہ طے کرنی ہے۔ جو احوال و نصائر بکر ساتھ چلے تھے انھیں سے چند کے سوا سب اتھ چھوٹ
چھوڑ کر چل دیے ہیں جن لوگوں نے متواتر خطا و پرچہام بھیج کر اور خدا و رسول کو درمیان دیکر
نصرت و یاری کے وعدوں پر بلایا تھا وہ انکو اگر کیکلم منحرف و برکتہ پاتا ہے۔ اور تمام اُمیدیں
مبطل بہ یاس ہو گئی ہیں۔ ^{خدا کی برکتی ہے} ^{بہ ایمان} وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے
ارادہ پر ثابت قدم ہے جس شخص کی تباط کو وہ ملک اور قوم اور دین کے حق میں ایک مرض
مہلک سمجھ کر انکی ہریت سے انکار کر چکا ہے۔ باوجود ان تمام شائد کے اپنے انکار پر اسی طرح
تاکیم ہے۔

دشمنوں نے کانا اور پانی سب بند کر رکھا ہے اور دریائے فارت آنکھوں کے
سانے بہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے گدھے اور اونٹ تک اس سے سیلاب جتنے میں گزر سکا

مرثیت کے علاوہ بیچ اور تیراج۔ ^{میراث} فخر و مہمانات۔ ^{میراث} رزم اور نرم بھی نہایت مشہور و مکینا تھے۔ شاعر
 ہو گئی۔ مگر حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ اس طرز
 میں سب سے پہلے جہانگیر جاکو معلوم ہے۔ ضمیر نے مرثیے لکھے ہیں۔ گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں مگر
 میر انیس نے کہ باوجود خدا واد مناسب کے چارہشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُنکے خاندان میں چلی
 تھی۔ اس پر اردو زبان کے مالک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اس طرز کو میراج کمال تک پہنچا دیا اور
 اردو شاعری میں جو کہ مار مار کر کی طرح مدت سے بے حس حرکت رہی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا
 اگرچہ سوسائٹی کے ذہان اور کم عیار حریفوں کے مقابلہ نے میر انیس کو ہر جگہ جادہ استقامت پر
 قائم رہنے نہیں دیا بلکہ اُس نے مُحَرِّق کی طرح جسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لیے کبھی
 کبھی بارہ ماسا اور چوبو لے بھی لایا اپنے پڑتے میں کیش۔ مبالغہ و اغراق کی آئندہ صوبوں کے طوفاں
 اُٹھانے پڑے۔ مگر اس قسم کی بے اعتدالیوں اُن فوائد کے مقابلہ میں جو اُن کی شاعری سے اردو
 زبان کو پہنچے نہایت بے حقیقت اور کم وزن ہیں۔ انھوں نے بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب
 اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت تخیل
 کی جولا نیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا اور زبان کا ایک محدثہ حصہ جسکو ہر شاعروں
 کی قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اُسکو شعرا سے رو
 کر اویا۔ اُنھوں نے اپنے کلام میں جا بجا اس بات کا اشارہ کیا ہے اور بالکل بجا کیا ہے کہ اُنکے ہنصر
 مرثیہ گوئی زبان اور طرز بیان کے خوشہ چیں تھے ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہریں واں میں فیض شہِ مشرقین کی پیا سو پیو۔ سبیل ہے نذر حسین کی

رہا تھا اور ابو شمر اور عمرو بن مالک اور ذو جند اور ابوالکعبہ سیر بن سیر کے مرثیہ دار تھے
 حذیفہ ابن غانم نے جولوی بن غالب ہی کی نسل سے تھا عبد المطلب کے مرثیہ میں اس احسان کا
 بھی ذکر کیا ہے کہ جب وہ خود چار ہزار درم فتنہ کی بابت مکہ میں پکڑا گیا تو ابوالکعبہ سیر بن عبد المطلب
 نے اُسکو جاکرت ضخواہیں کے پنجے سے پھٹایا تھا۔ اسے سلج عرب کے اکثر قصائد اور مرثی
 حقایق و وقعات پر متعلیٰ پائے جاتے ہیں۔

ہمارے قصائد کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے بہت کم ہمارے شعر نے مرثیہ میں ایک خاص قسم
 کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے مرثیہ کا طلاق ^{بہت کم ہوتا ہے} جسے مان یا دہ مرثیہ دار کے کربلا اور خاص کر غیاث
سید الشہداء کے مرثیہ پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثیہ کی ابتدا اول اسی اصول پر ہوئی تھی جو کہ
 قدرتی تمام انسانوں کو یکساں طور پر تعلیم کیا ہے۔ یعنی مرثیت کو یاد کر کے خرن و غم کا اظہار کرنا
 اور اپنے بیان سے دوسروں کو مخزون و مغموم کرنا۔ چنانچہ جو مرثیہ اول اول لکھے گئے وہ
غم و بیش میں تھے بند یا بیش میں مرثیت سے زیادہ نہوتے تھے۔ اور انہیں مرثیت یا بیش کے سوا
 اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا مگر چونکہ مرثیہ ایک خاص مضمون کے دائرہ میں محدود تھا اور اُسکی قدر
 رز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ لہذا متاخرین کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدت پیدا
 کریں اور اسکے مضامین میں کچھ اضافہ کریں۔ رفتہ رفتہ مرثیہ کی تے بہت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ
حاجہ حیدر علی آتش نے مراذیر کا ایک مرثیہ مجلس میں شکر تعجب یہ کہا کہ یہ مرثیہ تھا اللہ
بن سعدان کی داستان تھی؟ اگرچہ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں
 ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بیش اور مرثیت پر ہوئی چاہیے تھی اُس میں بیش اور

اور عیبوں پر جہانگ منکر ہو گرفت کرے تاکہ حال دستِ قبیل دو نوزمانوں کے لوگ برائی
 کی سزا اور اس کے نتائج سے ہوشیار اور چمکتے رہیں۔ یہ تیرہ پہل سنت الہی کے مطابق ہوگا
 کیونکہ کلام الہی میں بھی ہمیشہ بُروں کو بُرائی کے ساتھ اور بھلوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کیا
 جاتا ہے۔ مثلاً ایک شاعر سے پوچھا کہ تم کس حد تک لوگوں کی جھوٹے درپے رہتے
 ہو اور کب تک انکی مع و ستائش کرتے ہو؟ اُس نے کہا ”مَا أَسْأُوْا وَ أَحْسَنُوْا“، یعنی
 جب تک کہ اُن سے بدی اور نیکی سزا دہوتی ہے۔ پھر کہا۔ ”تَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ نَّكُوْنَ كَالْعُقَرٰی
 اَلَّتِیْ تَلْسِبُ النَّبِیَّ وَالدِّیْنَ“، یعنی خدا نکرے کہ ہمارا حال بچھوکا سا ہو جو کہ نبی اور دینی دونوں
 کے دُشمن مارتا ہے۔

جب کسی ایسے شخص کی جو مع کا متحق ہوتا ہے تعریف کیجاتی ہے تو اسکو مع کا
 زیادہ استحقاق حاصل کرنے یا کم سے کم اپنا پہلا استحقاق قائم رکھنے کا اور دوسروں کو اُسکی
 پس کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح جو لوگ نفیرین کے مستحق ہیں جب اُنکے عیب
 کھائیہ بیان کیے جائینگے تو امید ہو کہ وہ اس اندیشہ سے کہ مبادا آئندہ زیادہ رسوائی ہو
 اپنی اصلاح کی طرف متوجہ یا کم سے کم اپنی بُرائی سے ناامید یا غمگین ہونگے اور دوسرے
 ان عیبوں کو مذموم و قابل نفیرین سمجھینگے۔ اسی لئے مع ایسے اسلوب کی چاہیے کہ وہ نہ
 یہ خوشامد نہ ہو جائے اور نہ بت لےئے عنوان سے ہوئی چاہیے کہ دوسری کا پہلو طعن و تشنیع
 کی نسبت غالب تر ہو۔
 مزید یہ بھی اس کلام سے کہ میں زیادہ تر شخص متوفی کے محامد و فضائل بیان ہوئے ہیں

دیکھ کر یا کسی واقعہ کو سن کر بے اختیار ہمارے دلیس ہر صفت و کمالات کا جو
 اٹھتا ہے۔ کبھی سیکے عدل و انصاف یا عالی ہمتی۔ یا حب وطن یا قومی ہمدردی یا اور کسی
 خوبی کو معلوم کر کے اسکی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی کسی نیک صفت اور ستودہ
 حضرات آدمی کی موت پر افسوس کرنے اور اسکی خوبیاں یاد کرنا و لولوہ دلیس پیدا ہوتا ہے
 کبھی ہم کو اپنے گذشتہ دوستوں کی صحبت میں یاد آتی ہیں اور انکی بے برادری اور جس
 محبت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جو انکا ذکر خیر کرنے پر مجبور کرتا ہے کبھی کسی
 خوش نصیب تمام پر ہمارا گذر ہوتا ہے۔ اور جو لطف و مہاں حاصل ہوتا ہے اسکی بیان کرنا
 جوش ہمارے دلیس اٹھتا ہے۔ یہی طرح جب کوئی واقعہ ہمارے دل کو ناگوار معلوم ہوتا ہے
 یا کسی سے کوئی حرکت یا کام قابل نفیرین طور میں آتا ہے تو اسکی بُرائی ظاہر کرنا ارادہ ہمارا
 نفس میں متحرک ہوتا ہے ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو بلکہ اسکی طبیعت میں خدا
 و ولایت کیا ہے اسکو معطل اور بیکار نہ چھوڑے اور اُس سے جیسا کہ اسکی فطرت کا
 ہی کچھ کام لے۔ جس طرح ایک محقق تحقیق کا یہ فرض ہے کہ موجوداتِ عالم کے بقدر خواص اور
 احوالِ پیکشف ہوں انسے دنیا کو آگاہ کرے یا ایک طبیب کا فرض ہے کہ عفا کے مضار و
 منافع سے بنی نوع کو آہستہ و بے خبر نہ رہنے دے۔ یا ایک سیاح کا فرض ہے کہ انکشافات
 جدیدہ سے اہل وطن کو مطلع کرے۔ یہی طرح شاعر کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اچھوں کی خوبیوں
 کو چمکائے۔ انکے ہر اوصافِ فضائل عالم میں روشن کرے۔ اور انکے جن حقائق کی خوشبو سے
 مروجہ اور آئندہ دونوں نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کر جائے۔ اور نیز بڑی

”کچھ کپانی جتن سے چرخہ دیا جدا آیا گتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا“
ایک شاعر گلگیر اور شیت آئینہ کو اس طرح پیوند دیتا ہے۔

اُسی پہنے ہوئے وہ گل جلیوے شمع کا ہم انگوٹھے کو کہیں گلگیر شیت آئینہ
ایک شاعر نے گل اور کھٹی کو اس طرح کاٹھا ہے۔

”صنعتِ محبت چیں دیکھ دلا جا کر تو دیکھنی گر تجھے منظور ہو گل کی کھٹی“

اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ گل سنگلاخ زمینوں میں اسکے سوا اور کچھ مقصود نہیں
ہوتا کہ دو بے نیل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ یوں
ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو۔ اور ویلف و قافیہ دو نو ملکر مختصر
کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ موقوف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں۔ اور سورت
محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیے۔ جسکے لیے قدر ضرورت
سے دس گئے بلکہ بیس گئے الفاظ موجود ہوں۔ ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا قافیہ
مضمون کے تابع نہ ہونگے۔ جتنے نامور شاعر گذرے ہیں انہوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا
ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جنہیں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔

قصیدہ بھی اگر اُسکے معنی مطبق مع و ذم کے لیے جائیں۔ اور اُنکی نہایت محض
تقلید ہی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی
ایک نہایت ضروری صنف ہے جسکے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنے بہت
اہم اور ضروری مسالہ سے بکدوش نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات کسی چیز کو

ہمارے ہاں اس پر طرہ یہ ہے کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دم چھٹا اور لگایا گیا ہے اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غزل میں اس طرح اردو غزل میں تو اس کو وہی ترسہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اردو دیوانوں میں غیر مرقد غزلیں تلاش کیا جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ ردیف اور قافیہ کی گھاٹی غزوہ و شوگر گذر رہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابل گذر بنانا انھیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔ جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ اور شاعری کا آل محض قافیہ پیمانی سمجھتے ہیں اور بس۔

جہاں تک سنگلاخ زمیں نوک استقر کیا جاتا ہے اُن میں یا تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جنہیں باہم اگر کچھ مناسبت نہ ہو مثلاً۔ تقریرِ شبت آئینہ نچوشت آئینہ۔ تدبیرِ شبت آئینہ۔ اور جیل کی کتھی۔ محل کی کتھی۔ دَوَل کی کتھی۔ اور عس کی تیلیاں گس کی تیلیاں۔ نفس کی تیلیاں۔ یا ردیف ایسی ہی اختیار کرتے ہیں جو ایک دوسرے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آسکتی۔ جیسے فلک پہ بجلی زبیں پہ باراں۔ سرِ طرہ بار گلی میں۔ گاہ خدنگ و گاہ کماں۔ غرض کہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور با معنی شعر کا لانا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے خواہ عام شعرا کے لئے قریباً ناممکن کے ہو ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بہ ظاہر جاتی رہے۔ گو یا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں اور امیر خسرو کی انگلی میں کچھ تھوڑا ہی سافرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے کئی بچہ وصول اور گناہان چار چیزوں کا اس طرح پیوند ملایا ہے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جنہیں باوجود حسن معنی کے اتفاق سے کوئی لفظی نسبت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انکی مقبولیت کا سبب وہی لفظی مناسبت ہی اور بس۔ اب بے تکلف انھیں صنموں کو اپنے کلام میں جاوے جائے استعمال کرنا شروع کرتے ہیں اور جو اصل خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اسکا مستحق خیال نہیں کرتے۔ اسکی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی چسپ کوئی لباس بدنام نہیں معلوم ہوتا۔ اتفاق سے بنت کی ٹوپی یا کارچوبی انکو کھا پہن کر نکلے اور لوگ اسکی ریس سے ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور یہ سمجھیں کہ اسکی زیبائش کا اصل سبب خن جہاں ہے نہ بنت کی ٹوپی اور کارچوبی انکو کھا۔

صنعت الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام شیعہ کو بے انتہا صدی پہنچایا ہو چکی تفصیل کے لئے ایک جدا کتاب لکھنے کی ضرورت ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسطرح عجائب قدرت کی تعظیم ہوتے ہوئے آخر کار دنیا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا۔ اسی طرح ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لئے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔ صنائع و بدائع کی پابندی دلی کے شعرا میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہو۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے اسکا سخت پابندی کے ساتھ اہت زام کیا ہے۔ اور بقا بلکہ اہل دہلی کے لکھنؤ کے عام شعرا بھی رعایت لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی نارسائی کے مقابلہ میں اردو شاعر اس

ایک سب آگ ایک سب پانی^۱ ویدہ و دلِ عذاب ہیں دونو
اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے پس اگر اس قسم
کی مناسبت لفظی اتفاق سے شعر میں پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے۔ مگر قصداً
ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی بلکہ مسخر اپن ہو جاتا ہے۔

ایک مشہور شاعر فرماتے ہیں۔
”مخ و لگو توڑے گی بلی تیرے روازہ کی“
”چونکہ بلی کے پیٹے چھوٹا لانا واجبات سے تھا۔ ایلے جب اصلی چوہا نہ ملانا چارناک بھی
چوہے پر قناعت کی۔“

کھانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو مفید ہو۔ خنزیر بدن بننے کے لائق ہو۔
بو پاس اور رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے بانسوں
میں کھایا جائے تو تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصل خوبی یہ ہے کہ سچپن
موتر ہو۔ لفظاً اور معنی سانچے میں ڈھلا ہو۔ اگر اسکے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اُس میں پائی
جائے تو اور بہتر ہے۔ ورنہ اُسکی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعتِ الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہے) مستقیدین کی نسبت متاخرین
کے کلام میں زیادہ پاؤ گے۔ کیونکہ اکثر متاخرین انھیں مضامین کو دہراتے ہیں جو ان کے
پہلے قدما باندھ گئے ہیں۔ پس تاوقتیکہ وہ صنعتِ الفاظ کو کام میں نہ لائیں انھیں معمولی
باتوں میں کوئی کثر نہ نہیں کھا سکتے۔

دیا۔ جیسے خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

بزیرِ دلق طبع کسندہ دارند درازدستی اس کوتہ استیناں میں
اس شعر میں دراز اور کوتہ کے لحاظ سے صنعت طباق اور دست و استین کے
اعتبار سے مراعاة النظیر ہو۔ مگر دونوں صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر
واقع ہوئی ہیں کہ معنی مقصود میں بجائے اگلے کے ^{بجائے} گھل ہوں اور زیادہ قوت پیدا کر دی ہے
اور شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے یا جیسے میر تقی کہتے ہیں۔

یہ جو چشم پر آب ہیں دونو ایک خانہ خراب ہیں دونو

اس میں ایک کا لفظ ایسا بے ساتھ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے
اُس کا قصد ہی نہیں کیا۔ یہاں ایک کے معنی ہیں نہایت۔ بے مثل۔ لاجواب
چھٹا ہوا۔ جیسے کہتے ہیں وہ ایک ہذات ہو۔ یا وہ لوگ ایک شورہ پشت میں دونو کے
مقابلہ میں ایک کے لفظ نے اگر شعر کو نہایت بلند کر دیا ہو۔ ورنہ نفس مضمون کے لحاظ
سے اُسکی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقت محض صنعت مراعاة النظیر نے اس شعر
میں اعلیٰ درجہ کی بلاغت پیدا نہیں کی۔ بلکہ اس بات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر ^{لفظ}
ایک کا لفظ ایسی خوبی اور بے تکلفی سے ہوا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں
نہیں آسکتا۔ ورنہ ایک شعریا ایک مصرع میں ایک اور دو کا جمع کر دینا کہ اس کا
نام مراعاة النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

حسن مطلع

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں
 الغرض روزمرہ کی پابندی تمام صنائف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک
 ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقہ سے باندھا جائے شعر
 کا زیور ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت طویلانی ہے۔ اسلئے ہم اسکو یہیں ختم کر دیتے ہیں
 اگر موقع ملا تو پھر کبھی اس مضمون پر علیحدہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے۔

ج صناع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سرشتہ ماتھ سے جاتا
 رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ مخاطب کے دل میں خیال گذرنا کہ
 شاعر نے شعر کی ترتیب میں تضع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہتی
 بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے۔ پس صناع کی پابندی اور التزام سے تمام صنائف
 سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیے۔ ^{Figures of Speech} صنائف علم بلاغت میں
 مفصل مذکور ہے دو قسم کی قرار دی گئی ہیں۔ ایک معنوی۔ جیسے طباق۔ مشاکلہ۔ محسن۔
تعلیل۔ تجاہل۔ عارفانہ۔ تعجب وغیرہ۔ دوسری لفظی۔ جیسے تجنیس۔ ردیف۔ تخریج علی۔
منقوط۔ غیر منقوط۔ رقطا۔ خیفا۔ مقطع۔ موسل۔ ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کل صنائف
 اور دوسری قسم کی خاص خاص صنائف عربی اور فارسی کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں
 مگر کبھی انکا اہتمام نہیں کیا۔ اور کلام کی بنیاد انپر نہیں رکھی۔ ماں اگر حسن اتفاق
 سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ سوچے گا جس سے معنی مقصود ہیں کچھ خلل واقع نہ ہو
 اور بیان میں زیادہ حسن پیدا ہو جائے ایسے موقع کو بلاشبہ ماتھ سے جانے نہیں

رہتا ہے۔ لیکن جب رزق ناکش ہو جاتا ہے تو پھر اسکو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا
اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے و دھویا جانا ہے حیا اور بے لحاظ ہو جانے
کو کہتے ہیں۔ اور پاک آزا اور ^{مستحق} شہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے لئے دھویا جانا اور
دھوئے جانے کے لئے پاک ہونا۔ باوجود اتنی نفی مناسب توں اور محاورہ کی نشست
اور زمرہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے۔ اور کوئی بات اُن نچرل نہیں ہے
یا مثلاً مومن خال کہتے ہیں۔

”کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرگئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے“
آنکھیں چرانا۔ اغماض و بے توجہی کرنا ہے۔ دھویا جانا شرمندہ اور کھیا نا ہونا
پا جانا۔ سمجھ جانا یا تار جانا۔ معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر کا مضمون بھی بالکل نچرل ہے اور
محاورات کی نشست اور زمرہ کی صفائی قابلِ تعریف ہے۔ اگرچہ اسکا ماخذ مرزا
خالب کا یہ شعر ہے۔

”گرچہ ہے طرزِ تغافلِ پردہ دارِ عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پایا ہے“

مگر مومن کے ہاں زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ اسی قبیل کے یہ اشعار ہیں۔

رنجِ خراب حال کو زہد نہ چھپیٹے تو	تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نیب پیڑ تو
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ نبیل کی تڑپ	ہر قدم پر ہے یقیں بیاں بگیا و حال بگیا
جو بے احتیاری یہی ہے تو قاصد	ہمیں آ کے اُس کے قدم کھتے ہیں
شاید اسیکانا نامِ محبت ہو شیفہ	ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

چیزوں سے مقدم سمجھا ہے اُنکے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگزاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی سادگی اور سنجیدگی کے روزمرہ اور محاورہ میں بھی پورا اتر جائے تو لامحالہ اُس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے مثلاً میر انشا اللہ خاں اس بات کو کہ افسر کی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھٹی چھڑا سخت ناگوار گذرتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”نہ چھٹیر اسے نکست بادی بہاری راہ لگ اپنی“

Parables تجھے ٹھکھیلیاں سو جھی ہیں یہاں بیزار ٹھیکے ہیں

یا مثلاً مرزا غالب اتنے بڑے مضمون کو کہ (میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سال سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اُسے جانا کہ اسکا مطلب کچھ اور ہے۔ اُسے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے) دو مصرعوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”گدا سمجھ کے وہ چپ تھا۔ مری جو شامت آئے

اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کے لئے“

یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں۔

رونے سے اور عشق میں بیاک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے اُسکو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ

کی پابندی کے محض محاورات کے جاوبے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی مخوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصہ ہے۔ اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جسمیں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُنکو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو شکر سُرُھننے لگتے ہیں۔ اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی بُدَل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ جب انھیں اسلوبوں میں وزن کی کچھاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں۔ اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ہوا پاتے ہیں تو اُنکو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کیسا تھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لیے صرف روزمرہ کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک محض ٹھیک بندی اور معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے بلکہ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور تکلفی سے ادا کیا گیا ہے۔ تو بلاشبہ اُنکو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ فن شعری اور خاص کر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روزمرہ میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب

کی جگہ ہوں پس چاہیے۔ یا دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا،، جہاں کیا ہو گیا چاہیے۔

الغرض نظم ہو یا تر دو نو میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ بہت شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے۔ لیکن ہر شعر میں محاورہ کا باندھنا ضرور نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک بہت اور ادنیٰ درجہ شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے۔

”گو ہر اشک لبریز ہے سارا دامن آج کل دامنِ ولت ہے ہمارا دامن“

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا۔ باوجود اسکے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے۔

”اُس کا خط دیکھتے ہیں جب ضیا طوٹے ماتھوں کے اڑا کرتے ہیں“

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے نہ صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف یعنی اڑ چائے میں کی جگہ اڑا کر گئے ہیں محاورہ

کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے جیسے کوئی خوبصورت عضو۔ بدن انسان میں۔ اور روزمرہ کو ایسا جانتا چاہیے جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہی طرح بغیر روزمرہ

کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا مٹا کرنا)۔ اسکو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ترکیب اہل زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے۔ اور نیز اسہیں ”تین پانچ“ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے لیکن روٹی کھانا۔ یا میوہ کھانا۔ یا پانسان یا دس بارہ وغیرہ صرف پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پاتے ہیں۔ نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے۔ کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں مگر انہیں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا۔ آئندہ ہم ان دونوں معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر روزمرہ کا اور دوسری قسم پر محاورہ کا طلاق کریں گے۔

روزمرہ اور محاورہ میں بن حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے۔ روزمرہ کی پابندی جتنا تک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم و شعر میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ بھانٹک کہ کلام میں جب قدر کہ روزمرہ کی پابندی کم ہوگی بہت قدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا۔ مثلاً ”کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سیر اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا“۔ یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ اسکی جگہ یوں ہونا چاہیے۔ ”کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سیر اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا“ یا مثلاً آج تک اُن سے ملنے کا موقع نہ ملا“ یہاں نہ ملا کی جگہ نہیں ملا چاہیے۔ یا ”وہ خاوند کے مرنے پر درگور ہوئی“ یہاں زندہ درگور ہو گئی چاہیے۔ یا ”سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہو گئیں“ یہاں ہونے کی بجائے

اس طرح اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا طلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کیساتھ ملکر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جیسے اُتارنا۔ اسکے حقیقی معنی کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اُتارنا کھڑے سے کپڑا اُتارنا۔ کوٹھے پر سے پلنگ اُتارنا۔ لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دو کے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً نقشہ اُتارنا نقل اُتارنا۔ دل سے اُتارنا۔ دل میں اُتارنا۔ ہاتھ اُتارنا۔ پہنچا اُتارنا۔ یہ سب محاورہ کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنے کا طلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا۔ اسکے حقیقی معنی کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتار دینے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا۔ دوا کھانا۔ فیس کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا۔ قسم کھانا۔ دھوکا کھانا۔ پچھاڑیں کھانا۔ ٹھوکر کھانا یہ سب محاورے کہلاتے ہیں۔

محاورہ کے جو معنی پہلے بیان کیے ہیں وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں۔ لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اُس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اُس کو دوسرے معنوں

ضرورت نے لوگوں کو اسکے برتن پر مجبور کیا ہے چونکہ اس موقع پر استعارہ کی تقریب
محاورہ کا ذکر کیا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں

بیان کی جاتی ہیں

ب محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ بات چیت
اہل زبان کے روزمرہ کے موافق ہو خواہ مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہل زبان کے

روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً
ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا سلاط
بیان نہیں کہنا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اسکا کامل ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ

پر جو بیشتر مفرد کے ہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں جب پر الگ الگ
لغت کا کامل ہو سکتا ہے مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ دونو
کو ملا کر جب پانچ اور سات بولیں گے تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر
محاورہ کا کامل کیا جائے قیاسی نہ ہو بلکہ مستلزم ہو کہ اہل زبان اسکو اسے طرح استعمال کرتے

ہیں۔ مثلاً اگر پانچ یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو
بول جائے گا تو اسکو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہل زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے۔ مثلاً
بلا ناغہ پر قیاس کر کے اسکی جگہ بے ناغہ۔ ہر روز کی جگہ ہر دن۔ روز روز کی جگہ دن دن۔ یا
آٹے دن کی جگہ آٹے روز بولنا۔ ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ الفاظ

جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے اور چونکہ ہمیں صنعتِ ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اسلئے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اس میں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہے کہ دشمن کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔

مرزا غالب کا فارسی شعر ہے۔

ہوا مخالفِ شبِ تار و بجِ طوفانِ خیز گسستہ لنگر کشتی و ناحہ خفتست
اس شعر میں اپنی مشکلات اور سختیوں کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے جو حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اگر اُس کو صاف اور سیدھے طور پر جیسی کہ وہ ہے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو مصرعوں میں نہیں سما سکتی۔ اور باوجود اسکے جس ہیبت ناک صورت میں اُس کو تمثیل کا پیرایہ ظاہر کرتا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔

مرزا غالب کا اردو شعر ہے۔

پنہاں تھا دامِ سختِ قریبِ آشیان کے اڑنے پناے تھے کہ گرفتار ہم ہو
اس شعر میں بھی اس بات کو کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقاتِ دنیوی میں بھٹکا بطور تمثیل بیان کیا ہے۔ اور اس عنوان ^{ending} بیان کی خوبی ظاہر ہے۔
بہر حال شاعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ مجاز و استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تاکہ ہر روکھے پھیکے مضمون کو آبِ تاب کے ساتھ بیان کر سکے۔
لیکن استعارہ وغیرہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ مجازی معنی فہم سے بید نہ ہوں
ورنہ شعر چیتاں اور عجبائیگا مثلاً شاہ نصیر کہتے ہیں۔

یاشد امرا غالب کہتے ہیں۔
 ہائے اُس زود پشیاں کا پشیاں ہونا
 کی مئے قتل کے بعد اُسے جہاں تو
 دوسرے مصرع میں طنز ابطور ستعارہ کے ”زود پشیاں“ کہا گیا ہے
 جس سے شعر میں جان پڑتی ہے۔ یہ ویسا ہی ستعارہ ہے۔ جیسا قرآن مجید میں آنک زھک کی جگہ

کَبِيرٌ هُمْ بَعْدَ اِلٰہِ فَرَمٰی ہے۔

اسی طرح یہ لفظی کتے ہیں۔

کہتے ہوا اتحاد ہے ہکو ہاں کہو اتحاد ہے ہکو
 ”اعتماد نہیں ہے“ کی جگہ طنز ”اعتماد ہے“ کہا گیا ہے۔

بچاں بھی ”اعتماد نہیں ہے“ کہتے ہیں۔

مرے تجانہ میں تو کعب میر کا روبرہن کو
 وفاداری بشرط استواری اصل یاں ہے

دوسرے مصرع کا اصل مدعا یہ تھا کہ وفاداری ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر رہن وفاداری کیا تو
 ساری عمر تجانہ میں نباہ دے تو اُس کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے
 مسلمان کے ساتھ کرنا زیبا ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہ تجانہ میں مرے تو

اُس کو کعبہ میں دفن کرنا چاہیے۔ جو خوبی اس عنوان بیان میں ہے وہ ظاہر ہے۔

دوسری جگہ مرزا غالب کہتے ہیں۔

دشت کو دیکھ گھر یاد آیا

کوئی دیرانی سے دیرانی ہے

”خوف معلوم ہوا“ کی جگہ گھر یاد آیا، ”کہا گیا ہے“ کی جگہ

برتنے پر قدرت حاصل کرنی چاہیے۔

استعارہ و کنایہ اور تمثیل کی تعریف اور انکی قسمیں علم بیان کی کتابوں میں دیکھنی چاہئیں
یہاں ہم صرف اسقدر کہنا چاہتے ہیں کہ استعارہ بلاغت کا ایک رکن ہے اور شاعری
کو اُس کے ساتھ وہی نسبت ہو جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی
قرب قریب ہو۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ
ہو جاتا ہے وصال شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور حسیات خیالات
عملگی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے۔ اور جہاں اسکو اپنا سنسٹر کارگر ہو تا نظر نہیں آتا وصال انھیں
کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

بعض مضامین فی نفسہ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ انکو محض صفائی اور
سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان
انکو ادا کرتے وقت رو دیتی ہے اور معمولی اسلوب انہیں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ایسے
مقام پر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل غریبہ سے مدد لینا چاہئے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی
بات چیت ہو جاتی ہے مثلاً داغ کہتے ہیں۔

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی ^{دیر ہوئی} دل مٹیابے حال جا کر کہیں تو بھی نہ مرنا
اس شعر میں دیر لگانے کو موت آنے اور مرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ دونوں لفظ نہ ہوں بلکہ
اسطرح بیان کیا جائے کہ قاصد نے تو بہت دیر لگائی اسے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگائی تو شعر
میں کچھ جان باقی نہیں رہتی۔

مضمون

خدا غریبوں کے جھوٹے نہیں ہے۔

مشائخ کے ہر ایک سلسلہ کی نسبت میں جا!

کیفیت ہوتی ہے۔

نفس کی رعوت جس طریقہ سے کم ہو سکے

بہتر ہے۔

خدا کی ذات مکان اور جیت سے پاک ہے۔

طزیر بیان

فانوس شیشہ و لکڑی زر سے کیا حصول

وہ ہے وہاں جہاں نہیں وغن چراغ میں

ہو اس سبب مشک کے لعل فام میں

آتی ہے بوئے غیر ہر شام میں

نفس کش کی کسی ڈھب سے رعوت کم ہو

چاہتا ہوں وہ صدم جس میں محبت کم ہو

وہ آپ کے سیدہ کہ ہم جیسے صید ہیں

نہ وادی تار نہ دشت خشن میں ہے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غرور ہوا آئے کرے شکار مجھے

آہو لو ہے دفعہ گمارہ کش ہو کر طہین

کلی حاصل کرنا۔

اگرچہ اس قسم کے اشعار سے فارسی کے خاص خاص یوان بھرے ہوئے ہیں اور

اُردو میں بھی تلاش کر نیے ایسے اشعار اور زیادہ دستیاب ہو سکتے ہیں مگر یہ سب لوگ یاد تیر

تصوف کے مضامین سے خصوصیت رکھتے ہیں مگر یہ قسم کے نیچرل خیالات ادا کرنے کے لیے

صرف یہی اسلوب کافی نہیں ہو سکتے جب تک کہ شاعر انکو عمارہ طور پر ہر موقع کے سبب

استعمال کرنے کی لیاقت اور انھیں میں ملتے جلتے نئے اسلوب پیدا کر نیکا ملکہ نہ رکھتا ہو

ہمارے نزدیک اسکا گریہ ہو کہ جانتا ہے ہو سکے ستعارہ و کنایہ تمثیل کے استعمال و محاورات

مضمون

طرز بیان

توکل کی شان۔

احسانِ ناخدا کے اٹھائے مری بلا

کشتیِ خدا پہ چھڑدوں لنگر کو توڑ دوں

تعلقاتِ دنیوی کے ستارچ

اگر اٹھے تو آزدہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے

لگایا جی کو اپنے روگ جبے دل لگا بیٹھے

غالب

عزت نشینی میں کوئی خطر نہیں۔
تیرے تیرکماں میں ہو نہ صیاد کمین میں طہات

گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہو

گرمی سی کلام میں سیکنِ سقہ
کی جس سے بات اُسے شکایت ضرور

تیر زبان آدمی کی ہر کوئی شکایت کرتا ہے

جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے

ریخ اور تکلیفِ خدا کی طرف سے ہو۔

ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس ننگ میں آئے

غلبہ یاس میں مطلبِ ناتم سے جاتا رہتا ہے

سنہلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت

کہ دامنِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھے

خدا تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چارہ گتے

تیرا تپانہ پائیں تو ناچار کیا کریں

شیفہ

مضمون

دنیا میں غوج کیساتھ ہی تنزل لگا ہوا ہے

طرز بیان، جزا سے
پانی نہ ہو وفا کی ترے پیر میں ہم
نہ دیکھا اس سو اچھ لطف سے صبح چین تیرا
گل دیدھر گئیے گلچین گئی روتی اودھر شبنم

جو دنیا کو بے ثبات جانتے ہیں وہ بھی اپنی بے

بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر
تباروتی ہے کس کی ہستی موہوم پر شبنم

دل ۶ دلا اب سر کو اپنے پھیرت سنگ ملا ہے

ثباتی سے غافل ہیں۔
خدا کی۔ بندے کی۔ قوم کی۔ ملک کی کسی کی

یہی ہوتا ہے ناداں عشق کا انجام دنیا میں
ساقی سے اک بتم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلد ہی بھریں سے کہیں

محبت کیوں نہ ہو اس پر لامست ہونی ضرور ہے
جو کام کرنے ہیں انہیں دیکر کرنی نہیں چاہیے۔

اکش کش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں
اے لفت چمن ترا خانہ خراب ہو

جس قدر دنیا کی محبت بڑھتی جاتی ہے سدیقہ
مشکلات زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔

ذوق

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے

اگر دلوں میں دنیا کی محبت باقی نہ رہے تو دنیا

پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کے سب کام بند ہو جائیں۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا ادا کھلا گئے

بہت سے جوہر قابل پہلے اس سے کہ اپنے جو

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

دکھلائیں خاک میں مل جاتے ہیں۔

طرز بیان

مضمون

کائنات کے تمام جلوے منظر تجلیات الہی ہیں
ظاہر و باطن کی طرح

گزر ہے صبا کون بتا آج ادھر سے
گلشن میں ترے پھولوں کی یہ باس نہیں ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ یکھا ہے

گل یوم ہو فی شان

آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
بسا ہے کون ترے دلیں گلبدن اسے درد

با خدا لوگوں کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے۔

کہ بو گلاب کی آتی ترے پسینے سے
اُسکے خیال زلف نے سب سے ہمیں چھڑا دیا
گرچہ بھینسے ہیں دام میں دل کو مگر فراغ ہی

عشق الہی تمام تعلقات سے نجات دیتا ہے

ساقیا بھیاں لگ رہے چل چلاؤ
جب تک بن چل سکے ساغر چلے

جہاں موت کا کھٹکا ہو وہاں ایک دم یاد خدا
غافل نہ رہنا چاہیے۔

از دیوان سودا

خانہ پرورد چہن ہیں آخرے صنایا ہم
اتنی خست دے کہ ہو لیں گل سے ناک راہم
خندہ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر

شیخ کو چاہیے کہ سالک کو تعلیم فناء پہنچانے
تعلقات سے متفرک رہے۔ نفرت رسول
دنیا میں فی الحقیقہ کوئی چیز دوستی کے قابل نہیں

اس چہن سے کہ نہ تو جا کر کیا کریں گے یاد ہم
اے گل صبا کی طرح پھرے اس چہن میں ہم

ترار
دنیا کی کسی نعمت کو ثبات نہیں۔

طرز بیان

مضمون

باوجودیکہ خدا تک کسی کی رسائی نہیں ہے
 صبا ز روی تو باہر گلے حدیثے کرد
 بھید و نیاس کیوں کر ظاہر ہو گئے۔
 قریب چون رہ غمار داد و درخت
 عشق می درزم وید کہ اس فن شریف
 سب کوششوں میں ناکام ہو کر خدا کی
 چوں ہنری اگر موجب حرام نشو
 طلب میں کوشش کرنی۔

از دیوان خواجہ میر

دنیا میں سے فنا کر کے بے تعلق رہنا۔
 آے دروہاں کو سے نہ دل کو لگائیو
 لگ چلیو سے یوں تو چیت پھنائیو
 نکاش تا شمع نہ تو لکڑ پر وانیہ
 قرب آئی میں بٹے بٹے خطرات ہیں۔
 تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانیہ

تغصیب

سکالک کی غایت مقصود و فایزہ۔
 ایک ہی جہت میں لی تنزل مقصود اس نے
 سہ پہلے دو رہرو! رشک کی جاے سفر روانہ

ستر باطن کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہیے۔
 گھر ٹہری کان میں وہ کہتا ہے
 کوئی اس بات سے نہ ہوا گاہ

بندہ اور خدا کیچ میں کسی واسطہ کی
 قاصد نہیں یہ کام تر اپنی راہ لے
 اُسکا پیام دل کے سوا کون لاسکے
 گنجائش نہیں۔

اور جنسی خیالات کے ظاہر کرنے میں ایک محدود اور معمولی زبان سے کام لیا گیا ہے۔

از دیوان خواجہ حافظ

طرز بیان

مضمون

روئے تو کس ندید و ہزارت رقیب ہست

تمام عالم خدا کا ناپیدہ مشتاق اور طالب ہے

در غنچہ ہنوز و صدف عنایب ہست

خدا کے طالب صادق کبھی محروم نہیں رہتے

عاشق کہ شد کہ یار بجالش نظم نہ کرد

ای خواجہ در دوست و گریز طبیب ہست

دوست کو الزام دیکر پشت منہ کرنا شرط

صبر دم مرغ چین با گل نو خواستہ گفت

ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چون تو شکفت

دوستی کے برخلاف ہے۔

گل بخندید کہ از زہت زنجیریم و

ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نہ گفت

اقبال مندی کا زمانہ ہمیشہ نہیں رہتا۔

گفتم اے منہ جہ جام جہاں بنیت کو

گفت افسوس کہ آن دولت بیدار بخت

ساقی یار بادہ کہ ماہ صیام فرت

جس طاعت میں ریا کا لگاؤ ہو اس سے

در وہ قح کہ موسم ناموس و نام فرت

معصیت بہتر ہے۔

وقت عزیز فرت۔ بیاتاقضا کنیم

عمر کے کہ بے حضور صراحی و جام فرت

دیو و پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی باتیں علم انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہو جاتیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بکل دست بردار ہو جائے بلکہ اسکا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نچل خیالات کو انھیں غلط اور بے اصل باتوں کے پیرائے میں بیان کرے اور اُطلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے۔ ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اُس نے اپنے منہ میں سے وہی اچھیر بھلا دیتے ہیں جو دلوں کو لٹیر کرتے تھے۔ بہر حال جو لوگ اردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اُسکو صفحہ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اُنکا فرض ہے کہ صنف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سادہ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور مانوس الفاظ کم ہوتے جائیں۔ مگر سادہ معلوم طور پر نثر و نثر نہ اُنکو بڑھاتے ہیں۔ اور زیادہ تر کلام کی بنیاد پریم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورات پر رکھیں۔ مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ اُنکو کچھ ترقی معنوں میں کبھی مجازی معنوں میں کبھی استعارہ معنوں میں ہی پر قناعت نہ کریں۔ پیرایہ میں استعمال کریں۔ ورنہ ہر قسم کے خیالات ایک اور کنا یہ کے طور پر اور کچھ ترقی میں کیونکر ادا کیے جاسکتے ہیں۔ ہم ہر مقام پر علم بیان کے اصول غنی یا سہمی تلی زبان میں کیونکر ادا کیے جاسکتے ہیں۔ اور ایک ایک لفظ کو مختلف موقعوں میں برتنا ایک مطلب کو متعدد پیرایوں میں ادا کرنا۔ اور ایک ایک لفظ کو مختلف موقعوں میں برتنا آتا ہے۔ بیان کرنے نہیں چاہتے۔ کیونکہ اُنکی تفصیل عربی۔ فارسی اور نیز اردو رسالوں میں مل سکتی ہے۔ مگر ہم فارسی اور اردو غزل کے کیتقدراشعار بطور مثال کے نقل کرتے ہیں جنہیں اسلاق و قصود کے مضامین عشق مجازی اور تغزل کے پیرائے میں ادا کیے گئے ہیں۔

اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نجی پرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اسکو تمام انسانی جذبات کا ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اسکو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی نظر میں خوشی اور غیر مانوس نہ ہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اول اول اُسی زبان اور اُسی روزمرہ میں ادا ہونی چاہئیں جہیں پرانے اور پست خیالات ادا کیے جاتے تھے یہ ہے کہ کلام الہی میں تمام روحانی اور حسیاتی باتیں ویسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جنہیں شعر نے جاہلیت عشقیات و خمریات اور تعافروں و عیوض و غیر کے مضامین بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعہ ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعہ وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں اور انکو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے۔ اور قدیم اسلوب جو کانوں میں پہنچ گئے ہیں انکو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جائیں۔ تو بھی جن الفاظ کے ذریعہ سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے خواہ

کہ وہ آسمان کا وجود اور اسکا گردش کرنا۔ زمین کا ساکن ہونا۔ پانی اور ہوا کا بیٹھنا۔ غماض کا چار میں چھ ہونا۔ جام بکلم جہاں نما ہونا ظلمات میں چشمہ جیواں کا غصی ہونا۔ سیرغ اور

کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اُسکی ایک خاص زبان قرار پاگئی ہے اور وہ
استعد کا نون میں پُچ گئی ہے کہ اگر دفعۃً اُنہیں کثرت سے غیر مانوس اور جنبی ترکیبیں اور
اسلوب بیان حمل ہو جائیں تو غزل ایسی ہی گھٹل ہو جاتے جیسی کہ بعض شعرا کی غزل عربی
اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں خستیا کر نیے ہو گئی ہے۔ حالانکہ غزل کو باعث بار
مضامین کے وسعت دینا بظاہر سببات کا مقصد ہی ہے کہ زبان اور طریقہ بیان کو بھی وسعت
دیجائے۔ پس ضرور یہ کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقہ بیان میں دفعۃً کوئی
بڑی تبدیلی بھی واقع نہ ہو اور باوجود اسکے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہو سکیں
آجکل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعرا نے
کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیئے جاتے ہیں مگر چونکہ وہ اُس خاص بان میں جو شعرا کی کثرت
استعمال سے کانوں میں پُچ گئی ہے اور انہیں کیئے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں
براہِ رست ظاہر ہونا چاہتے ہیں انھیں الفاظ میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں اسلئے وہ مقبول
خاص عام نہیں ہوتے لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سُر و ست مقبول نہ ہو تو کچھ حرج
نہیں جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اُس سے آشنا ہو جائیں گے۔ اور سچی باتوں کی لذت
اور حلاوت سے واقف ہونگے اسوقت وہ خود بخود مقبول ہو جائے گی۔ البتہ غزل کو
ابتداء ہی سے جہانگیر ممکن ہو عام پسند اور طبعی طبائع بنا نا ضرور ہے۔ کیونکہ یہی ایسی
صنف ہے جو خاص عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اسی کے اشعار ہر شخص کو آسانی یا دورہ
سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی

لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک
 ترقی کی۔ اس وقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضروریہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ جب طرح دولت اور
 منطقی فلسفہ وغیرہ میں بہکومتیت حال ہو۔ سیلح زبان اور لب لہجہ میں بھی ہم دلی سے
 غایق ہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کر نیکی نے ضرورتاً کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر
 مانہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چونکہ منطق فلسفہ وطب علم کلام وغیرہ کی مہارت زیادہ تھی
 خود بخود طب یعتین اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور
 انہی جگہ عربی الفاظ کثرت سے دخل پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امر اور اہل
 علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہو گئی بلکہ جیسا لغات سے منگایا ہے معیوب اور
 بازار یوں کی گفت گو سمجھی جانے لگی۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و شریعتی غالب آ گیا۔
 جرات اور ناسخ کے دیوان کا اور شریعتیں باغ و بہار۔ اور
 نظم میں جرات اور ناسخ کے دیوان کا اور شریعتیں باغ و بہار۔ اور
 فسانہ عجائب کا مقابلہ کر نیے اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بالانہصاف یہ
 کہ مثنوی اور شہنوی میں خاص خاص شخصوں پر (جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا) زمانہ کے
 اقتضائے کچھ اثر نہیں کیا۔ انھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں یا
 بلکہ انکو بزرگوں کا تبرک سمجھ کر اس فہم لک کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔
 بہر حال غزل میں بان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے
 ۱۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و موس کے مضامین
 میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ اسکو ہر قسم کے جذبات کا ارگن بنانا چاہیے۔ یہ بھی غزل ہے

چست کرتے ہیں تاکہ بادی لفظ میں حقیر نہ معلوم ہوں، بات یہ کہ یہ لوگ انہیں مولیٰ خیالات کو جدت سے مختلف شکلوں میں بندھتے چلے آتے تھے بہت کم باندھتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ ایسے اُردو روزمرہ کا سرشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا تھا۔ با انیمہ غزلت کی شان اُسکے تمام کلام میں پائی جاتی ہے اور صاف با محاورہ اور بلند اشعار اُسکے ہاں بھی نسبتاً اتنے ہی نکل سکتے ہیں جتنے کہ قدما کی غزلیات میں۔

ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ^{بہت کم} طفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اُس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ واضح کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی و روزمرہ کی پابندی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ ^{بہت کم} شوخی اور کھیاپن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے۔ مگر اور محاورہ کی بہتات کے طرزاں میں ایک شوخی اور کھیاپن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے۔ مگر نہایت تعجب ہے کہ ^{بہت کم} شوخی اور کھیاپن نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے۔ باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلی اور لکھنؤ میں کوئی معتد بہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ایکے سوا شجاع الدولہ کے زمانہ سے سعادت علی خاں کے وقت تک اُردو کے تمام نامور شعرا کا جگمگا لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر سودا و سوز و جرات مصحفی اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے۔ مگر متاخرین کی غزل میں اُنہی طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور کھنڈ سے زمانہ سوانح ہوا اور دلی کے کشتہ شریف خاندان اور ایک آدمی کے سوا تمام نامور شعرا

ہر پادشاہان بجز و منداں محتاج تراند کہ
السلطان اخرج الی العقلاء من العقلاء
خرو من ایں پادشاہان۔
الی السلطان۔

اہل یورپ جو آج **لٹریچر** میں بھی **شعل** علوم و فنون و صنائع کے تمام دنیا سے
خائف ہیں اسکا سبب اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور قوم ایسی نہیں جسکی شاعری اور نثا
کالت **نبا** انہی زبانوں میں موجود نہ ہو۔ پس ہر کچھ بھی چاہیے کہ جب قوم اور جن بان کے خیالات
ہم کو ہم نہیں اُن سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھائیں اور صرف انھیں **چند** فرسودہ اور **پوسیدہ**
خیالات پر جو صدیوں سے برابر بندھے چلتے ہیں قناعت کر کے نہ بیٹھیں کیونکہ علم
ہرگز میں قناعت ویسی ہی قابل ملامت ہے جیسی مال دولت میں حرص۔

۴۔ جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اسکی زبان بھی ایک خاص اثر ہے
یہ نہیں نکل سکتی کیونکہ چند معمولی مضامین جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان
کا ایک خاص حصہ اُنکے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں
پر بار بار سننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے
الفاظ جو انھیں کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔
عشقیتہ مضامین پہلے ہاں کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ قصیدہ

اور مثنوی میں بھی برابر انھیں کمال عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں چند کے سوا کل
مثنویاں عشقیہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح قصائد کی تہیدوں میں بھی زیادہ تر یہی فکرا
روایا گیا ہے۔ دوسرے تو عشق کی پسلی ہی پیدا ہوا ہے لیکن جو نہ قصیدہ مثنوی اور

میر کا پیش خرابہ اس حدی کے شعر سے ^{معلوم ہوتا ہے} مگر سعدی کے ہاں خوب کا
 نقطہ ہے اور میر کے ہاں ^{نفسانہ} پیار کے کا نقطہ ہے۔ ظاہر ہے کہ **خوب** کا محبوب بننا
 کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ لیکن **پیاری** کا پیارا ہونا ضرور ہے پس سعدی کے
 سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر میر کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کرنا بشرطیکہ ترجمہ کے فرائض پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی
 بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا ہومر ہے خود اس کے کلام میں عربی اقوال و اشعار
 کے ترجمے یا ان کا حاصل موجود ہے۔ مثلاً

اقوال عربی

سعدی

- ۱۔ سگ بد ریاض ہفت گانہ بشوے
 ع۔ الکلب لبخس ما یکنون اذا اغتسل
- ۲۔ ترا خامشی اے خداوند ہوش
 القمہ زینۃ العالم و ستر الجاہل
- ۳۔ تو بجائے پدر چہ کردی خیر
 راع ابالک یل اء ابنک
- ۴۔ شہزہ گر نور آفتاب نخواہد
 سناء ذکاء لا ینزل من دعاء الخفاف
- ۵۔ نیکیخت آنکہ خورد و کشت و بخت لگہ مرو
 السعد من کل وزع و النقم من بات و دوج

خواجہ میر درد

نہ کہیں شیش تمھارا بھی نہ شخص بوجہ دوست و درد کو محفل میں تم یاد کرو
ممکن ہے کہ خواجہ میر درد نے فارسی شعر سے یہ مضمون اخذ کیا ہو لیکن تفسیراً انکا شعر
فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اول تو فارسی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لانا
جس میں خود درد و کافظ ہی شاعر کے دعوے پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر راہِ صلح کی
جگہ یاد کرو بونا جسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ درد کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو دو
یاد کرنے کے معنی ہیں اعلیٰ کا اونے کو اپنے پاس بلانا۔ اور بڑی خوبی درد
کے شعر میں یہ ہے کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ جو فارسی میں تفسیری طور پر بیان کی گئی ہے اُسکو
میر درد نے احتمال کی صورت میں اس طرح بیان کیا ہے ”نہ کہیں شیش تمھارا بھی نہ شخص بوجہ“
ان دونوں اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے۔ جیسے ایک شخص تو بیمار سے یوں کہے کہ ”بدرمیز“
سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہے ”دیکھو کہ میں بدرمیزی میں جان سے ماتھ نہ
دھو بیٹھو“ دو اسلوب ہیں جیسا کہ ظاہر ہے نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تحریف و
تغییر ہے۔

سعدی شیرازی

دوستاں منج کسندم کہ چرا دل تو دادم
باید اول تو گفتن کہ چنیں غب چرائی؟
میر تقی

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پر رکھتے ہیں گناہ
اُن نے بھی تو پوچھے تھے تم تنے کیوں پیار ہو؟

ہمارے بعض شعرا نے بعض ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اردو میں
ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ من و جہل شعر سے بڑھ گئے ہیں نظیری کا شعر ہے
”بوی یار من ازین سست وفائے آید کلم از دست بگیرد کہ از کار شدم“
سودا کہتے ہیں

”کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سوا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں“
اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنی شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے
بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن بلاغت کے
محاط سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی
ممکن ہے کہ عاشق از خود رفتہ ہو جائے لیکن ساغر شہاب کو دیکھ کر معشوق کی نشلی آنکھ
کے تصور سے بخود ہو جانا زیادہ قومن قیاس ہے۔ اس کے سوا ”از کار شدم“ میں
وہ تعمیم نہیں ہو جاوے گی کہ ”چلا میں“ نہیں معلوم کہ آپ سے چلا یا دین دنیا سے
چلا یا جگہ سے چلا۔ یا کہانے چلا۔ اور بے بڑی بات یہ ہے کہ ”چلا میں“ ہمیشہ ایسے
موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مہوش و بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا ہے اور ”از کار شدم“
میں یہ بات نہیں ہو موقوف ہوئے۔ مغفل ہوئے۔ اپا چ اور نکلے ہوئے کو بھی ”از
کار شدم“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

arvon.

لا ا ح ل م

در محفل خود راہ من، سپہ منی با افسوہ دل فسرہ کند خنجر منی با

اسطرح اردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔
 ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے جو کہیں کہیں فلاں سی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں دیا
 آپ لوگوں نے اعتراض کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے ایک
 زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ایک بزرگوار
 نے سارا کنز نامہ ہجری اردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے اور مئے سنا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے
 اور مولوی بھی اُنکے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرے میوہ زیبا چو شلخ کو	کہ یوسف ارش کرے خاک کو
ہوا جبکہ آستہ باغ خوش	بہر سیوہ شیرین و سہم ترش
بہ شادی لب پستہ خنداں ہوا	طبیب سپہ بھی تیز دنداں ہوا
ہوا چہ مارا فروختہ	کہ ہوں تلج پر حل جول و ختہ
بہ رغبت بہ ہر شلخ انجیر دار	لنگنے لگے مرغ انجیر خوار
اٹھایا لب خم نے جوش نغیر	ہم از بوے شیرہ ہم از بوے شیر

شاید اس حجم کی نسبت تو یہ کہا جاسکے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اس لیے عمدہ ترجمہ نہ کر سکا
 لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ ازراہ عنایت زیادہ نہیں تو انھیں چھ شعروں کو
 فصیح اردو نظم میں تو ذرا لکھائیں جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں
 عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اُسکی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا مگر
 ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

”إِذَا غَضِبْتَ عَلَيْكَ بَنُو قَدِيلٍ حَسِبْتَ النَّاسَ كُلَّهُمُ غَضَبًا“

(یعنی جب بنی تمیم تجھے ناراض ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ تمام بنی آدم تجھے ناراض ہیں)

شعری پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اس طرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھوے نمونے چھوڑتے گئے پچھلے انہیں کچھ کچھ تصرف کرتے رہے یہاں تک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پہنچ گیا۔ شعری ترقی بھی اس طرح متصور کہ قدما خیالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے تصرفات کرنیکے لیے شاعری کی پوری لیاقت ہونی چاہیے۔ ورنہ جیسے ایجادات ہمارے ملک کے اکثر شعرا کرتے ہیں اُنے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کم اور عربی میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ شعر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند۔ لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہموطنوں میں جو لوگ ایسے داغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے انہیں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ ^{بامقصد} فکر کے موافق تصرف کر کے۔ اور جبکی قوت متخیلہ اُنے کم درجہ کی ہے وہ انہیں خیالات کو عجیبہ اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کر کے اردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا عالم ہے اور اردو زبان نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسب رکھتی ہے۔ اس لیے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہاں تک کہ اپنی زبان میں اُنکے ادا کرنے کی طاقت ہو اُنکو شعر کے لباس میں ظاہر کریں۔ اور

|| ” محمد نہیں ہی تو ہی نوا مانے راز کا بھان ورنہ جو حجاب پر وہ ہے سنا“

اگرچہ گمان غالب یہ ہے کہ عرفی کی رہبری اس خیال کی طرف قرآن مجید کی اس آیت سے
ہوئی ہوگی۔ ”وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَسْتَجِيبُ لَيْلٍ ۚ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ شَيْئًا“ لیکن ہر حالت

میں عرفی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال اس سے ادا
ہو گیا ہے۔ اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے۔ با اینہم مرزا کی جدت اور تلاش بھی

کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں مطلق اضافہ کی گنجائش نہ تھی اُس میں ایسا
اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطف معنی سے بھی خالی نہیں ہے عرفی

کا یہ طلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں یہی حقیقت اسرار میں ^{بہتر} ہرگز ایہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں
مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں یہی درحقیقت کاشف راز نہیں۔

بہر حال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدام کے کلام سے کرتے رہے ہیں
اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعر نے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے

اور لوگ تعجب ہو کر اُن سے پوچھتے تھے کہ کس تقریب سے یہاں تک نہیں پہنچا؟ تو وہ صاف صاف اپنے
خیال کا ماضی بتا دیتے تھے ابو نواس **فضائل بن بیت** کی شان میں یہ شعر

کہا تھا۔ ”وَلَيْسَ لِلَّهِ مِثْلٌ شَيْءٍ ۚ إِنَّ حَيْثُمُ الْعَالَمُ فِي وَاحِدٍ“ (یعنی خدا سے یہ بات بعید
نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کرے) اسپر کسی نے اُس سے پوچھا کہ یہ

مضمون کیونکر سوچا؟ ابو نواس نے صاف کہہ دیا کہ یہ خیال جبریر کے اُس شعر سے
پیدا ہوا جو اُس نے نبی شہید کی تعریف میں کہا ہے۔

پھر اُسکو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اُسکے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معشوق کے حُسن ذاتی سے کچھ دلچسپی نہیں کھتا بلکہ عارضی بناؤ سنگار پر فریقہ ہے تیسرے عشق جو ہمیشہ بے قصد و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اُسکو قصد اور ارادہ سے پیدا کرنا چاہتا ہے

مرزا غالب

زمانہ عہد میں ہے اُکی محو آرائش ^{حروف} بنینگے اور ستارے اب آسمان کے لیے

ظاہر یہ خیال سی فارسی شعر سے قصد یا بلا قصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو اصل خیال کے باندھنے والے سے بالکل چھین لیا ہے جو خلل تغزل کی حالت میں اُس میں موجود تھے وہ صبح کی حالت میں بالکل نہیں ہے مرزا نے مروج کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کاملتر اور فصل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہو۔ اس لیے ہر شے اپنے تئیں کاملتر حالت میں اُسکو دکھانا چاہتی ہے اور اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زریب زینت کے لیے اور ستارے پیدا کیے جائیں اس پر سوا اسکے کہ کوئی منطقی ^{مستند} اعتراض کیا جائے اور سیطرہ کی گرفت نہیں ہو سکتی بجز فارسی شعر کے کہ ٹکی بنا خود اصول شاعری اور آداب عشق و محبت کے برخلاف ہے۔

سہو تفسیر و تلمیح

عرفی شیرازی کتاب ہے۔

”ہر کن شناسندہ رازست و گرنہ اینہا ہمہ رازست کہ معلوم عوام مت“

غالب مرحوم اسی مضمون کو دوسرے لباس میں سطح جلوہ گر کیا ہے۔

ہمارے حال کی کیا خبر ہے۔ تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے ذہول نہ ہوتا
کا زیادہ ثبوت ہوتا " میں نے غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

ہوا مخالفِ شبِ تار و بحرِ طوافِ خیر ^{مستطاب} گستاخِ لنگرِ کشتی و ناخدا ^{مستطاب} خفتست

وہ یہ شعر سن کر ہنسنے لگا اور کہا کہ ہاں بس میرا ہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے
کہ قدیم کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جسکو پچھلے پورا کرتے ہیں۔ کبھی قدیم
ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں متاخرین اُسکے لئے ایک نرا
اسلوب پیدا کر دیتے ہیں۔ اور کبھی متاخرین قدیم کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کر کے
ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس
کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تختل پر بھروسہ کر کے قدیم کی خوشہ چینی سے
دست بردار ہو جائے۔

شفائی صفائی یا متاخرین شعراے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں

کتاب ہے۔

”مشاطہ را گو کہ بر سبابِ حسنِ دستِ چینے فروں کند کہ تماشا بمار سید“

قابل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پسند کے لئے معشوق کے معمولی بناؤ سنگا
کافی نہیں ہیں پس مشاطہ کو چاہیے کہ انہیں کچھ اور حُسنِ فاضل کرے کیونکہ اب اُسکے دیکھنے
کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں حدت تو پیدا کی۔ مگر چھپسینڈی۔ اول تو
اُسے جسکو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اُسکی محبت کا نقش اُسکے دلیں نہیں

اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ کچھ شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون
 اخذ کر کے انہیں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا تبدیلی کر دے جس سے اُسکی خوبی یا شائستگی یا وضاحت
 زیادہ ہو جائے وہ حقیقت اُس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے مثلاً سعدی
 شیرازی کہتے ہیں۔

”از رطہ ما خبر نرنداز
 نے مہر جو دریا کے نہر سے برہنہ ہے۔“
 اسودہ کہ بر کنار دریاست

اسی مضمون کو خواجہ حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے۔
 ”شبے تاریک و بیم موج و گردِ نابل چنیں نابل“
 کجا دہشتِ حال با سبکِ اربابِ ساحل“
 ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اُس کی کوپور کر دی ہے جو ریشخ کے بیان میں رہ
 گئی تھی پس کہا جاسکتا ہے کہ حافظ نے ریشخ سے یہ مضمون چھین لیا۔ اسی مطلب کو نظیری
 نے یوں تعبیر کیا ہے۔

”بذریعہ ریشخ گل افی گزید بلبل را“
 خدوئی تکلیف پس بھی نہی
 نوا اگر انِ خورده گزند را چنبر“

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جسکے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ
 حافظ سے مضمون چھین لیا۔ لیکن اُس نے مضمون کو ایسے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل
 ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح مذاق
 رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے۔ ”کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور تنجیدیں
 کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور بہت کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ میدردو
 کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور بہت کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ میدردو

مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر چال کر سیاں کا
مضمون باندھا ہو۔

مذکورہ بالا تقریر سے ہمارا مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدامت کے کام سے کوئی بات
اخذ نہ کریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے ہیں اب اس کو کسی پہلو سے نہ باندھیں۔ یا اپنی باندھ
ہوئے مضامین کا پھر اعادہ نہ کریں کیونکہ بغیر اسکے نہ صرف شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر صنعت
میں کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ ^{تعلیف غزل} ابن زبیر جو ایک مختصر می شاعر اور آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مداح ہے وہ کہتا ہے۔

” مَا أَرَا نَا فَوَلَّ الْأَمْعَادَا أَوْ مُعَادَا مِنْ قَوْلِنَا مَكْرُورَا “

یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اورونکے کلام سے مستعار لیکر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو باریک
دوہراتے ہیں (اپس جب کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شعر کا ایسا خیال تھا تو ہم
کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قدامت کی خوشہ چینی سے ہم کو مستفاد حاصل ہے یا ہمارے یہ قدرت ہی کہ
کوئی مضمون ایک دفعہ باندھ کر پھر اس کا اعادہ نہ کریں۔

عربی میں دو مستعار قرض شملیں مشہور ہیں ایک یہ ہے کہ ” كَمْ تَرَكَ الْأَوَّلُ لِالْآخِرِ “
(یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں) اور دوسری یہ ہے کہ ” مَا تَرَكَ
الْأَوَّلُ لِلْآخِرِ شَيْئًا “ (یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا) ابن زبیر
میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ اگلے بہت سی اور دوسری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے اگلوں
پورا کریں لیکن انھوں نے پچھلوں کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا فائدہ موجود نہ ہو۔

۲۳۔ اسے جنوں سمجھو سو داسے زلف کی قسم ہے جو گریبان کا ایک تار بھی بیکار جانے دے جس دیوان سے ہنسنے یہ ایک مضمون کے ۲۳ اسلوب بیان نقل کیے ہیں کیچھ پور دو سو صفحہ کا دیوان ہے۔ جب ایک مختصر دیوان کا یہ حال ہے تو اردو کے تمام دیوانوں میں دیکھنا چاہیے کہ یہی ایک مضمون کتنی شکلوں میں باندھا گیا ہو گا۔ اور اگر فارسی کے دیوان کو بھی انہیں شامل کر لیا جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اسی ایک مضمون کے اشعار سے کتنی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ مضمون ایسا ننگ ہے کہ اس میں ایک دو اسلوب کے زیادہ گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ غزل کے وہ معمولی مضامین جن میں اس مضمون کی نسبت زیادہ پہلو کل سکتے ہیں۔ انہی کہاں تک نوبت پہنچی ہوگی۔ جیسے جفا یار رشکِ اغیار۔ شوقِ وصلِ رنجِ فراق۔ زلفِ پریشان۔ چشمِ قمان۔ بتِ پرستی۔ تلو بہ شکنی۔ رندی و بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ اگر تمام فارسی و اردو کی غزلیات کا خلاصہ کیا جائے اور مکررات کو چھوڑ کر محض اصلی مضامین چھانتے جائیں تو سو سو اسو صفحہ سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی۔ اور اگر یہ اہم لازم کیا جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو ان سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بیشک اس سے کسی قدر مقدار بڑھ جائے گی۔ مگر کثرتِ عمدہ پہلوؤں کے کلام میں نکلیں گے۔ اور ان کے فضائل متاخرین کے کلام میں یہی چاک گریباں کا مضمون جو متاخرین میں سے ایک نے ۲۳ طرچ پر باندھا ہے میر تقی کے ہاں اس طرح بندھا ہوا ہے۔

”اے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ ہے
دہن کے چاک اور گریباں کے چاک میں“

۸۔ اُسکی تحریر سے میں ایسا دیوانہ ہوا کہ پیرا ہن چاک کر ڈالا۔

۹۔ اُسکی چست قبا کا دہن دیکھ کر گریبان پھٹتے ہیں۔

۱۰۔ اے جنوں دامن کی طرح گریبان کے بھی لتے لے۔ بھاڑ ڈال

۱۱۔ دیکھیے ہم کب تک کپڑے پھاڑتے ہیں اور کب تک ہم کو جنوں سوزن کی طرح ^{سوز} عریا رکھتا ہے۔

۱۲۔ اے جنوں اب جامہ درمیست کر ہم دامن کو پھاڑ کر کب تک گریبان میں رہ کر رہیں۔

۱۳۔ بہار میں ہاتھ کیسے بیکار ہیں آؤ گریبان ہی چاک کریں۔

۱۴۔ اے جنوں گریبان مجھ کو پھانسی سے بھی زیادہ تنگ کرتا ہے۔ اُسکی دھجیاں اُڑا دے۔

۱۵۔ اے جنوں اب کے سال بہار میں گریبان کو ایسا چاک کر کہ کسی سے رفو نہ ہو سکے۔

۱۶۔ تم تو ہاتھ سے دامن چھڑا کے نکل گئے ہم اپنا گریبان چاک کر کے نکل گئے۔

۱۷۔ جنوں جو جا سے بڑھا تو گریبان چاک ہو کے دامن سے نکل گئے۔

۱۸۔ مجھے چاک گریبانوں پر حسرت آتی ہے کہ کیسے دامن صحرائی طرف دوڑے جاتے ہیں۔

۱۹۔ ہمارے ہاتھ جنوں کی بدولت زمر وں پر ہیں کہ نئے نئے گریبان چاک ہوتے ہیں۔

۲۰۔ اے جنوں تیرے ہاتھوں سے کتنا تنگ ہوں روز نئے گریبان کہاں سے لاؤں۔

۲۱۔ اُسکے عاشق ہمیشہ گریبان چاک رکھتے ہیں گل کے گریبان میں کہیں بھی رفو ہے۔

۲۲۔ بہار آئے پھاڑنے لگا کتنے ہی گریبان چیتھڑے ہو ہو کر اڑ گئے۔

دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہ میں ڈال سکتا ہے۔ مگر پھر اس کی تسلی کھالجاتی ہے۔ ہر کوئی اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ بہر و پیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھ کر شاعر وہیں جاتے ہیں تو اپنے ولیں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے لگ اور اچھوتے مضمون باندھ کر لے چلے ہیں مگر غزل کو دیکھتے تو وہی انگریزی ٹھانی کا جس پر کہ ٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزاسب کا ایک فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متغیر ساپنچے تیار ہیں کوئی مدور ہے۔ کوئی مستطیل۔ کوئی مثلث۔ کوئی مربع۔ کوئی مسدس اور کوئی کین۔ اب ہر ایک ساپنچے میں موم کو گچھا کر ڈالو۔ غلط ہے کہ ہر ساپنچے سے موم ہی شکل پر ڈھل کر نکلیگا۔ بعینہ ایسا ہی حال غزل کا ہے۔ مضمون وہی معمولی ہیں۔ مگر بحر اور ردیف و قافیہ کے خلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔

ایک مشہور شاعر کا دیوان غزلیات اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں

چاک گریباں کا مضمون ہفصلہ ذیل صورتوں میں بندھا ہوا ہے۔

۱۔ ابے جنوں گریبان تو چاک کر چکے اب کیا کریں کوئی اور شغل بتا۔

۲۔ لوگ پھر جامہ درسی کرنے لگے۔ اور ہمارا ہاتھ پھر گریبان تک جانے لگا۔

۳۔ ہمارے دن قریب آگئے جو گریبان خود بخود پھٹا جاتا ہے۔

۴۔ اگر بہار میں میری پو شاکی نہ چھپیں لیجائی تو بدن پر نہ دامن نظر آتا نہ گریبان۔

۵۔ اگر عقل کی پابندی نہ تھی تو ہم دامن اور گریبان سب پھاڑ ڈالتے۔

۶۔ وہ ہاتھ چھوڑ کر چلا گیا میں بھی اب گریبان کو پھاڑ کر چھوڑ دینگا۔

۷۔ اسے جنوں ہم جدائی میں گریبان پھاڑتے ہیں تو ساری رات اس کے تار گنتارہ۔

ایک ہی۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو انہیں کسی قدر طولانی مضمون بھی بند کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہر ایک مضمون کی کیفیت: بیچ اور شام کا سماں۔ چاندنی رات کا لطیف جنگل یا باغ کی بہار۔ میلے تماشوں کی چل پھل قبرستان کا سناٹا۔ سفر کی رونا ردا۔ وطن کی دوستی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں سلسل غزلیں بہت غریبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہان تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے انسان کو اگر ہمیشہ طرح طرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تک تاؤں اور تنوع نہ ہو اُنے جی اکتا جاتا ہے جو گونا گویا صبح شام رات اور دن بھیرویں ہی لاپے جائے اسکا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ یہی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعرے نفرت ہو جاتی ہے۔

”مکر گرچہ سحر آمیز باشد طبیعت را ملال انگیز باشد“

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے۔ یہی طرح ایک ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور محاوروں میں اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہو جاتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اُس کو تھپتھپ چلے جائیگا تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگیگا۔ ہر وہی

اور چونچال نہو دونوں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاصرین کے لئے سوز و گداز کا استقدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک نہ نہیں نکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچل نیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کوئلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں چھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو نئے گرویش میں سوکتے چلے جاتے ہیں پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں اُنکی جگہ لیتی جاتی ہیں۔ اور یہ کوئی گنگا جمن کی طغیانی نہیں ہے جو اس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے ہجائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام زمین پر پانی پھر نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صد ہا تاشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظراتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اسکی ^{مستند ہا و نمبر} جزئیات کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کسی واقعہ کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا۔! کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو گا۔ اور کبھی یاس و لہر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں باقی زیادہ دیکھ پ میریل ^{میریل} غزل کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال ^{دولت علی} ہندی کے زمانہ میں زیرِ باتھیں اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نہو دار ہوئی۔ اب کا لنگڑے اور ہناگ کا وقت نہیں بلکہ اب جو گئے کی الپ کا وقت ہے۔

اسکے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے۔ بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک

اسکے برخلاف حالت ظاری ہو۔ دونوں صورتوں میں ہمارے مومن سے وہی صدا بگنی چاہئے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گذرے کہ مثلاً گوش و تدبیر ہما و محض بے سود و لا حاصل معلوم ہو۔ اور وہ سب وقت ہمارے ہی دلیں ایسا گوش ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں ہما کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے۔ اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و عوالم اور جو انقلاب کہ اُنکی طبیعت میں آنا فانا پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہونگے۔ بلکہ قومی خلاق پر بھی عمدہ اثر ہوگا کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور بُرا دونوں پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً **صائب** ایک جگہ کہتے ہیں۔

قناعت کن نہ نالے خشک تابے آرزو گردی کہ خوشی سے الوان ست نعمت ٹائے الوان
دوسری جگہ یہی **صائب** کہتے ہیں۔

صف بیکاری مگر داناں و زگار خوش را پر وہ روی تو کل ساز کار خوش را

ظاہر ہے کہ جیتکے دونوں مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تناسلی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشق مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کامیابی انتظار اور رشک اغیار کے بیان میں ہے وہ وعظانہ نیند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو موثر پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور بلاشبہ غزل جہیں سفر و گداز نہواور پتہ جو چلایا

اگر ہم اپنے شعر کا حارے زیادہ ادب کریں تو **سعدی** اور **سوزنی** کی
 بیلیات سے زیادہ وقت نہیں دے سکتے۔

۱۔ مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے۔ خواہ اُسکا
 منشا خوشی ہو یا غم۔ یا حسرت۔ یا مذمت۔ یا شکر۔ یا شکایت۔ یا صبر۔ یا رضا۔ یا قناعت
 یا توکل۔ یا رغبت۔ یا نفرت۔ یا رحم۔ یا انصاف۔ یا غصہ۔ یا تعجب۔ یا امید۔ یا ناامیدی
 یا شوق۔ یا انتظار۔ یا حُب وطن۔ یا قومی ہمدردی۔ یا رجوع الی اللہ۔ یا حمایت دین و مذہب
 یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال۔ یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے۔ اُسکو بھی غزل
 میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں
 ہے لیکن ہمارے شعر نے اُسکو ہر مضمون کے لئے عام کر دیا ہے۔ اور اب اس صنف کو محض محبت
 غزل کہا جاتا ہے پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں قافوقاید ہوں۔ وہ غزل
 یا رباعی یا قطع میں بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے قصداً
 سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی رگ گاتے ہیں اور انھیں کے خیالات
 کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہر چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا ارگن
 بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لئے ہاتھ پانو مارنے اور کوشش کرنے
 کو عبث اور فضول بتلایا ہو لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حسرت ہو۔ یا انھوں نے اس کے
 برعکس پانہ توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل

کیونکہ قلم صنع میں کبھی خطانہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اُس نے لکھ دیا ہے وہ اُس کے
اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اس لئے اُس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوں کا قصداً ایسے الفاظ برتتے
تھے جن سے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اسی لئے مولانا روم فرماتے ہیں
”خوشتر آں باشد کہ سر دلبر ^{دور} آید و ز حدیث دیگر آں ^{دور} آید“

ان بزرگوں کے سوا بعضے شعر ایسے بھی گزرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی
تھے اور نشہ یا خمار کی حالت میں جو کیفیت اُن کے دل پر گزرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت یا اخلاق
پر ہوتا تھا اُس کو شعر میں بیان کرتے تھے چونکہ شاعری کا جزو عظم (جیسا کہ اوپر بیان
ہو چکا ہے) یہ ہے کہ اُس میں جو خیال باندھا جائے اُس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے
اس لئے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف اُن لوگوں کا
حق ہونا چاہیے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات و خمریات کے
پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں نہ وہ قدما کے ایسے ہی تقلید سمجھے جائیں گے

جیسا بنا رہا انسان کا ہوتا ہے۔ نیز و اعط و زاہد و غیبہ کو تارنا اور اُن پر نکتہ چینی کرنی
اُنھیں لوگوں کو زیب ہے۔ جن کو فی الواقع اُن کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ تا
باوجود نہونے کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے وحشی طور پر ایسے مضامین باندھے
جاسکتے ہیں یعنی نکتہ چینی ایسے طریقے سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس
کی بُرائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زُہاد اور عظیمین کی ذلت پر حملہ کرنا کیونکہ زُہاد کی

جو بہترین طریقت ہی اُس سے محفوظ ہیں^{۱۱} یا اسلئے کہ عشق و محبت کی بھٹہ اس آزادانہ اور
 زندانہ گفت گو میں نسبت بخندہ اور مودب گفت گو کے خوب نکلتی ہے^{۱۲} اور یا اس غرض سے
 کہ حرفیوں کو چھپر ٹھکر اور زیادہ بھڑکائیں۔ اور اُن کی زیر و ملاست جو بے گناہ بلرموں کو
 تحسین و آفرین سے زیادہ خوش گوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سنیں (روحانی کیفیات
 کو شراب و شادی کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ سب کے اخیر و جد کا ثبوت مولنا روم کی
 اس رباعی سے ہوتا ہے۔

وی بر سر کوئی زلہ غارت کردم ^{توٹ} میرا پاں را جذبِ یارت کردم ^{سود}
 شکرانہ آنکہ روزہ خوردم ^{روزہ} در عید نماز بے طہارت کردم ^{نستعلیق}
 شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رمضان میں روزے
 کھانے کے یعنی ہیں کہ کھج مجاہدہ سے مشاہدہ تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک
 کر دی گئی۔ اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید مینسرا گئی اور جدائی کا
 الم جاتا رہا۔ اب حضور بے کیف جو کہ حقیقت صلوٰۃ ہے بروقت پہنچ گئی۔ بھانٹاک کہ
 ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگتے اور سوتے غرض کہ ہر حالت میں ولایت حضور ہی ہو
 خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔

پیر یا گفت خطا ورت لم صنع نہ رفت ^{فدا کی کار میری} آفریں نظر پر پاک خطا پوشش باد
 دوسرے مصرع میں خطا پوش کے لفظ سے قلم صنع کی خطا پوشی کا خیال نہیں
 گذرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے

دوسرے اہل راس کے فقہاء کے فتووں سے ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں۔ دایر پر چڑھائے گئے ہیں۔ مشکبیں بندھی ہیں۔ کورے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں۔ جلاوطن کیے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں اور اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جبکہ فقہاء کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں شریعہ یا نظم و ضبط کے تجارت نکالتے تھے۔ بقول شخصے: "کیا کا تھ چلے کیسی زبا" فقہاء و ائمہ کے اقوال و افعال پر کثرت کرتے تھے۔ انھوں نے اُنکے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا شلخواری و قمار بازی جو کب لکھا نہیں وہ بھی جو فروشی و گنہ گام خالی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا علانیہ کفر کچا اس سے بہتر ہے کہ دلیں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے کچھ نے کہا کہ اوروں کو بدہمت کرنے اور آپ کو رو رہنے سے بڑھکر کوئی گناہ نہیں وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الہی اور انہیں کرتے۔ انھوں نے کہا تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شرع سے تصوفین نے جو اہل ظاہر و خبیثہ رو گریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تقریضات اور مٹا رجات ہیں۔

اسکے سوا ان لوگوں کی غزل میں کثرت شراب و ساقی و جام و صراحی اور انکے لوازمات اور خلاف شرع الفاظ مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں یہ لوگ (یا تو اس خیال سے کہ دوست کار از اغیار پر ظاہر نہ ہو۔ یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسن ظن

حاضری ہوں یا جس عشق روحانی یا عشق آسمانی پر محمول ہو سکیں اور جسے مطلوب کے مروجہ عورت ہونا سلتقانہ پایا جائے۔ کیا فارسی اور کیا اردو و دونوں زبانوں کی غزل میں بکثرت مروج ہیں خصوصاً شعراے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں پس غزل میں ہمیشہ کے لیے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہو چکو تکلیف بالا اطلاق سمجھا جائے

۴۔ بطرح عشقہ مضامین غزل کے پچھتر سالہ جن میں سوطح خمریات یعنی شراب اور اسکے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہاء و شاعروں کا بیان طعن و تعریض کرنی اپنی سیخواری و توجہ شکنی و خرابا پر نشینی پر فخر کرنا اور اہل شیعہ اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شعاع کے خلاف ہوں۔ یہ مضامین بھی غزل کے اجزاء

غیر منفک قرار پاتے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعراے متصوفین نے جو اہل انداد صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی و رومی و حافظ و خسرو و غیر ہم چونکہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسن قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جن میں ان مضامین کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے حد سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ اس لیے متاخرین نے بھی انہی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا مگر

مشہور و مقبول ہونے کے لیے مضامین باندھنے میں اس قدر غلو کیا ہے۔ اس کا ہر کوئی کھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اس قدر غلو کیا ہے۔ اس کا

منشا کیا تھا۔

فقہاء اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہل باطن کے

کا مقتضی ہوتا ہے۔ مثلاً ذوق کہتے ہیں

”جھانکتے تھے وہ ہمیں جس وزن دیوار
و اسے قمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا“
یا امانت لکھنوی کہتے ہیں۔

شاعروں میں وہ پری زلف کو داکیا کرتا ^{مشتعل} موش گافوں کو گرفتار بلا کیا کرتا
غرض کہ کسی اردو غزل گو یوں ^{مکھوٹ} مشوق کے لئے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے فعل یا صفت
بیکر استعمال نہیں کی۔ ^{نورث}

اگر مشوق کو ^{تسلیم} طلاق کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت ^{تسلیم} رجال یا نسا
کی غزل میں ذکر نہ کیا جائے تو اس صورت میں افعال و صفات کا ذکر لانا بالکل قاعدہ کے
موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق
انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع
انسان میں ذکر و اناث دونوں داخل ہیں مگر اس حکم کا موضوع ہمیشہ فرد کامل یعنی مذکر قرار
دیا جاتا ہے نہ مؤنث۔ مذہب میں فلسفہ میں طب میں۔ اخلاق میں اور تمام علوم میں ^{تسلیم}
میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے۔ لیکن مشوق کو کبھی چیرہ یا قبایا سبزہ خط کے ساتھ اور
کبھی چوٹی موہاف آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اسکے افعال و صفات
کو ہمیشہ مذکر لانا اسکے یہ معنی ہوں گے کہ مشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت۔ بلکہ زنانا
ہے یا ہیچڑا۔

ایسے اشعار جنہیں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر

باتیں ایران اور ہندوستان کے بٹے بڑے پرائتموں کے کلام میں موجود ہیں۔ اگر ہم آج ویسی باتوں میں انہی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھہرتے ہیں پس جہاں ہم نے انہی بہت سی خرافات مواخذہ عدالت کے خوف سے چھوڑی ہیں انہی ایک آدھ خرافت محض عقل و راجل کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیے۔

اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اُس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو۔ کیونکہ اگر مشوقہ کوئی سن کو جو یا مخطوبہ سے تو اُس کے حسن و جمال کی تعریف کرنی اور اُس کے کرم و ناز و انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے سنگ ناموس کو اپنیوں اور پرائیوں سے انشروڈیوس کرانا اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالائقی یا بدبختی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ اسی بنا پر ایران میں جلنے ممتاز اور برگزیدہ اور اعلیٰ درجہ کے غزل گو گزرے ہیں۔ اُن کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اس قدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں۔ اور اتنی بات بہتک ہندوستان میں بھی موجود ہو کہ گو غزل میں مطلوب کبھی مر کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں اور کبھی مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن کبھی مطلوب کے لیے افعال یا صفات نوشت نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں مثلاً یوں کبھی نہیں کہتے کہ وہ روزن دیوا سے جھانکتی تھی۔ یا وہ پری ہمارا دل لے گئی۔ یا وہ آرسی میں مونہ دیکھتی تھی۔ یا وہ بالے پہن رہی تھی۔ یا وہ اپنی صورت کی متوالی ہے۔ یا وہ عاشق کا دل جلائے والی ہے بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں۔ حالانکہ مقام تانیث

اور حتی یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی پاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اسکا
 سربزاد مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں سرکہ بچانے کے بعد در قارم ہونا
 لیکن اصل و نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے جو کیفیت عشق میں ہے وہ عشق میں ہرگز پیدا
 نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیدِ عاشقانہ لکھی جاتی ہیں انہیں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک
 بھانڈی نقل میں جو بنوں یا فراد بنکر مجلس میں آئے۔ اتر قائل و رسامعین کی حالت کا
 تابع ہے۔ لگ قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دلیں فی الواقع کوئی کیفیت موجود
 تو اس کیفیت کا بیان ضرور مؤثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ
 اپنی سرگزشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہ
 بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جسکی حالت خود اسکی تکذیب کرتی ہے تو اس
 سولے اسکے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ پس ایک پارسانو جوان جو کہ
 ہوا ہو س کی کبھی ہوا تک نہیں لگی۔ یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں ہوا ہو س کی قابلیت نہیں
 رہی انکو ہرگز زبیا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاید باری اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا
 اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں سولا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا ہو س اور شاہد باری و کام جونی پر موقوف نہیں ہے۔ بندہ کو خدا کے ساتھ
 اولاد کو ماں باپ کے ساتھ۔ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ۔ بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ۔ خاٹہ
 کو بی بی کے ساتھ۔ بی بی کو خاوند کے ساتھ۔ نوکر کو آقا کے ساتھ۔ رعیت کو بادشاہ کے ساتھ۔
 دوستوں کو دوستوں کے ساتھ۔ آدمی کو جانور کے ساتھ۔ کہیں کو مکان کے ساتھ۔ وطن کو

تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بچ سکتی۔ بواہو سی اور کامجونی کی باتوں میں جو فراسے وہ خالص
 عشق و محبت میں شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ ادب و باش والو اط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹا
 وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے۔ جن مذاقوں پر کلام و مطابہ کا رنگ
 چڑھ جاتا ہے اُنہر حکت اور اخلاق کا منہ تر کار گر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرسکا جل کنگھی چوٹی
 و نفیت میں وہ حُسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ با آواز بلند کہہ رہا ہے
 کہ یا عمارت کی تریسیم ہوگی یا عمارت خود نہوگی۔

غزل کو جن لوگوں نے چکایا اور قبول خاص و عام بنایا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آج
 اصل اللہ اور صاحب باطن یکم سے کم عشق الہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے
 سعادی۔ رومی۔ خسرو۔ حافظ۔ عراقی۔ مغربی۔ احمد جام۔ اور جامی وغیرہ۔ ان بزرگوں سے
 پہلے غزل کی طرف زیادہ عتسنا نہیں پایا جاتا۔ ہے چیات سعدی میں کسی موقع پر
 بیان کیا ہے کہ انجی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ
 حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ اُنکے ایک ایک لفظ سے
 پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شور مچاتے تھے۔ انکے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز
 جسکو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انجی غزل سنکر دنیا کی بے تباہی اور بے

اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خال خط کا ذکر طسج کرتے ہیں جس سے شادی پستی
 کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی ہستی کو دنیا دار کا رقص
 ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ زندگی و دنیا کی ورسوائی کو صوفیوں کی دلق ملتے اور

دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل
برداشت قیدیں کس قدر ہلکی کر دی جائیں منسلک ہو سکتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی بہت اگر وقت سے
ساتھ کی تو ہم چھ کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان
ساعت کی تو ہم چھ کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔

کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام صنایع سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے کھٹے پڑے
اور ان پڑے سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اسکا چٹخا رار
ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں۔ وجود و سماع کی مجلسوں میں۔ اہو لعب کی صحبتوں میں
نیکوئیوں میں اور روضوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اسکا اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند
یا نایاب کلام کے پڑھے جاتے ہیں جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبریں اور شرائط نظم میں
چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں کھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں
جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا
کیونکہ انہیں ہر مضمون دو مصرعوں ختم اور سلسلہ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو
صنف قوم میں استدار و سائر اور غریب خاص و عام ہوا اسکا اثر قومی مذاق اور قومی خلاق
پر جقدر ہو تھوڑا ہے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک شعر اکو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف
متوجہ ہونا چاہیے۔ لیکن غزل کی اصلاح جقدر ضروری ہے اسقدر دشوار بھی ہے غزل میں
جو عام و لغزبی ہے اصلاح کے بعد اسکا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کلام شے ٹھہری سے مانوس
ہو جاتے ہیں وہ دُھرت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ دستار دہننے والوں کی پیا

غزل کی ذیل میں حوصل کرتے ہیں۔

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الا ما اشار الیہ
بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج
سوج و حشیت کے ساتھ اول بیان میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس ہندوستان میں ہوا ہے اگرچہ

غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشق و مضامین کے لیے ہوتی تھی
مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں کشت اور ہندوستان میں چند
شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے غزل میں عشق و مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و

کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کجیات فی زمانہ نہایت اتر ہے۔ وہ محض ایک سو دو
دوران کا صنف معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ شاعر کو مضبوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا

موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت تخیل دیکھا بھی نہیں سکتی اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً بوقت
شاعر کے ذہن میں فی الواقع گذرتے ہیں یا تازہ کیفیات جسے اسکول روزمرہ کوئی قصہ کو سنکر

یا کسی حالت کو دیکھ کر سچ سچ متکشف ہوتا ہے۔ ان کے اظہار کا کوئی آگے غزل یا رباعی یا قطعہ
بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں

ہو سکتے انکو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اور چند بسیط خیالات جو ایک
غزل کے سنی لغت میں شعبانہی کرنے اور جوروں سے مخاطب ہونے کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں مزیڈا غزل
میں عشقیہ۔ یعنی زید عشق کے مضامین عموماً بہتر انداز میں ہے۔ یا زید عموماً زیادہ عشق پر ہے ۱۷

روڑا اٹھا دیتی ہیں۔ وہ جسطرح منوعات پر باطح حریف ہے اسی طرح تکلیفات سے باطح ہوا
 کونے والا ہے۔ انشاء اللہ خاں جب تک مطلق العنان ہے سعاد و تعلی
 کے دربار میں نئے شگوفے اور چٹکے پھوڑتے اور بات بات پر لطیفے انشا کرتے تھے لیکن جب
 سعادت علی خاں نے یہ کر لگا دی کہ ہر روز وہ ایسی نئی باتیں بیان کر دیا کہ وہ کبھی دستی ہوں
 وہی انشاء اللہ خاں تھے کہ پاگلوں کی طرح گلی کوچوں میں لڑکوں سے پوچھتے پھر کرتے تھے
 کہ بھٹے کوئی نئی بات بتاؤ۔ آخر اسی جہوں میں طبعی پاگل ہو گئے۔ یوروپ کے ایک زبردست شاعر کا
 حال سنا ہو کہ جب اپنے آئندہ تصنیفات کا کاپی رائٹ کسی پبلشر کے ہاتھ فروخت
 کر دیا تو وہ کہا کرتا تھا کہ اس معادہ سے میری طبیعت بند ہوئی جاتی ہے جب کچھ لکھنے بیٹھتا
 ہوں ساتھ ہی یہ خیال گذرتا ہے کہ اب ہم کچھ لکھتے ہیں اپنے دل کی اچ سے نہیں بلکہ اپنا معادہ
 پورا کرنے کو لکھتے ہیں۔ اس خیال سے طبیعت خود بخود بڑھی جاتی ہے۔

بہر حال جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اس وقت تک اسٹھانی نہیں چاہیے۔ جب تک
 کسی چپٹک دلکو نہ لگی ہو کسی کی ریں سے کسی کی فشار سے کسی کے دباؤ سے۔ یا کسی
مجبوری کے سبب۔ غیر قرضے طبعی اور دلولہ باطنی کے جو شعر کہا جائیگا۔ یا جو قسم سب سب
 جائے گی۔ انہیں اثر اور زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے۔

پانچویں صنف مخن میں سے تین ضروری صنفیں جنگا ہماری شاعری میں
 زیادہ رواج ہے یعنی غزل قصیدہ اور شہنوی ان کے متعلق چند شورے دیئے جاتے ہیں۔
 سب سے اول ہم غزل کا ذکر کرتے ہیں اور ایک خاص نسبت کی وجہ سے رباعی اور قطعہ کو

کے کلام میں بھی تک باقی رہ سکتا ہے کہ کوئی شے اسکی آزادی کی مجرماً نہ ہو یا اسکی آزاد
طبیعت کسی خوف اور روک ٹوک کی کچھ پروا نہ کرے۔ ورنہ ممکن ہے کہ جس مضمون کا جوش فی الواقع

اسکی طبیعت میں موجود ہے اسکو وہ عموماً اور خوبی کے ساتھ ادا نہ کر سکے۔
آزادی کی مزاحمت کئی طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی شاعر کو کسی کا خوف اپنے خیالات آزادانہ

ظاہر کرنے سے مانع ہوتا ہے۔ چنانچہ **شیر عرقہ اور حکیمیت** بن زید جو نہایت بڑے
شیخی تھے انکی نسبت کہا گیا ہے کہ جو کچھ انھوں نے بنی ہاشم کی بیچ میں کہا ہے وہ شاعر
کے لحاظ سے اُس درجہ کا نہیں ہے جیسے بنی ہاشم کی بیچ کے قصیدہ نگار۔ لیکن اسی مزاحمت آزاد

طبع شاعر کے جوش کو بعض اوقات اور زیادہ ابھارتی ہے۔ **جگر برکی** کے مرثیے
لکھنے پر گو قتل تک گئے۔ **بابر** نے اُسکے مرثیے ایسے جوش و خروش کے ساتھ

ہیں کہ آج تک یادگار ہیں۔ **یالاج اور طبع** یا اور کوئی **غریب** اسکی طبیعت کے بہادری کا خیال
کبھی سوسائٹی کا دباؤ۔ **یالاج اور طبع** یا اور کوئی **غریب** اسکی طبیعت کے بہادری کا خیال

رستے سے دوسری طرف پھیر دیتی ہے۔ یہ افتاد ہمارے اکثر شاعروں پر پڑی ہے اور
اسنے بہت سے ہونہار اور روشن طبع شاعروں کو تہال و فحاش و خرقہ مک پنا دیا ہے۔

کبھی شاعر کے پیچھے ایک گز ایسی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے اسکو مجبور کچھ نہ کچھ
لکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً **تقریب یا تہوار شہنشاہیت کا قصیدہ لکھنا**۔ یا **ہفت یا عشرہ**

میں شاعر کی طرح پھرنے۔ انجام کرنی۔ گو بظاہر اس میں آزادی کی کچھ مزاحمت نہیں معلوم
ہوتی۔ لیکن انسان کی نیچے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ایسی گریں اسکی جلدی گاڑی ہیں

جو صاحب ایسے الفاظ ترک کرنے کی عام ہدایت کرتے ہیں انکی مثال ان لوگوں کیسی ہو جو آپ تو
 انسان میں تقسیم ہیں اور شمیہ جاننے والوں کو اجازت نہیں دیتے کہ جڑا دل کا بوجھ اپنے ساتھ باندھ
 سردی کے بوجھ

لے جاتیں۔

اس مضمون کے متعلق زیادہ بحث کرنی فضول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جس ضرورت
 کے لحاظ سے ہم زبان کے دائرہ کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر فی الواقع وہ ضرورت
 پیش آنے والی ہے تو قیاس میں خود بخود اُٹھتی چلی جائیگی اور لوگوں کو بجائے اسکے کہ اپنی
 زبان کو تنگ اور محدود کریں مجبور و دوسری زبانوں سے دیروزہ گری کرنی پڑے گی۔ اور اگر
 اردو ٹیپو کی ترقی کا خیال ایسا ہی دور از کار خیال ہے جیسا مسلمانوں کی علمی تہذیبی اور اخلاقی
 ترقیات کا۔ تو یہ بحث پیش از وقت نہیں بلکہ ناوقت ہوگی۔

ترقیات کا۔ تو یہ بحث پیش از وقت نہیں بلکہ ناوقت ہوگی۔
 جو خفی بات یہ ہے کہ کثرت شعر کی طرف کمال میں متوجہ ہونا چاہیے۔ بعضوں
 کی پر اسے ہو کہ رات کو سوئیے پہلے اور دن کو طعام چاشت سے پہلے شعر میں طبعیت زیادہ راہ
 دیتی ہے کہ جسکی یہ کہ "و حشی مضامین کی رام کہ نیوالی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جیسا
 اب رمل اور نہائی اور بلند نشین" لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیے کوئی موقع اور محل اس
 بہتر نہیں کہ کسی مضمون کا جوش شاعر کے دل میں خود بخود پیدا ہو۔ پھر اُس کے لیے باغ اور جنگل
 آبادی اور دیرانی۔ بہرہ زار اور شہیل میدان۔ آپ ہاں اور پھر میں سب برابر سے پوچھو
 جب تک کہ بچوں کے گلہ ستارے کے سامنے نہ رکھے جاتے تھے۔ شعر کی فک نہیں کرتا تھا۔
 ابوالعشاہ نے ایک روز اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو نیوالی کے مضمون نہیں سوچتا

کی تاکید کی جائے۔

عام غلطی اور عوام کی غلطی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو غلط الفاظ خاص عام دونوں کی زبان پر جاری ہو جائیں وہ عام غلطی میں داخل ہیں ایسے الفاظ کا بولنا صرف برجانہ ہی نہیں بلکہ صحیح بولنے کے لئے ہر جا میں ہونا چاہئے۔ عام اور خوبصورت الفاظ کی زبان پر جاری ہوں نہ کہ خواص اور پڑھے لکھوں کی زبان پر۔ ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے جیسے مزاج کو مجاز کہنا، منکر کو ہنکنا، لکھوں کی زبان پر ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے جیسے مزاج کو مجاز کہنا، منکر کو ہنکنا، لکھوں کی زبان پر۔

کوئی خاص ناطق کو بے ناطق۔ دروازہ کو دروازہ۔ لٹخہ کو ٹٹخہ وغیرہ وغیرہ۔ انکے سوا بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کو استعمال کرتے ہیں جو شعر و نعت میں استعمال کئے جاتے ہیں اور دہلی کے بعض شعرا اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر روزمرہ کی بول چال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آجکل کی خاص عام برابر بولتے رہے ہیں۔ جیسے تئیں کچھو کسو۔ آئکے۔ آخرش۔ پھانا (پھانے کی جگہ) بتلانا۔ دکھانا وغیرہ۔ (بمعنی ہمیشہ) تلمک۔ سیت۔ سیت بجائے حرف نفی۔ بن (بمعنی بے یا بغیر)۔ (پرک جگہ) کیجے۔ دیجے۔ لیجے۔ بجائے کیجے۔ لیجے۔ میرا اور تیرا کی جگہ پر بمعنی مگر۔ اک بجائے ایک۔ (بمعنی عجیب یا نہایت)۔

یہ الفاظ شاید لکھتے نہیں ترک ہو گئے ہوں۔ یا ہو جائیں لیکن دہلی اور مصافات دہلی میں وہ کم و بیش برابر بولے جاتے ہیں۔ اور زمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بولے جائیں گے اور اگر بولنے نہ جائیں گے تو تحریر میں ضرور استعمال ہونے لگیں گے۔ شاید شریں بعض الفاظ کی ضرورت نہ پڑے لیکن شریں انہی ضرورت ہمیشہ رہیں گی اگرچہ ہمیں کام ہے کہ شعر کی بھی ضرورت ہوگی یا نہیں۔

غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً صم و صم بجائے صم و صم
حور بجائے حورار۔ ابدال بجائے بدیل۔ فضولی بجائے فضول۔ حضور قرآن
بجائے قرآن۔ مشاطہ بجائے مشاطہ۔ موسا و معجا و غیرہ بجائے موسات و معجات وغیرہ

انگریزی میں تمام دنیا کی زبانوں سے الفاظ لیتے گئے ہیں۔ مگر کسی لفظ کو اسکی اصلی صورت
 پر قائم نہیں رکھا مثلاً خلیفہ۔ ترجمان۔ مخزن۔ نواب۔ تعریف۔ قطن۔ امیر۔ عثمان۔ غزوہ
منازل۔ سپاہی۔ شمال۔ کاروان۔ شکر۔ قرمزی کی جگہ جو کہ عربی و فارسی زبان کے الفاظ
 میں کیلف۔ ڈریگمین۔ میٹ گریں۔ نیباب۔ ٹیرٹ۔ کائن۔ ایڈمرل۔ اوٹومن۔ پیرے
سیرٹ۔ سیپے۔ چنگول۔ کیرون۔ شگر۔ کرسن۔ بولتے اور استعمال کرتے ہیں۔
 اس طرح جہاں تک استقر کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جا کر

اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے۔ پس جبکہ یوم یا سبت یا انشا وغیرہ الفاظ ہمارے خاص عام
 سب کی زبان پر جاری ہیں تو اردو نظم و نثر میں انکو کیوں نہ استعمال کیا جائے کہ بات یہ ہے کہ
 ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اردو میں لیے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف
 عموماً مستعمل ہوتے ہیں سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے
 الفاظ ہیں۔ نہیں بلکہ انکو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے۔ جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا

انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ ایسے لفظوں کو غلط سمجھ کر ترک کرنا اور ان کو اصل کے موافق استعمال
 پر مجبور کرنا بعینہ ایسی بات ہے کہ لال ٹمین کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے۔ اور
لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے یا گھر بولنے سے روکا جائے اور گھٹ بولنے

بفتح یا۔ یا نشا بروزن وفا کہ عربی گریز بالذت کے موافق موسوم بروزن سجدہ اوریت

بجسویا اور نشا بروزن جدت ہی لیکن فی الحقیقہ یہ ایک غلطی ہے جو شہ ہمارے

عربی دانوں کو ^{linguist} **عکس** کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے انکو یہ معلوم نہیں ہے

کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر کبھی اپنی اصل صورت پر قائم نہیں

رہ سکتے۔ الا ماشاء اللہ۔ دور کیوں جاؤ ہماری اردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت پر گرت

اور بجا شاکے دخل ہیں۔ باوجود اسکے شاد و نادری ایسے الفاظ بکلیت کے جو اپنی اصلی صورت پر قائم

ہیں مثلاً گھر۔ گھڑا۔ اُجلا۔ آدھا۔ اندھیرا۔ آسرا۔ آئینہ۔ آگے۔ آگلی۔ یہ تمام الفاظ

سنسکرت کے مفصل ذیل الفاظ سے بڑے ہوئے ہیں یعنی گرہ گھٹ اُجل۔ آردو

اندھکار۔ آشرے۔ اکھی۔ اگر۔ اگر۔ اگر۔ اس طرح پر گرت اور بجا شاکے ص۔ ما لفظ اپنی اصل

کے خلاف ہماری زبان میں متعل ہیں مگر چونکہ ان کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں اس لیے

انکو صحیح سمجھ کر بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں لیکن عربی یا فارسی جس سے کہ انکو فی الجملہ واقفیت

ہو جہاں اسکا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی کی اردو نظم یا شریں دیکھا اور فوراً ناک

چڑھائی حالانکہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں مثلاً

غش بجائے غشی مسلمان بجائے مسلم۔ محافہ بجائے محفہ غلطی بجائے غلط

زیادتی بجائے زیادت سلامت بجائے سلامت مدیرہ بجائے مدیرہ مغیلاں

بجائے اُم غیلاں محابا و مدار وغیرہ بجائے محابات و مدارات وغیرہ کے علیٰ التقریب

فارسی کے الفاظ کبھی شہ اردو میں غلط بولے جاتے ہیں اسل بیان عربی کے صدار لفظ

برداشت از خبر نیواک

انہیں جوتے گئے۔

ہے چار ہی کو جو زیادہ تر گنہگاروں کے لئے ہے۔
 لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روبرو زیادہ تنگ کرتے جا رہے ہیں یہ مقررہ
 لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روبرو زیادہ تنگ کرتے جا رہے ہیں یہ مقررہ
 خلاف ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب نے ۱۸۶۹ء میں ایک رسالہ شعرو سخن کے متعلق لکھا ہے کہ
 لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روبرو زیادہ تنگ کرتے جا رہے ہیں یہ مقررہ

ہیں بعض انہیں سے خاص لکھنؤ کے ساتھ مختص ہیں۔ اہل دہلی کبھی اسٹیشن نہیں

جیسے اندھیارا۔ اندھیرے کی جگہ ابھی نہایت مناسب
 گینو کر کے گینو کر کی جگہ۔ ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب
 گینو کر کے گینو کر کی جگہ۔ ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب
 گینو کر کے گینو کر کی جگہ۔ ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب

ہیں کیونکہ اس سے لکھنؤ اور دلی کی زبان میں سب سے پہلے الفاظ کا فرق کر سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ ترک کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم اور بہت سے الفاظ کا فرق کر سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ ترک کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم اور بہت سے الفاظ کا فرق کر سکتے ہیں۔

کرنے سے زبان کی سخت میں بھی پھر ایسا سرکاری
(اسی رسالہ میں بعض ایسے الفاظ کو جو اب ترک قرار دیا ہے جو
میں نے اس رسالہ میں لکھے ہیں جیسے مو

یا قیاس لغوی کے خلاف ہر ادیب کے واجب ہیں

ملکوں کے باشندے ہو گئے رفتہ رفتہ وہ کلیکل عربی جس پر عربوں کو ناز تھا اٹھری دنیا
 سے رخصت ہو گئی اور وہی ^{میں} بھیبٹری زبان جس کو عرب عوام ہجارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام
 عربی لٹریچر پر چھا گئی اور شام و روم و مصر و بربر و سودان وغیرہ میں عوام پھیل گئی۔ یہاں تک
 کہ آج وہی زبان ٹھسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی انجام دلی اور لکھنؤ کی
 زبان کا اگر اسی جلد خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دلی جس کو اردو کے معنی کا سقراط ^{سقراط} الراس اور
 جنم بچم کسنا چاہیے وہاں مصنف اور ناظم و ناشر پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں۔ پُرانے
 لوگوں میں سے چند نفوس جس کو چرخِ سحری سمجھنا چاہیے باقی رہ گئے ہیں۔ نئے بعد بالکل
 سناٹا نظر آتا ہے لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلی سے
 بہت زیادہ سننے میں آتا ہے۔ وہاں سے ناول اور ڈراما بر ملاک میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔
 افسوس ہے کہ انکسار دم زمانہ کی رفتار کے متوازی نہیں اٹھتا۔ وہ جھک کر آگے بڑھتے جاتے ہیں
 اُن کی قدر ترقی کے رستے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

اتباع

اردو پر قدرتِ جمل کرنے کے لئے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا متبع ہی کافی نہیں ہے
 بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں
 فی الجملہ ^{مستند} دست گاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی
 ہے۔ اُس کے تمام فعال اور تمام صرف اور غالب حصہ اس کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اردو
 شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہی قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں
 بہت بڑا حصہ اس کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق

غرض غم کے مشربوں کا مطالعہ ہے۔ اگرچہ بعض دیوان اور شہنویاں جنکا اور ذکر کیا گیا
 سوسن و غم کے مشربوں کا مطالعہ ہے۔ اگرچہ بعض دیوان اور شہنویاں جنکا اور ذکر کیا گیا
 سر لغو خیالات اور بیہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں لیکن جو لوگ محض زبان سے
 غرض کہتے ہیں انکو خیالات کی لغویت اور مضامین کی بیہودگی سے چشم پوشی اور غماض کرنا
 چاہیے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ و محاورات اور طرز ادا اور انداز بیان پر بہت مصلحت
 رکھنی اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ و محاورات اور طرز ادا اور انداز بیان پر بہت مصلحت
 تاریخی۔ مذہبی اور اخلاقی مضامین پر سند اہل زبان نے کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی فائدہ
 اٹھانا چاہیے۔

جو لوگ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ انکو اس بات
 پر فخر کرنا نہیں چاہیے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی
 جاتی ہے انکو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لینگے۔ اس کے محفوظ رکھنے کے مسائل
 بہم نہ پہنچائینگے۔ اس کے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب کرینگے
 اور اسکی نظم و منثر کو زمانہ کے مذاق کے موافق ترقی نہ دینگے تو انکی زبان کا وہ حصہ جو
 فخر ہے اور جو انکی اور تمام ہندوستان کی اردو میں مابہ الامت پیارے وہ حرفِ خلط کی طرح
 روزگار سے محو ہو جائے گا۔ اور یہی بُری بھلی اردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے
 ذریعے سے ملک میں پھیل رہی ہے اور جسکو وہ اتنا تکبر کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں زیادہ
 زیادہ نصف صدی میں ہی۔ ملک کی ٹھکانی اور فصیح زبان قرار پا جائے گی۔ کیا انکو معلوم
 نہیں ہے کہ عرب میں جبے شعر و اشعار کی سردبازی ہوئی اور عربی نظم و منثر کے مالک غیر

و محاورات بقدر محنت و نامعلوم طور پر زبان چرچہ جاتیں لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص
 ملنا دشوار ہے اس لیے ضرور ہے کہ شاعر اہل زبان کا کلام حق قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ
 سے بار بار دیکھا جائے نہ اسل راہ سے کہ خیالات اور مضامین میں انکی تقلید کی جائے بلکہ اس
 نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور

کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔
 کن ایک عجیب فصحاء عرب کے کلام کی عمارت

ابن خلدون کہتے ہیں کہ "ایک عجیب فصحاء عرب کے کلام کی عمارت

سے اہل زبان میں شمار کر نیکی لایق ہو سکتا ہے" پس ہندوستان کے باشندے اس بات
 کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اہل زبان کے کلام کی فراوانی سے مثال اہل زبان کے سمجھے جاتیں

اگرچہ دلی کے بہت سے عرب شاعروں کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ جیسے خواجہ میر
 شاہ نصیر، میرمنون معروف، عارف وغیرہ۔ حالانکہ ان بزرگواروں کے مبسوط اور خیم

دیوان موجود ہیں۔ لکھنؤ میں بھی کچھ عجیب نہیں کہ وہاں کے بعض تندگوں کا کلام شائع
 نہوا ہو۔ لیکن جن لوگوں کے دیوان اور کلیات شائع ہو چکے ہیں انکی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے

اور انہیں سے خاص کر میر سودا، درد، جرات، انشا، مصحفی، میر حسن، ناسخ، آتش
 و نیر، غالب، ذوق، ظفر، شیفتہ، دلغ، سالک، شوق، زند، اسیر، برق، امیر

وغیرہم کا قہریم کا کلام خواہ غزل ہو خواہ مثنوی خواہ قصیدہ خواہ قطعہ و رباعی خواہ
 و اسوخت سب دیکھنا چاہیے۔ اور بے زیادہ اہم اور ضروری خلیق، ضمیر، انیس، ویرا

8 شوق سے مراد نواب مرزا لکھنوی ہے۔ جس کی بہادری و عشق و غیرہ شہنشاہ شہزادوں
 دے سو ختم

شہر کو اپنی جلی سے استریل جہل کا موقع نہیں ملا جس قدر کہ لکھنؤ کو ملا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں شہروں کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔ اور خاص خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں جگہ کی بول چال اور لہجہ میں کوئی محنت بہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اس وقت تک شائع نہیں ہو سکتی جب تک کہ مندرجہ ذیل فریضے ملک میں مہیا نہ ہوں۔ ۱۔ اس زبان کی محنت اور جامع و کثرت کا تیار ہونا ۲۔ اس کی جامع گریمر کا مرتب ہونا ۳۔ اس میں کثرت سے نظم و نثر کی کتابوں کا تصنیف و تالیف ہو کر شائع ہونا ۴۔ اس زبان کے اخبارات و رسائل کا تمام اطراف و جنوب ملک میں اشاعت پا کر ظاہر ہو کہ نہ آج تک اردو کی کوئی جامع اور مستند و کثرت تیار ہوئی ہے اور نہ اس کی کوئی ایسی گریمر لکھی گئی ہے جس سے زبان کے سیکھنے میں کافی مدد ملنے کی امید ہو۔ اردو میں تصنیف و تالیف کا رواج اور اخبارات و غیسر کی اشاعت زیادہ تر میں پیش برس سے ہوئی ہے اور بہت قلیل مدت زبان کی ترویج کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اردو لٹریچر کی جس قدر اشاعت ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اس قدر اردو زبان کی تحریر اور نظم و نثر لکھنے کا سلیقہ اطراف ہندوستان میں عموماً بڑھتا جاتا ہے لیکن شاعرانہ خیالات اور خاص کر نچرل شاعری کے فرائض شمالی زبان میں ادا کرنے کے لیے ایسے محسوس و ذریعے شاید کافی نہ ہوں۔ اگرچہ ایک جامع اور مستند و کثرت بھی (اگر کوئی ہو) اس مقصد کے پورا کرنے میں بہت کچھ مدد پہنچا سکتی ہے۔ مگر اس باب میں زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور ان کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ ان کے الفاظ

زیادہ مناسب ہو گا جو نثر نہ فطری اور نہ جبری چیزوں کے ہو اور وہ مادری زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔

لیکن چونکہ اردو زبان ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں کی نسبت بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لائق ہے۔ تمام اطراف ہندوستان میں بولائی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ اور اس بات کی زیادہ سہولت ہے کہ کسی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو سیکو ترقی دی جائے۔ نیز اسکا حاصل کرنا اور اس میں کافی مہارت ہم سچائی ہندوستان کے باشندوں کو اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ اور غیر مادری زبانوں میں دشوار ہوتی ہے۔

اسکے سوا ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں بھٹل کوئی زبان ایسی نہیں معلوم جہیں اردو کے برابر شعر کا ذخیرہ موجود ہو۔ اسلئے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہر وطنوں میں جو شخص شعر کہنا اختیار کرے وہ اردو ہی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ قرار دے۔

ہندوستان

ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہاں کی اردو سمجھی جاتی ہے دہلی اور لکھنؤ۔ دہلی کی زبان اسلئے کشمیری زبان سمجھی جاتی ہے کہ اردو کا ^{develpment} اور نشوونما اس خطہ میں ہوا ہے۔ لکھنؤ کی زبان کو واسطے ^{develpment} شہر بنانا جاتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی ابتداء سے شرفاء دہلی کے بے شمار خاندان ایکٹ دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لئے وہیں رہ پڑے۔ پس ہندوستان کے کسی

شوق نے شہنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔ اس طرح دلی میں
ذوق۔ ظفر اور خاص کر دماغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور
بانچین پیدا کر دیا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر یہ قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

تیسری بات زبان اردو کو درستی اور صفائی کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ اگرچہ اردو کم و بیش تمام اطراف ہندوستان میں متداول ہو لیکن ممکن ہے کہ بعض ممالک کے باشندے اپنی خاص زبان میں نسبت اردو زبان کے زیادہ آسانی سے شعر سرانجام کر سکیں۔

پس اگر ہمارے ہموطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں شعر کہنا چاہے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ مادری زبان سے بہتر اور سہل تر کوئی آئہ اظہار خیالات کا نہیں ہو سکتا۔ لارڈ مکالے کا قول ہے کہ ”کوئی عمدہ کلام جو خیالات کا مجموعہ ہو کبھی کسی شخص نے سرانجام نہیں کیا مگر ایسی زبان میں جبکی نسبت اسکو مطلق یاد نہ ہو کہ کب سیکھی اور کیونکر سیکھی اور جبکی گریمر جاننے سے پہلے وہ ایک مدت تک اس میں گفتگو کرتا رہا“ وہ لکھتے ہیں کہ روم کے بڑے بڑے لائق آدمیوں نے فرانسیسی زبان میں اشعار لکھے مگر انہیں سے کوئی شعر

صفحہ روزگار پر یادگار نہ رہا۔ انگلستان کے بہت سے خوش فکر اور طبیب و آدمیوں نے لاطینی میں دیوان مرتب کئے مگر انہیں سے ایک دیوان بھی یہاں تک کہ ملٹن کا دیوان بھی شاعری کے لحاظ سے اول درجہ کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ دوسرے درجہ میں بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتا، پس جیسا کہ شاعری ایک فطری اور جبلی چیز ہے۔ اس طرح اُسکو کام میں لانے کے لئے ایسے آلات استعمال

زندگی در دوسرہوئی حاتم کب ملے گا مجھے پیامیرا
اسی مضمون کو میر نے نئیوں باندھا ہے۔

وصل اُس کا خُفِ انصیب کرے میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ
سو دایوں کہتے ہیں۔

868 H 125 D 5

دل کو یہ آرزو ہے صبا کو بے یار میں ہمراہ تیرے پہنچے دل کر غبار میں
منشی امیر احمد صاحب امیر جو موجودہ طبقہ کے مشہور شاعر ہیں وہ اسی مضمون کو یوں
ادا کرتے ہیں۔

واگرد چشم دل صفت نقش پاموں میں ہر گز گز میں اہ تری پچھتاہوں میں
اس مثال میں بھی سینوں شعروں کو اگرچہ خیال کے لحاظ سے نچرل کہا جا سکتا ہے مگر اخیر شعر
کے بیان میں بمقابلہ حاتم اور میر و مرزا کے صاف تضاد اور ساختگی پائی جاتی ہے
اور میان خیمہ چل نہیں رہا اگر زیادہ تفصیل کیا جائے تو اتنے بہت زیادہ صریح اور صاف مثالیں
حکرت سے مل سکتی ہیں۔

جہان بین

اوپر کے بیان سے یہ ہرگز سمجھنا نہیں چاہیے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ ان نچرل
ہوتی ہے نہیں بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو قدما کی جولا نگاہ کے علاوہ
ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا اُسی جولا نگاہ کو سیکھ و سوت دیں یا زبان
میں نسبت تقدیم کے زیادہ کھلاوٹ اور لوج اور سوت اور صفائی پیدا کر سکیں چنانچہ ہم
دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور نولب مرزا

بیان فرماتے ہیں۔

تختہ نزد عشق دل کھیلا جو حُسنِ یار سے چھٹ گئے ایسے مرے چھٹے کہ ششدر ہو گیا
 دوسری مثال۔ شاہ آبرو اُس طولِ مدت کو جو مفارقت کے زمانہ
 میں عاشق کو محسوس ہوتا ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جدائی کے زمانہ کی سجن کیسا زیادتی کہیے کہ اس ظالم کی جو ہر گھڑی گزری سو گز مٹا
 اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا ہے

ہر آن ہلکو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہو کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
 ناسخ جو پانچویں طبقہ میں ہیں وہ اس مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

جائے کافور سحر چاہیے کافور حنوط ^{سوزنے بعد لگا جائے} یہ شب ہجر ہے یار و شبِ یحجر نہیں

یعنی شبِ ہجر جب تک ہماری جان نہ لیگی ٹلنے والی نہیں ہے۔ لیکن کافور سحر کی توقع کہنی
 عیش ہو بلکہ اسکی جگہ کافور حنوط غسلِ میت کے پئے درکار ہے۔ اگرچہ مضمون کے لحاظ سے
 تینوں شعروں کو نیچرل کہا جاسکتا ہے کیونکہ شوق و انتظار کی حالت میں ممکن ہے کہ عاشق کو
 ایک ایک گھڑی جگ اور ایک ایک آن برس کے برابر معلوم ہوا ہو ممکن ہے کہ عاشق طولِ شب
 فراق سے تنگ آکر چینے سے مایوس ہو جائے۔ مگر ناسخ کی طرزِ بیان اردو کی معمولی بول چال سے
 اس قدر عجیب ہو کہ اسکو کی طرح نیچرل بیان نہیں کہا جاسکتا۔

تیسری مثال شاہِ حاتم جو پہلے طبقہ میں شمار کیے گئے ہیں وہ دوسرے ٹلنے
 کی آرزو اور اُسکے دیکھنے کے شوق کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا انفرض جب کچھ اُنھیں مضامین کو جو اگلے باز دھکے میں اڑھنا اور کچھ نابنائیت میں تو انکو مجبورِ خیال شاعری سے دست بردار ہونا اور

میں کا بیل بنانا پڑتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ذہن نشین کرنے کے لئے کہ شاعری کا آغاز کنکالت میں ہوتا ہے اور پھر قدم کا دوسرا طبقہ اُسکو سطح اُسی پنجپل حالت میں رست کرتا ہے اور اُنکے بعد متاخرین اُسکو کیا چیز بنا دیتے ہیں (اُردو شعرا کے ہر طبقہ کے کلام میں سے کچھ کچھ مثالیں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی مثال شاہ آبرو جو اُردو شعر کے سب سے پہلے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں اُنکی کیفیت کو جو معشوق کے دیکھنے سے عاشق کے دلیں پیدا ہوتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

نہیں تین تین جہٹائے گیا دل کے اندر مرے سمائے گیا

بچہ گرم میں مرے دل میں خوش تین آگ سی لگاتے گیا

مرزا فریح سو و اجنکو دوسرے طبقہ میں شمار کرنا چاہیے وہ اسی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں کیا جائے تو نے اُسے کس آن میں دکھا

میر تقی جو مرزا فریح کے معاصر ہیں وہ اسی کیفیت کو یوں ادا کرتے ہیں۔

نہیں چہ چاہ بھلی اتنی بھنی عاکر میر کاب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیاز

خواجہ حبیب علی آتش جبکو چوتھے پایا پنجویں طبقہ میں سمجھا گیا ہے وہ اسی کیفیت کو یوں

بلا سبالغہ کلال کی دکان سنگتی۔ ایک کہتا ہے لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا۔ تیسرا کہتا ہے پیالہ
نہیں تو اوک ہی سے پلا۔ کچھ بہکے ہیں اور کچھ نکار رہے ہیں کوئی دعا غیث پر بھرتی کہتا
کوئی زبا کی ڈاڑھی پر ہاتھ لپکتا ہے۔ کوئی شیخ کی گچڑی اُچھالتا ہے۔ جوان اور بوڑھے
جاہل اور عالم برید اور پار باسب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے سونشہ کے خائیں
انگڑائیاں لے رہا ہے جدھر دیکھو ^{دستِ مبارک} لحظش لحظش کی چکار ہے۔

یاسماً قد مانے لاغری بدن کو اندوہ عشق یا صدمہ جدائی کا ایک لازمی نتیجہ
سمجھا کر اُسکو کسی موثر طریقہ سے بیان کیا تھا۔ متاخرین نے رفتہ رفتہ اُسکی نوبت یہاں تک
پہنچادی کہ فراش جھاڑو دیتا ہے تو خس و خاشاک کے ساتھ عاشق زار کو بھی سمیٹ لیجاتا ہے۔
محبسوق جب صبح کو اٹھتا ہے تو عاشق کو لاغری کے سبب بستر پر نہیں پاتا۔ لاچار بچھونا جھاڑ کر
دیکھتا ہے تاکہ زمین پر کچھ گرتا ہو اسلوم ہو۔ عاشق کو موت ڈھونڈھتی پھرتی ہے
مگر لاغری کے سبب اُسکو کہیں نظر نہیں آتا۔ میدان قیامت میں فرشتے چاروں طرف
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور قاضی یوم الحساب منہ نظر بٹھیا ہے مگر عاشق کا لاغری کے
سبب کہیں تیا نہیں ملتا۔

ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔ معشوق کے دامن کو تنگ کرتے کرتے صفحہ روزگار سے کیٹھمٹا دیا کہ کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کر دیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بھی بڑھا دیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بن گئے۔ جدائی کی رات کو

بالوں میں کنگھی کرتا ہے تو وہ جوں کی طرح جھڑپا ہے۔ کبھی وہ ایسا تپٹ ہو جاتا ہے کہ زلفیاں
 کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اسکی تلاش کی جاتی ہے۔ مگر کہیں کچھ سرخ نہیں ملتا
 کبھی وہ بیچ بانجھار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند
 تو رکھنا ورنہ پھیر دینا اور کبھی اسکا نیلام ہوا یا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لیجا۔
 یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اسلیے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً صیتا
 باندھا تھا۔ پھیلوں نے رفت رفته اسپر تمام احکام حقیقی صیتا کے مترتب کر دیئے۔ اب وہ
 کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔ کہیں اسکو تیر مار کر گراتا ہے۔ کہیں انکو زندہ پھرے میں بند کرتا
 ہے کہیں انکے پر نوچتا ہے کہیں انکو فوج کر کے زمین پر ترپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر
 جنگل کی طرف جا نکلتا ہے۔ تمام جنگل کے ننھی اور پھیر واس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سیکڑوں پرندوں
 کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں خیرے قمریوں اور کبوتروں اور لٹوں اور بیروں کے اس کے
 دروازہ پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے پڑی مارا سکے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشق آتی یا محبت وحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے
 ساتھ ہو سکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشہ سے تعبیر کیا تھا اور اس مناسبت کے جام و سرساجی۔ خم و
 پیمانہ اور ساقی و میفروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کیے تھے یا بعض شعرا
 مستصوفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اسرار الغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو
 ظفر البال کرنے والی ہے بطور تقاول کے موصول الی المطلوب قرار دیا تھا رفت
 وہ اور اسکے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ شاعرہ

متاخرین جہاں میں ہوں پر پل پڑے اور انکوف دما کے استعارہ سے بہتر کوئی اور استعارہ
 ماتھے نہ آیا اور جدت پیدا کرنے کا خیال نہ سنبھلا۔ اُنھوں نے تیج و شمشیر کے مجازی معنوں سے
 قطع نظر کی اور اُس سے خاص نشہ روی یا اسیل تلوار مراد لینے لگے جو قبضہ باور پہنچا۔ اب
 اور ناپ اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے۔ میان میں رہتی ہے۔ گلے میں شامل کیجاتی ہے۔ زخمی
 کرتی ہے۔ ٹکڑے اڑاتی ہے۔ سُر اُتارتی ہے۔ خون بہاتی ہے۔ چورنگ کا سنی ہے
 اُسکی دھارتیں بھی ہو سکتی ہے اور کُند بھی۔ قاتل کا ماتھہ اُسکے مارنے سے تھک سکتا ہے
 وہ قاتل کے ماتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے۔ اُسکے مقتول کا مقدمہ عدالت میں اُس پر ہو سکتا ہے
 اُسکا قصاص لیا جاسکتا ہے۔ اُسکے وارثوں کو خون بہا دیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ جو خواہ
 ایک لوہے کی اسی تلوار میں ہو سکتے ہیں وہ سب اُسکے لیے ثابت کرنے لگے۔

یاشا اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً دل دادن یا دل باطن یا دل فرو
 سے تعبیر کیا تھا رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا جو کہ مثال یک
 جواہر یا ایک پھل کے ماتھ سے چھینا جاسکتا ہے۔ واپس لیا جاسکتا ہے۔ کھویا اور پایا جاسکتا
 ہے۔ کبھی اُسکی قیمت پر بیکار ہوتی ہے۔ سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے۔ ورنہ نہیں دیا جاتا
 کبھی اُسکو معشوق عاشق سے لیکر کسی طاق میں ڈالکر بھجوا جاتا ہے۔ اتفاقاً وہ عاشق
 کے ماتھ لگ جاتا ہے اور وہ آنکھ بچا کر وصال سے اڑا لیتا ہے۔ پھر معشوق کے ماں بچی
 دُھندلیا پڑتی ہے اور عاشق اُسکی رسید نہیں دیتا کبھی وہ یاروں کے جلسہ میں آنکھوں ہی
 آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ سارا گھر چھان بارتے ہیں کہیں پتا نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو

کا دورہ شروع ہوتا ہے اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں کھتے اور خیالات کے
 اُسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کیے تھے اور نیچر کے اُس منظر سے جو
 کے پیش نظر تھا کچھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے تو انکی شاعری رفتہ رفتہ نچرل حالت
 سے تنزل کرتی ہے یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہِ راست بہت دور جا پڑتے ہیں اسکی مثال
 ایسی سمجھنی چاہیے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم کچے اور اُلٹے ماش یا بونگ
 پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے انھیں پانی میں اُبالا کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں
 نے اپنی معمولی غذا سے اسکو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا بونگ کو اکر اور
 وال کو دھو کر اور مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب سیرے باورچی کو باگڑہ وال
 ہی کے پکانے میں اپنی اُستادی ظاہر کرنی چاہتا ہے اسکے سوا اور کوئی موقع متنوع پیدا کر
 کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ
 پٹی مانڈی پر فریفتہ کرے۔

اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دلنشین کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو
 کہ فارسی زبان میں جیسے اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہے
 ضرور ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کے سبب اور دواعی محض نچرل اور سیدھے سادے طور
 پر معشوق کی صورت حسن و جمال نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو تیار کر دیا ہو گا۔ اُنکے بعد لوگوں نے
 انھیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیارے میں بیان کیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ و ناز و داد کو
 مجازاً تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور اس حدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و باغزہ بنا

دونوں کے تصور سے فرحت ہونی چاہیے اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصور سے رنج ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بلکیں جو خار سے شاہیں اُنکے تصور سے پہلو میں خرموں اور عارض جو گل سے شاہ ہے اُنکے تصور سے پہلو میں گلزار ہو۔ یا مثلاً

عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں ^{سند نہ ہو} کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جو ہر اندیشہ میں کسی ہی گرمی ہو یہ کیسی طرح ممکن نہیں کہ اُس میں صحرا انوری کا خیال آنے سے خود صحرا جل اُٹھے۔ یا مثلاً

(Barren land) - ^{پستلند} صحرا

کیا نزاکت ہے جو توڑ اشخ گل سے کوئی پھول آتش گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں نزاکت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ آتش گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے

پڑ جائیں۔ یا مثلاً ^{اس سے} دفن ہے جس جا پر شتہ سرد مہری کا تری ^{بیشتر ہوتا ہے} پیدا وصال شجر کا فور کا ^{تاثیر} سرد مہری میں اتنی ہی ٹھنڈک ہو سکتی ہے جتنی کہ لفظ ^{پیدا ہوتا ہے} سرو میں پھرا سکتے کی خاک میں اتنا اثر ہونا کہ اُس سے شجر کا فور پیدا ہو۔ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں جنہیں معنی کا بالکل نام و نشان نہیں۔

ہزار بان میں ^{پہلو} شاعر شاعری ہمیشہ قدم کے حصہ میں رہی ہے۔ مگر قلم کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اُنھیں کا دوسرا طبقہ اُسکو سڈول بنا تا ہے اور سانچے میں ڈھال کر اُسکو خوش نما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے مگر اُسکی نچر حالت کو اس خوش نمائی اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ انکے بعد متاخر

” تم مرے پاس مجھے ہو گیا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا “

یہ بھی نچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھاتا ہے اسکا تصور نہائی میں پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً

” طبیعت کوئی دن میں بھر جائیگی چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی “

” رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں ^{سینہ} بیت کوئی آج بھرنے کی “

ان دونوں شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا ہے مگر دونوں اپنی اپنی جگہ نچرل کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا بھوت بڑے زور و شور کے ساتھ سر چڑھتا

ہے مگر بہت جلد اتر جاتا ہے اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی نیت سیر نہیں ہوتی۔ یا مثلاً

” سچ سے خوگر ہوا انسان تو بٹ جاتا ہے سچ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں گئیں “

یہ شعر بھی نچرل ہے اور فطرت انسانی کی کس قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے ایسے ہیں جنکو لفظاً اور معنی دونوں حیثیتوں سے نچرل کہنا چاہیے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جنکو لفظاً یا معنی یا دونوں حیثیتوں سے نچرل

نہیں کہا جاسکتا مثلاً۔

” کبھی ہو دھیانِ رضا کا کبھی اور مشرہ و لکو کبھی ہیں خار پہلوئیں کبھی گلزار پہلوئیں “

اس شعر کو صرف لفظاً نچرل کہا جاسکتا ہے لیکن معنی نہیں کہا جاسکتا۔ عاشق کے تصور بلاشبہ عاشق کو فرحت بھی ہو سکتی ہے اور سچ بھی۔ لیکن جب فتنہ ہو تو عارض و درمگز

لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور انکی ترکیب بندش تا بقدر

اُس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور فرمہ اُس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکند نیچر کا حکم رکھتے ہیں پس شعر کا بیان جب قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور فرمہ سے بعید ہوگا اسی قدر اُن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنی نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون خلاف ہو گا وہ اُن نیچرل سمجھا جائے گا۔ مثلاً

”کوئی رکھ کے زریں نخل چھڑی
ہی زگس سب اکھڑی کی کھڑی“

”رہی کوئی انگلی کو دانستوں میں اب
کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب“

ان دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً

”رہتا ہے اپنا عشق میں یوں لے مشورہ
جس طرح آشنائے کرے آشنائے صلاح“

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے ایسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے یا مثلاً

”ترے رخسار و گیسو سے بتا شبیہ دوں کیونکہ
نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہی سنبل میں بولہ سی“

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بولہ معشوق کے رنگ و بوسے بہتر یا اس کے برابر نہیں معلوم ہوتی یا مثلاً

فیاض نامور بہادر اور نازا اہل بیاض اہل و فرماں بردار ہو جاتا ہے " ظاہر ہے کہ اس تعریف کا
صدیق اگر کوئی شعر ہو سکتا ہے تو وہی ہو سکتا ہے جو جھوٹ اور سبائخ سے پاک ہو اور لوگوں

نے خلیفہ کی وجہ میں یہ شعر کہ دیا تھا "وَكَلَّفَتْ أَهْلَ الْبَيْتِ لِي حَقِّي أَنَّهُ" ^{علمنا} ^{وہ مطلب ہے کہ میں نے تجھ سے خوف کمانے میں اس پر}
(یعنی ترے اہل بیت کے کہہ دینے میں ہنوز قرار نہیں پائے وہ کیونکر خوف کھا سکتے ہیں اور لوگوں

لوگوں نے یہ شعر سنا کیا کہ جو نطفے میں ہنوز قرار نہیں پائے وہ کیونکر خوف کھا سکتے ہیں اور لوگوں
کو گویا اس نے یہ شعر سنا کیا کہ جو نطفے میں ہنوز قرار نہیں پائے وہ کیونکر خوف کھا سکتے ہیں اور لوگوں

کی طرف سے سوال کے کہ بعضوں نے تاویل سے اس کو صحیح قرار دیا اور کوئی کچھ جواب دے سکا۔
تجاشعر کرنے کی صلاح کچھ ایسے نہیں دیکھتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے نہیں بلکہ

وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ
وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ

وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ
وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ

وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ
وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ

وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ
وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ

وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ
وہ سچائی ہے کہ تاثیر و شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی بلکہ

برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے اور شاعر کے لیے جھوٹ بولنا صرف جائز ہی نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی شاعری کا زیور سمجھا گیا ہے لیکن ہمیں بھی شک نہیں کہ جب سے ہماری شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ دخل ہوا اُسی وقت سے اُسکا تنزل شروع ہوا عربِ عرابہ اور صدرِ اول کے شعر جھوٹ کے نماں نفرت کرتے تھے اور اُسکو عیوبِ شاعری میں سے سمجھتے تھے **رہیم** را بن ابی سہیل جو اول کا شاعر ہے اُسکا قول ہے کہ ”احسن القول ما صدقہ الفعل“ یعنی سب سے بہتر کلام وہ ہے جو حیرت کا مگواہی دیں اور ایسی شاعر کا یہ مشورہ ہے۔

”وَإِنَّ أَشْعَرَ بَيْتٍ أَنْتَ فَاتِلُهُ بَيْتٌ يُقَالُ إِذَا اشْتَدَّتْهُ صَدَقًا“

اُسی رہیم کی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کرتے تھے ”إِنَّهُ أَشْعَرُ الشُّعْرَاءِ لَا يَدَّحُ إِلَّا مُسْتَحَقًّا“ (یعنی وہ افضل ترین شاعر ہے کیونکہ وہ اُسی کی وجہ کرتا ہے جو حق ہے) ایک بابی میم نے سلامتہ بن جندب سے جو ایک جاہلی شاعر ہے درخواست کی کہ ”يُحْدِثُ نَازِلَ شِعْرَةٍ“ (یعنی تو اپنے پیشہ سے ہماری عزت بڑھا) اُس نے کہا ”وَأَفْعَلُوا أَحَقُّ أَقْوَلُ“ (یعنی تم کچھ کر کے دکھاؤ تاکہ میں شکوہ بیان کروں)

صاحب عقد لفظ **فرید** لکھتے ہیں کہ ”شعر عرب اپنی بیج سے محدود کی عزت بڑھا دیتے تھے اور سچے لوگوں کو ذلیل و رسوا کر دیتے تھے“ اسکا سبب کچھ سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ انہی واقعی خوبیاں یا واقعی بُرائیاں بیان کرتے تھے ورنہ جھوٹی بیج اور جھوٹی بیج سے کوئی شخص عزیز یا ذلیل نہیں ہو سکتا۔

معاویہ بن ابی سفیان کہتے ہیں کہ ”شعر وہ چیز ہے جسکے پڑھنے سے خیل

شاعری کے لئے کدیا کا تمذخہ تیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی نظامی سعدی خسرواؤ
ماظف کے غیب والیے ہٹا دیتے جن کی شہرت شاعر دوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر

ایا ان کے اکثر توجہ دہنی۔ ہندوستان ہندوستان ہندوستان
شاعر بننے کے لئے سب سے اول میں استعداد اور پھر کلام کا مہل اور ان کے بعد

شعر بننے کے لئے سب سے اول میں استعداد اور پھر کلام کا مہل اور ان کے بعد
شعر سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور ان کے گزیرہ کلام کا مہل اور ان کے بعد

محبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح مذاق رکھنے والوں (عام اس سے کہ شعر میں ہنسنا) صرف اس وقت
کافی ہے اور پس اس وقت ان لوگوں کو جو مستند زبان پر کافی عبور نہیں رکھتے ممکن ہے کہ

محاورات کے استعمال میں شبہات واقع ہوں لیکن ان شبہات کا رفع ہونا کسی شاعر کا ہر
پر موقوف نہیں بلکہ وہ ہر صاحب زبان سے یہاں تک کہ ایک دوا۔ ایک ماہاں ایک گزیر

بلکہ ایک حلال خوری سے بھی رفع ہو سکتے ہیں۔ دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ شعریں جہانیک ممکن ہو حقیقت اور سحر
کا سرشتہ ہاتھ سے دنیا نہیں پائیتے اگرچہ چہنے جو اچھے شاعر کی شہرت

بیان کی ہے اُس میں دائرہ بیان کو زیادہ وسیع کر دیا ہے اور اس صلیت کے لئے بہت سے پہلو کا
تعلیٰ ہے جاہ الزام لائینی۔ شکوہ ہے محل اور اور اس قسم کی باتیں جو صدق و راستی کی مناسبت

اور جو ہماری شاعری کے قوام میں داخل ہو گئی ہیں اُن سے جہانیک ممکن ہو قاطبہ اور ان کا
یہ سچ ہے کہ ہماری شاعری میں غلطائے عباسیہ کے زمانہ سے لیکر آج تک جھوٹ اور سبالغہ

شعرو شاعری

طبیعت میں ہر حالت اور ہر وقت کے خواہ وہ حالت اور واقعہ خود اپنے گزرنے یا زید و عمر پر
یا ایک چیونٹی پر متاثر ہونے کی قابلیت ہوتی ہے اور اس قابلیت سے اگر وہ چاہیں تو بہت
کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انکو خارج سے اپنی شاعری کا مصالح فرہم کرنے کی صرف اُس قدر
ضرورت ہوتی ہے جس قدر کہ بے گولہ نہ گھولنے کے لئے پھونس اور تنکوں کے باہر سے لائے
کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ سلیف جو الفاظ و خیالات کی ترتیب و انتخاب کے لئے درکار ہو
اپنی ذات میں اُس طرح پاتے ہیں جس طرح کہ بیاگھونسلانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات میں پایا
ہی۔ وہ اساتذہ کے کلام سے صرف سیر ہی فائدہ نہیں اٹھاتے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا یا باندھا ہے
اُس سے مطلع ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے ایک ایک مصرع اور ایک ایک لفظ سے بعض
اوقات انکو وہ سبق حاصل ہوتا ہے جو ایک نا شاعر مہینوں میں کسی استاد سے حاصل نہیں کر سکتا
پس ہمارے ملک میں جو شاعری کے لئے ایک استاد قرار دینے کا دستور اور صلاح کے لئے
ہمیشہ اُسکو بہت کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کو حق میں
کوئی معذرت بہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے۔ استاد شاگرد کے کلام میں اس سے
زیادہ اور کچا کر سکتا ہے کہ کوئی گریمر کی غلطی بنا دے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کر دے لیکن
اس سے نفس شعر میں کچھ ترقی نہیں ہو سکتی۔ رہی یہ بات کہ استاد شاگرد کے پست کلام کو
بلند کر دے یا شاگرد کو اپنا ہمسربانے۔ سو یہ امر خود استاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے
اگر استادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسربانے کی طاقت ہوتی تو ملا نظامی صاحب جازو
کو نصیحت نہ کرتے۔ ”در شعر محبوب بند نامی“ کا خیر تم شدت بر نظامی“ اور اگر کمال

قدم رکھنا چاہیے جبکی فطرت میں یہ ملکہ و طبیعت کیا گیا ہو ورنہ تمام کاوش اور تمام کوشش رائگاں جائے گی۔ ہوں تو ہر فن اور ہر پیشہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے مناسبت فطری کی ضرورت ہے لیکن شاعری میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسکی سب سے زیادہ ضرورت ہے جب تک شاعر کی فکر میں اتنی بھی کچھ نہجوت نہی کہ ایک ہے میں گھونسلانہانے کی اور مٹری میں جالا پورنے کی ہوتی ہے اُسکو ہرگز مناسب نہیں کہ اس خیال خام میں اپنا وقت ضائع کرے بلکہ خراکاش کر کرنا چاہیے کہ اُسکے دماغ میں یہ خلل نہیں ہے۔

شاعری کی ابتدا الغنیۃ ایسی ہوتی ہے جیسی شطرنج کی ابتدا ہوتی ہے جبکی طبیعت کو شطرنج سے لگاؤ ہوتا ہے اُسکو دو ہی چار دن میں باریک اور گہری چالیں سوچنے لگتی ہیں اور شطرنج میں اُسکو ایسا فرآنے لگتا ہے کہ کھانا پینا اور سونا سب بھول جاتا ہے اور روز بروز اسکی چال بڑھتی جاتی ہے مگر جن کی طبیعت کو اُس سے لگاؤ نہیں ہوتا ان کا حال اسکے عکس ہوتا ہے۔ وہ اگر تمام عمر شطرنج کھیلیں اُنکی چال اُس درجہ سے کبھی آگے نہیں بڑھتی جو ابتدا ہی چند روزہ مشق سے اُنکو حاصل ہوا تھا۔ یہی حال شاعری کا ہے جن لوگوں کی فطرت میں اسکا ملکہ ہوتا ہے اُنکی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو طبیعت کا قفس اُنکو جبراً اسکی طرف کھینچ کر لاتا ہے۔ وہ جب اُنکی طرف توجہ کرتے ہیں تو اُنکو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوتی ہے اور اسلئے اُنکا دل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اُنکو اپنی قوتِ مہمت نہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی بُرائی اور بھلائی کا بغیر اسکے کہ کسی سے مشورہ یا اصلاح لیں آپ اندازہ کر سکتے ہیں اُنکی

ہیں ترقی کو نہ کہ ترقی کے لئے

زمانہ کی رفتار کے موافق اور شاعری

یہاں تک شعر و شاعری کی حقیقت اور وہ شرطیں جن پر شعر کی خوبی اور شاعر کا کمال منحصر ہے کہ یہ قدر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں اب ہم اپنے ہموطنوں کو جو زمانہ کی رفتار کے موافق شاعری میں ترقی کرنے کا خیال رکھتے ہیں اپنی سمجھ اور

راے کے موافق چند شورے دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جن ذریعوں سے ایشیا کی شاعری ہمیشہ ترقی پاتی رہی ہے وہ اردو کی شاعری کے لئے فی زمانہ نافذ و فہم نہیں ہے کہ کبھی زمانہ آئندہ میں ایسے ذریعے مہیا ہو سکیں بقول شخصے ”وہ نہ ٹھی ہی جاتی رہی جہاں ایتیت رہتے تھے“ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ قدرتی سرچشمہ ہمیشہ ہر قوم کی ترقی کا منبع رہا ہے یعنی سلف بھلپ اور اپنی ذات پر بھروسہ کرنا اسکی سوتیلی بھی ہماری قوم میں مدت سے بند نہیں۔ پس ایسی حالت میں اردو شاعری کی ترقی کا خیال پکانا گویا زمانہ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ اردو سے نہایت اعلیٰ اور شرف زبانوں کی شاعری بھی محض زوال میں ہو۔ سائنس اسکی جڑ کاٹ رہا ہو۔ اور سولیزیشن اسکا طبع سم توڑ رہی ہو۔ اور اس کے جادو کو حرف غلط کی طرح مٹا رہی ہو۔ لیکن چونکہ یاس اور مہیہ دو تو حالتوں میں خیر وقت تک ہاتھ پاؤں مارنا جاں داکہ طبعی قضا ہے۔ نہ بوج کی حرکت اور مدقوق کی ایب دوم واپس تک باقی رہتی ہی اسلئے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے یہ جتنا نامقصود نہیں ہے کہ کچھ ہو گا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا۔

سے پہلے ہم اس بات کی صلاح دیتے ہیں کہ شاعری کے کوچہ میں اسی شخص کو

شاعر کے لئے

بمخلاف مملکت کے کہ اُسکے بیان میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ اُس سے عمدہ شعر کی پہچان اور
 عمدہ شعر کہنے کی رکان ^{مستعملہ} دونوں باتیں معلوم ہوتی ہیں اگرچہ ضیہ روز نہیں ہو کہ مملکت کی
 تینوں شرطیں ملحوظ رکھنے سے ہمیشہ ویسے ہی سہل و مستحسن اشعار سرانجام ہونگے جنکا مسیحا
 ابن شریق نے بتایا ہے لیکن ضیہ روز ہی کہ جو شاعر اُسکی شرطوں کو ملحوظ رکھے گا
 اُسکے کلام میں جا بجا وہ بجلیاں کو نعتی نظر آئیں گی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جنکو اُستاد ماننا
 چاہیے اُنہیں ایک بھی ایسا نہ نکلیگا جکا تمام کلام اول سے آخر تک حسن لطافت کے اعلیٰ
 درجہ پر واقع ہوا ہو کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتی ہے جیسا کہ وہ خود
 فرماتا ہے "وَلَوْ كَانُ مِنَ عِبَادِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" "شاعر کی معراج
 کمال یہ ہے کہ اُسکا عام کلام ^{مستعملہ} ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اُس میں ایسا حیرت
 جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے بہت اتنی بات
 ضرور ہے کہ اُسکے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً
 ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اُسکا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات
 اُسی شاعر کے کلام میں پائی جاسکتی ہے جکا کلام سادہ و انچسپرل ہو اگرچہ مقتضائے مقام
 کہ اس بحث کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کیا جاتے اور جب قدر کہ بیان کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک
 کافی مقدار سے بہت کم ہے لیکن اس وقت بضرورت صرف اس قدر بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے
 اگر وقت نے مساعدت کی تو پھر کسی موقع پر اسی بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا جائیگا

اس قول میں بھی گویا ملٹن کی تین شرطوں میں سے صرف ایک شرط یعنی اصلیت کو ضروری بتایا گیا ہے۔ لیکن جس شرط یہ ایک شرط کافی نہیں ہے اگرچہ اعلیٰ درجہ کے شعر میں یہ خاصیت ہونی ضرور ہے مگر چنانچہ وہ نہیں کہ ہمیں یہ خاصیت پائی جائے وہ اعلیٰ ہی درجہ کا شعر ہو اس سے زیادہ اور کو نسا شعر تیار ہو سکتا ہے۔

” چشمان تو زیرِ ابرو نہند دندان تو جملہ دردِ دماند “

حالانکہ اسکو اعلیٰ درجہ کا شعر بھی منجمل کہا جاسکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے عمدہ ابنِ شریق کا قول ہے وہ کہتے ہیں

” كَذَا قِيلَ أَطْمَعُ النَّاسَ ظَنًّا وَإِذَا رَيْتُمُ ابْنَ الْجَعْنِ يُنَادِي “

یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب دیکھنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جاتیں) حق یہ ہے کہ ابنِ شریق نے جس لطافت اور خوبی سے عمدہ شعر کی تعریف کی ہے اس سے بہتر تصور میں نہیں آ سکتی گویا جس ترس اور پایہ کے شعر کی اُسے تعریف کی ہے اُسی ترس اور پایہ کا شعر اُس کی تعریف میں انشائیہ ہے۔

ابنِ شریق اور ملٹن کے بیان میں جو نازک فرق ہے اُسکو غور سے سمجھنا

چاہیے ابنِ شریق کی تعریف سے مفہوم ہوتا ہے کہ عمدہ شعر کا سرانجام ہونا زیادہ

حسنِ اتفاق پر موقوف ہے شاعر کے قصہ و ارادہ کو اُس میں چننا چاہیے۔ وہ شاعر کو عمدہ شعر کہنے کا طریقہ نہیں بتاتا بلکہ یہ بتاتا ہے کہ شاعر کے کون سے شعر کو عمدہ شعر سمجھنا چاہیے

کہ یہاں پر ابنِ شریق کا بیان ہے

مقدّم سمجھا ہے۔ جیسے میر درد اور مصحفی وغیرہ لیکن چونکہ انھوں نے قدما کے خیالات
 و مضامین سے بہت کم تجاوز کیا ہے اسلئے انکے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پرکن اشعار سے
 بھرے ہوئے ہیں میر کی نسبت مولانا آزاد وہ دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ
 "پیش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" ان لوگوں کو جو اعلیٰ درجہ کا استاد
 مانا گیا ہے اسکا سبب یہی ہے کہ انکے کلام میں وہی معمولی خیالات جو متعصب و صابیوں
 برابر بندھتے چلے آتے تھے باوجود غایت درجہ کی سادگی اور صفائی کے اکثر جگہ ایسے بڑے
 اسلوبوں میں بیان ہوئے ہیں جو فی الواقع بے شل و عظیم لفظ ہیں میر کے دیوان میں
 ایک غزل ہے خاک میں۔ چاک میں۔ ہلاک میں مولانا آزاد کے مکان پر
 اُنکے چند اِجاب جنہیں مومن اور شیفتہ بھی تھے ایک روز جمع تھے میر کی اسی

غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔
 غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔

ابجے جنوں میں صفا شاید نہ کچھ ہے
 شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور کوئی خیال نہ کیا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے
 موافق بانہیکر دکھائے۔ یہ تبلم دوات اور کاغذ ایک کراگ الگ بٹھیہ گئے اور فکر کرنے
 اُنیوقت ایک اور دوست وارد ہوئے مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں مولانا نے

کہا کہ **موت** مولانا کا جواب لکھ رہا ہوں۔
 ظاہر ہے کہ جو جن جنوں میں گریبان یاد امن یاد نو کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل
 پانال مضمون ہے جسکو دیم زمانہ سے لوگ برابر باندھتے چلے آئے ہیں ایسے چھپڑے ہوئے

قصوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے انہیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اُنکے قصے برائے نام فرضی سمجھے جاتے ہیں ورنہ انہیں تمام واقعات اور تمام واردات ایسے بیان کیے جاتے ہیں جو رات دن لوگوں پر گزرتے ہیں اور پھر اُنسے وہ ایسے حقائق - سوشل یا پولیٹیکل نتائج نکالتے ہیں جنسے قوم کے خلافاً معاشرت یا تمدن پر نہایت عمدہ اثر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی مشنریوں کی طرح اُنکے مطالعے سے صرف عوام الناس اور بازاری لوگ ہی محفوظ نہیں ہوتے بلکہ فضلا و حکما کی سوسائٹی میں بھی انجنت کی گنجائی ہے۔ اُنکے قصوں کا خاتمہ ہمیشہ کامیابی اور خوشی ہی پر نہیں ہوتا بلکہ عادت الہی کے موافق کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی پر۔ کبھی خوشی اور کبھی اندوہ و غم پر ہوتا ہے۔

الغرض جب کہ ہماری موجودہ شاعری کا مدار سین کلا لوجوہ یعنی نہ صرف الفاظ و عبارات میں بلکہ خیالات و مضامین میں بھی محض قوم کی تقلید پر ہے اور جب کہ ہمارے ماں یہ بات بالاتفاق تسلیم کی گئی ہے کہ "أَجْنَبُ الشَّعْرِ أَكْثَرُ" تو ہر کہ اپنی شاعری کی موجودہ حالت میں اصلیت اور جوش دونوں سے دست بردار ہونا چاہیے کیونکہ اصلیت اور کذب میں منافات ہے اور جوش نفسیہ اصلیت کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ رہی سادگی سو وہ موجودہ حالت میں کٹ رہی ہے جو بھڑکی پڑتی ہے کیونکہ جو معمولی خیالات اور مضامین زیادہ تر ہمارے شعرا کے زیرِ مشق رہتے ہیں انھوں نے سادگی اور صفائی کے ہر سلوب اور ہر پیرایہ میں داخلہ کیا ہے اب تا وقتیکہ طرزِ بیان میں کس قدر پیچیدگی یا خیال میں کوئی بھونڈا اضافہ یا تبدیلی پیدا نہ کی جائے۔ اُس وقت تک سانی سے کسی معمولی مضمون میں جدت نہیں دکھائی جاسکتی۔ اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے سادگی بیان کو سب چیزوں سے

لکھنے والے نہ تو بیان میں کچھ گرمی پیدا کرنی چاہتے ہیں اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لہذا ان شنویوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا پس ہمارے ہاں وہی شنویاں رونق پاتی ہیں جن کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہو۔

اگرچہ قصہ کی بنیاد عشق یا بہادری پر رکھنے کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے اور آج کل کے شاید قصے بھی جب تک انہیں عشق یا بہادری کا رنگ نہیں بھرجاتا زیادہ مقبول نہیں مچتے لیکن ہماری شنویوں میں اور انہیں بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے ہاں جس قسم کے واقعات اولاد و چارہ تاد باندھ گئے ہیں انہیں واقعات کو باد نے تغیر برابر بنا رہے چلے جاتے ہیں۔ بیان کے اسلوب اور تشبیہات اور معشوق کے سراپا اور قصہ کے آغاز و انجام خمیرہ میں زیادہ تر انہیں کی تقلید کی جاتی ہے نتیجہ ہمیشہ شد آمد قدیم کے موافق جدائی کے بعد وصال و مصیبت کے بعد رحمت کا ترتیب کیا جاتا ہے طالب مطلوب کے دل پر جو حالات و واردات لیکے و سر کی محبت میں فی الواقع گزرتے ہیں یا گزر سکتے ہیں اُن سے بہت کم تعرض کیا جاتا ہے عشقیہ مضامین سے حتماتی نتائج نکالنے کا کبھی بھوکا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ بیان میں اثر مطلق نہیں ہوتا کیونکہ شاعر اس خیال سے کہ قدیم شنویاں سے اپنی شنوی میں کچھ جدت پیدا کرے ہمہ تن صنائع لفظی کے انجام کرنے میں منہمک ہوتا ہے اسلئے اس کو کلام میں اثر پیدا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

بخلاف شاید تہہ ملکوں کے کہ وہاں کبھی قصہ یا شنوی میں ایک اچھوتا

اور نرالی بات پیدا کی جاتی ہے عقل و عادت کے خلاف باتیں جن پر اکثر ہماری شنویاں

ایسا بالآخر کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس اور میں کوئی انسان متعارف نہیں پاسکتا۔
 ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں انے عقل بشر نفس نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے انکے
 ایسی محال باتیں بیان کی جاتی ہیں جو عقل بشر نفس پر صادق نہ آسکیں۔ ممدوح کی طرف کوشش وہ خوبیاں
 فوسب کی جاتی ہیں جنکی ضد او اسکی ذات میں موجود ہیں بیش از ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ
 ایک ظالم کو عدل، بے شرافت کے ساتھ ایک احمق اور جھٹل کو دانشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ
 ایک عاجز بے دست و پا کو قدرت و کثرت کے ساتھ ایک ایسے شخص کو جسکی زبان نے کبھی گھوٹے
 کی پیٹھ کو مس نہیں کیا شہسواری اور فروغیت کے ساتھ۔ غرض کہ کوئی بات ایسی نہیں ہاں
 کی جاتی جسپر ممدوح فخر کر سکے یا جس سے لوگوں کے دلیلیں اچھی غفلت اور محبت پیدا ہو اور اسکے جان

و اثر زمانہ میں یادگار رہیں۔ // نثرین و نثرین تعریف و تحسین

(ہمارے پیش نویس کا یہ حال ہے کہ انہیں معمولی حمد و ثناء و غیرہ کے بعد کٹ پھلے کسی
 بادشاہ زادہ یا وزیر زادہ یا امیر زادہ یا سوداگر بچے کے حسن و جمال غیبیہ کی تعریف ہوتی ہے
 پھر اسکو کسی پری یا شاہزادی یا وزیرزادی یا اور کسی کے ساتھ لگا مارا جاتا ہے۔ وہ اوائل کے
 فراق میں شہر را و چنگل چنگل مارا مارا پھرتا ہے۔ پھر آخر کار ریل سے کامیاب ہوتا ہے۔ یہ کامیابی
 ایسی ضروری ہے کہ اسکی نسبت پہلے ہی سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔)

جو لوگ فی الواقع مسلم الشہوت شاعر ہیں یا اپنے تئیں ایسا سمجھتے ہیں وہ تعجب شنوی لکھینگے
 ضرور اسی قسم کی لکھینگے کہ بہتہ جو لوگ اُس درجہ کے شاعر ہیں انکی مشنویاں تاریخی۔ مذہبی یا اخلاقی
 مضامین پر بھی لکھی گئی ہیں لیکن اہل تو یہ مضامین خود رو کے پھیکے ہوتے ہیں اور پھر ان کے

شہزاد کو کاٹے دیتے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے زیادہ شاعری کے جوہر دکھانے چاہئے تو وہ صبح سے پہلے ایک تمہید لکھتا ہے جہیں یا تو فصل بہار کا ذکر ہوتا ہے (اگرچہ اُس وقت خزاں ہی کا موسم ہو) مگر اُس ذکر میں اس ناپاک دنیا کی فصل بہار سے کچھٹ نہیں ہوتی بلکہ ایک عالم بحث ہوتی ہے جو عالم اسکان سے بالاتر ہے یا زمانہ آسمان نصیب و قسمت کی شکایت ہو جو جو حقیقت خدا کی شکایت سمجھنا چاہیے جو زمانہ وغیرہ کی آڑ میں خوب دل کھول کر کیجاتی ہے اس میں بھی شاعر اپنے وقتی مصائب بیان نہیں کرتا اور نہ ممدوح کو اپنے اوپر جسم دلانے کی باتیں کہتا ہے بلکہ جس قسم کے مصائب لگے زمانہ کے شعرا نے اپنی نسبت بیان کیے تھے اور جیسے بتان اُنھوں نے آسمان و زمانہ وغیرہ پر باندھے تھے یہ بھی بہ ادنیٰ تغیر ویسی ہی مصائب بیان کرتا ہے اور اُسی قسم کے بہتان باندھتا ہے یا ایک فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف۔ اُسکے جو رولم کی شکایت۔ اور اپنے شوق و نظر کا سلسل یا غیر سلسل یا یا فخر و خود ستائی میں اس طرح کیا جاتا ہے جیسا کہ عقیدت نویسوں یا غزلوں میں ہوتا ہے یا فخر و خود ستائی میں تمام تمہید ختم کر دیجاتی ہے۔

اسکے بعد صبح شروع ہوتی ہے۔ صبح میں اکثر ایک نام کے سو کوئی خصوصیت ایسی

ذکر نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں صبح کیجاتی ہے کہ اگر بالفرض ممدوح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی؟ علت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدہ میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اُس کا جرم ثابت ہو سکے۔ صبح میں زیادہ تر وہی ممدوحی

پان۔ کبھی قبا۔ بند قبا۔ کلاہ چپیرہ۔ دستار۔ اور کبھی برقع۔ نقاب۔ محرم چادر۔ چوٹی چڑیا۔
اور خاص خاص زیوروں کا ذکر کرنا اور ان کو خاص خاص چیزوں سے تشبیہ دینا۔

باغ میں سے چند چیزوں کو انتخاب کر لینا جیسے سو قمری۔ گل۔ بیل۔ صیاد
مالی۔ باغبان۔ آشیانہ۔ قفس۔ دام۔ دانہ۔ یا من۔ نسیر۔ نشتر۔ ارغوان۔ سون۔ خار۔
گلچین۔ غنیمت۔

صحرا میں سے وادی چشمہ۔ آب رواں۔ سبز۔ قشہ۔ سیلاب۔ سرب۔ بصر۔ گرداب۔
لور۔ نخل۔ چار۔ غار۔ میلاں۔ رہزن۔ مہنا۔ خضر۔ قافلہ۔ جرس۔ آواز۔ دریا۔ نخل۔ لیے۔
مجنوں۔ جوش۔ جنوں۔ غیر۔

دریا میں سے کشتی۔ نا خدا۔ موج۔ گرداب۔ ساحل۔ حجاب۔ قطرہ۔ ماہی۔ نہنگ۔ غوطہ۔

محل میں سے شمع۔ پروانہ۔ شراب۔ کباب۔ پیالہ۔ مینا۔ صراحی۔ خم۔ جب۔ عہ۔
نشتہ۔ بخار۔ صبح۔ ساقی۔ دور۔ نیمہ۔ مطرب۔ چنگ۔ ارغنون۔ مضرب۔ پردہ۔ ساز۔ رقص۔

سماں۔ غم میں سے نالہ۔ آہ۔ افغان۔ تعلق۔ مضرب۔ دور۔ ویر شک۔ ضبط۔
دعوت۔ سلع و خیرہ۔

شوق۔ جدائی۔ یاد۔ تمنا۔ حسرت۔ جوان۔ رنج۔ غم۔ الم۔ سوز۔ دلغ۔ زخم۔ خلش۔ تپش۔ کاش۔

وغیرہ۔ یہ اسی قسم کے چند اور الفاظ ہیں جن پر بالفعل اردو زبان کی غزل گوئی کا دار و مدار ہے۔
قصیدہ میں بھی صرف چند معمولی سبکوں میں جنہیں ہمیشہ ہمارے شعرا

کہیں دیوانہ اور کہیں ہوشیار کہیں غیور اور کہیں چمکا گھڑا۔ رشک کا پتلا رقیبوں کا دشمن
 سارے جہان سے ہاگمان۔ آسمان کا شاکی زمین سے نالاں۔ اور ^{نہایت} تگ سے تنگ۔ ہر
 ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے نہیں اُن تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کے لئے
 قابلِ فوس خیال کیجاتی ہیں۔ یا مثلاً آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا
 یا زہد و واعظ و صوفی کو تباہ کرنا۔ اور بادہ کشن بادہ فروش اور ساقی و ^{مہمان} خمار کی تعریف کرنی اور ان سے
 حُریت ظاہر کرنا۔ ایمان و اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و ^{مہمان} معصیت
 سے غیبت ظاہر کرنی کبھی کبھی مالِ جاہ و منصب و نیوی کو حقیر ٹھہرانا۔ اور فقر و عشق و آزادگی وغیرہ
 کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ ^{مہمان} یہ سب طرح کے اوجہ و مضامین ہیں جو غزل کے لئے
 بننے والے ارکان و عناصر کے ہوتے ہیں۔ غزل کے ساتھ جو الفاظ مخصوص ہیں وہ بھی ایک نہایت
 تنگ دائرہ میں محدود ہیں مثلاً معشوق کی صورت کو حور۔ پری۔ چاند۔ سورج۔ گل۔ لالہ۔ باغ
 اور جنت وغیرہ سے۔ اسکی آنکھ کو زگر۔ آہو۔ بادام۔ ساحر۔ مست۔ بیمار وغیرہ سے۔ زلف کو
 سنبل۔ رشک۔ عنبر۔ کافر۔ جادوگر۔ رات۔ ظلمات۔ دام۔ زنجیر۔ کندہ وغیرہ سے۔ نگاہ و مشرود
 فترہ واد کو تیر و سناں و شیر وغیرہ سے۔ ابرو کو کمان سے۔ نوچن کو کوئیں سے۔ دانتوں کو توپوں
 سے۔ ہونٹوں کو لعل۔ یا قوت۔ گلبرگ۔ نبات۔ آبجیات وغیرہ سے۔ موند کو غنچہ سے۔ گلو بال سے
 یا دونو کو عدم سے۔ قد کو سرو۔ صنوبر۔ شمشاد۔ قیامت وغیرہ سے۔ رفتار کو فتنہ۔ قیامت
 بلا۔ آفت۔ آشوب وغیرہ سے۔ اور یہ سب طرح اور بعض اعضا کو چند خاص خاص چیزوں سے تشبیہ
 دینا معشوق کے سامان آرائش میں سے مشاطہ۔ شانہ۔ آئینہ۔ حار۔ سرمہ۔ کاجل۔ غارہ۔ مہر۔

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ غواہ معرفتِ آہی سے مجھ کو آنا بھی حسرت ملا کہ تمکدانی سے

نمک تو انکلی پر لگا کر چکھ لیتا۔

دوسرے شعر میں وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں باعتبار اپنی قابلیت اور استعداد کے جوہر
علوی ہوں مگر میر انصیب اپنی پستی کے سبب تحت الارض میں پڑا ہوا ہے پس کہتا ہے کہ کاش
ایسی تخیل یعنی انقلاب برپا ہو جس سے جہان زیر و زبر ہو جائے اور میر انصیب پستی سے بلندی
پہنچ جائے۔ ان دونوں شعروں میں اصلیت اور جوشِ بخوبی پایا جاتا ہے۔ لیکن طرز بیان
عام اذمان سے بالاتر ہے۔

(۱۵) آتش کہتے ہیں۔

ترسی تقلید سے کرب وری نے ٹھوکریں کھائیں
چلور میں ہڈی
نہیں بے وجہ ہنسنا نقدِ زخمِ شہیدان کا
ہانت کی طرح رکھان میں نے روزِ محشر تک

چلا جب جانور انسان کی چال اُسکا چلن بگڑا
ترسی تلوار کا مونہ کچھ نہ کچھ اس تیغ زن بگڑ
یہ اک بالِ موکم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

(۱۶) ذوق کہتے ہیں۔

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے
بہم رونے پہ آجائیں تو دور یا ہی بہائیں

جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا
شبِ نیم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ان شعروں میں بھی ساوگی بیان کے سوانہ صلیت ہی نہ جوش۔
اب صرف دو احتمال باقی رہ گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کلام میں صرف جوش پایا جائے اور

بیان کرتے ہیں۔

قدتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوے آشیان نہیں
اس شعر میں اصلیت اور جوش دونوں باتیں پائی جاتی ہیں مگر تیسری چیز یعنی سادگی جس سے الفاظ
اور خیال دونوں کی سادگی مراد ہے لہستہ نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ جب تک یہ جملہ کہ ”ابن نیا کا ایک
نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے“ شعر میں اضافہ نہ کیا جائے۔ عام ذہن محض مقصود کی طرف
انتقال نہیں کر سکے۔ لیکن انہیں شاعر نے ایک لطافت رکھی ہے جو سادگی کا فہم بدل
ہو سکتی ہے اگر بیان زیادہ صاف ہوتا تو وہ لطافت باقی نہ رہتی۔ اُس نے یہ جملہ گویا قصداً حذف
کر دیا ہے اور یہ جتنا چاہتا ہے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اُس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں
(۱۳۱) آتش کہتے ہیں۔

فصحت اکرم عہد طفلی میں روئے ملی پرورش پایا ہوا ہوں امن سیلاب کا
جامہ تن پہ گیا راہ عدم میں نذر گور بوجھ اٹھایا تھا گر ٹھگ کے لئے سب کا
ساحل مقصود دیکھا میں نے جا کر گور میں ڈوبنا کشتی تن کو فروغ تھا پایاب کا
ان تینوں شعروں میں شاید شکل سے کسی نہ کسی قسم کی اصلیت تو نکل آئے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے
نہ بیان میں سادگی ہے نہ جوش۔

(۱۳۲) نظیری کتاب۔

رہ نداد انقدرم بر سر خوان تو فلک کز نمکدان تو برب زخم انگشت نمک
رتخیزے کہ شود زیر وزر و زب وضع جہاں چند زخم بہا باشد و ختم بہ سمک

پہلے شعر میں اپنے تئیں بلحاظ اسکے کہ تعلقات میں پھنسا ہوا ہے گت آستان قرار دیا ہے جو
رات بھر اپنے مالک کے مکان کی پس بانی کرتا ہے مگر بلحاظ اسکے کہ تعلقات کو ترک کر کے جو
الی اسکرنا چاہتا ہے اپنے کو شکاری گنتے سے تشبیہ دی ہے جو رات بھر شکار کے شوق میں
اپنے گلے کے پٹے کو چاتا ہے کہ اُسکو کاٹ کر شکار کی تلاش میں جنگل کی راہ لے دوں
شعر میں نے یہ مضمون ادا کیا ہے کہ انسان جبیں یہ قابلیت ہو کہ ترقی کر کے ملائے پہنچ
جائے اُسکا ذہنی تعلقات میں آلودہ رہنا ایسا ہے کہ گویا آب حیات ظلمات میں چھپا ہوا ہے
اور چونکہ جاذبہ لطف آہی ہر وقت انسان کی گھات میں ہے کہ اُسکو اپنی طرف کھینچ کر تعلقات
پھندے سے نجات دے اور نیز یہ بھی مشہور ہے کہ خضر کندر کو ساتھ لیکر آب حیات کی تلاش
کئے تھے ایسے جاذبہ آہی کو خضر سے اور آپ کو آب حیات سے تشبیہ دیکر کہتا ہے کہ تعجب ہے
اگر خضر سری تلاش میں نہ ہو کیونکہ میں آب حیات کی طرح ظلمات میں پڑا ہوا ہوں۔

ان دونوں شعروں میں صلیت اور غایت درجہ کا جوش و نوباتیں کمال خوبی کے ساتھ
پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ایسے بلینج شاعر کی نسبت یہ کہنا بے دردی ہے کہ انہیں کسی چیز کی
ہو اور کسی خوبی میں کمی ہے لیکن جو معنی سادگی کے اوپر بیان کیے گئے ہیں اُنکے لحاظ سے
کہا جاسکتا ہے کہ انہیں سادگی ایسی نہیں پائی جاتی کہ عام اہل زبان یا زبان دان اُسکو اچھی
سمجھ سکیں۔

(۱۴) مومن اس مضمون کو کہ اہل نیا کا ایک ایک بلا میں مبتلا رہنا ایک ضروری بات
اور ایسے جب بھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں۔ اس طرح

شے تاریک ہے سیم موج و گرد بے چینیں ہائل کجا ز ہند حال ہبکسارانِ حائل
(۷) شیخ ابراہیم ذوق اس بات کو کہ مرنے کے بعد بھی اگر رحمت نہ ملی تو دل کو تسلی
دینے کی پھر کوئی صورت نہیں یوں بیان کرتے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کہہ جاؤ گے
(۸) مرزا غالب انسان کے لاشے اور بیچ ہونے کو اسطرح ادا کرتے ہیں۔
خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا ہماری زندگی کیا اور ہمس کیا
(۹) میر تقی فرط محبت و ولہستگی کی اسطرح تصویر کھینچتے ہیں۔

جب نام تیرا لیجے تب چشم بھرتے اس طرح کے جینے کو کہاں لے جلا کر آئے
۱۰ خواجہ میر درد اپنی شہرت اور مقبولیت کا محض بے اصل بے بنیاد ہونا اسطرح ظاہر
کرتے ہیں۔

تہمتیں چنپ اپنے ذمے دھر چلے کیلے آئے تھے ہم کیا کر چلے
ان تمام مثالوں میں جیسا کہ ظاہر ہے بیان کی سادگی صلیت اور جوشِ نینوں باتیں بوجہ حسن
پائی جاتی ہیں۔

(۱۱) نظیری امحالت کو جب کہ اُسے سفر حج کا ارادہ کیا ہے اور تعلقاتِ نیوی سے آواز دے
اور خدا کی طرف رجوع کرنے کا شوق اُسکے دلیں موجزن ہے اسطرح بیان کرتا ہے۔

سگ ستام آما ہمہ شرفِ بلا دہ خایم کہ سرشکار دارم نہ ہولے پاسبانی
عجب زنبورہ باشد خضر سے بھیج جویم کہ قادیام طلبت چو زلالِ زندگانی

لَقَدْ لَامَنِي عِنْدَ الْقَبْرِ عَلَى الْيَمِينِ دَفِئِي بَيْنَ ذَاكِ الدُّمُوعِ السَّوَاقِتِ
فَقَالَ أَتَبْكِي كُلَّ قَبْرِ رَأَيْتَ فِيهِ لِعَلِّ نَفْسٍ بَيْنَ اللَّوْنِ الدَّكَادِكِ
فَقُلْتُ لَكَ إِنَّ الشَّجَا يَبْغِثُ الشَّجَا فِدَعْنِي فَمَا كَلَّهَ قَبْرُ مَا لَكَ

یعنی میں جو قبرستان کو دیکھ کر رونے لگا تو میرے رفیق نے میرے آنسو جاری دیکھ کر مجھ کو بلا
کی کہ جو قبر (یہاں سے بہت دور) مقام لوی اور وکاوک کیج میں واقع ہے (یعنی قبر ملک)
اُس کے لیے تو ہر کو کو دیکھ کر رو پڑتا ہے۔ میں نے کہا (اے عزیز) مصیبت مصیبت کو یاد دلائی جا
بس مجھ کو رونے دے میرے نزدیک یہ سب مالک ہی کی قبریں ہیں۔

(۳۴) ناصر خسرو دنیا کی حقیقت بیان کرتا ہے

ناصر خسرو برا ہے یہ گزشت ست ولا یعقل نہ چوں میخوارگان
دید گور چند بیت ز روبرو بانگ برزد و گفت کاے نظارگان
نعمت دنیا و نعمت خوارہ ہیں اینش نعمت اینش نعمت خوارگان
(۳۵) نظامی مناجات میں کہتے ہیں۔

پردہ بر انداز و پر و آے - فرد
در منم آن پر وہ بسم رنور و

(۵) نظیری بیت اللہ سے رخصت ہوتے وقت کہتا ہے۔

مطب ستم ز خانو گاہ سلطان آمدہ سر خوشنل حاشہ با خود بہ الحال آمدہ

(۶) خواجہ حافظ اپنی ایک خاص حیدرانی حالت کو جس سے بے درد لوگ نا محرم ہیں اس طرح
بیان کرتے ہیں۔

بیان کرتے تھے اور ہر لے اُنکے ہاں صد اہلی نام انہی محاشیق کے موجود ہیں جیسے لیل
سلمیٰ سعادہ سعدی عذرا۔ غزہ خواجہ بیہیہ عقیقہ فاطمہ زینب وغیرہ وغیرہ۔ مگر تاخرین شیر خوار
بچوں کے طبع کہ روتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیوں روتے ہیں محض تقلید افرضی ناموں سے کہ لگا کر انہی
جدائی اور شوق و آرزو کا دکھ ارفنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ عرب کے یہ رنگ ایران میں اور وہاں
ہندوستان میں پھنچا اور آخر کار مسلمانوں کی شاعری کا حال اُس میں ایران بستی کا سا ہو گیا جو کبھی
آرمیوں سے معمور تھی مگر اب ہاں سونے مکانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اب ہم چند مثالیں ایسے اشعار کی لکھتے ہیں جن میں طعش کی تینوں شرطیں یا انہیں ایک
یا دو شرط پائی جاتے۔ یا بالکل کوئی شرط نہ پائی جاتے۔

(۱) ابن سحبی بن زیادہ۔ مکروہات دنیوی کو خوشی سے قبول کرنے کے باب میں کہتے ہیں

وَلَمَّا رَأَيْتُ الشَّيْبَ لَاحَ بَيَاضُهُ بِمَفْرِقِ رَأْسِي - قُلْتُ لِلشَّيْبِ مَرَجًا

وَلَوْ خِفْتُ أَنِّي إِنْ كَفَفْتُ خَيْرِي تَنَكَّبَ عَنِّي - دُمْتُ أَنْ يَتَنَكَّبَا

وَلَكِنْ إِذَا مَا حَلَّ كُرْهُ - هُنَا حَتَّ بِهِ النَّفْسُ يَوْمًا - كَانَ لِلْكَرْهِ أَذْهَبًا

یعنی جب میں نے دیکھا کہ بڑھا پامیرے سر کے بالوں میں نمودار ہوا۔ تو میں نے اُس کو نہیں
مقدم کہا۔ اگر یہ سید موتی کہ وہ ایسا نہ کر نیسے ٹل جائے گا۔ تو میں اُسکے ٹالنے میں کوشش کرتا
مگر بات یہ ہے کہ مصیبت کے دفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ اُس کو بہ کشادہ پیشانی
قبول کیا جائے۔

(۲) مہتمم بن نویرہ اپنے بھائی مالک کے مرثیہ میں لکھتے ہیں۔

عرب کی شاعری میں زیادہ جوش ہونے کا سبب چھ اوائلی اور

داردات پر تھا عشقہ اشعار زیادہ ترویجی لوگ کہے جے جو فی الواقع حب کا زار کے مر
دوستگی رکھتے تھے۔ رزمیہ اشعار وہی لوگ پڑھتے تھے جو فی الواقع حب کا زار کے مر
دوستگی رکھتے تھے۔ رزمیہ اشعار وہی لوگ پڑھتے تھے جو فی الواقع حب کا زار کے مر

میدان تھے فخریہ اشعار میں غزلیں بھی واقعات بیان کرنے کے لئے لکھی جہاں پر ایک اور جگہ سبب ہے انکی بہادری

بیاد ان سے میری
یازد کے قبیلہ کے لوگوں سے علی الاعلان ظاہر ہوئے سے اور یہ
فیاضی یا فصاحت ضرب اہل ہو جاتی تھی۔ ان کی مشریت کوئی محض تقلید ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ
ماغیرہ یا بزرگ یا نامور آدمی کی موت سے چوٹ لگتی تھی وہ

[illegible]

ظالم کی مذمت میں ظالم کی فریادیں سن کر ہر ایک کی حالت یہ تھی کہ اگر افسوس ہو کہ خلافت عباسیہ

ہم کی مذمت پر ہرگز ہنسنا نہ آئے۔ اور تصنیع کے بیان کرنے میں پوری سہولت حاصل گئی۔

دلیس اٹھتا تھا اسکو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شعر کے تمام اسرار میں تعلیم پھیل گئی۔

کرنے والے سے یہ سچا چشم کم ہونا شروع ہوا اور آخر کار شعر کے تمام اسرار میں تعلیم پھیل گئی۔

نہ زمانہ سے یہ سچا جوش کم ہوا نہ تھا۔ یہ وہ قدما کی طرز و روش بلکہ اس کے
 شعر بجائے اس کے کہ خود شاعر کے جذبات کا آئینہ ہو وہ قدما کی طرز و روش بلکہ اس کے
 اور انھیں کے حالات کا اکرین بن گیا۔ قدما سچ مچ اپنے اور اپنے بڑوں کے
 کہ ان کا نام ہے۔

جذبات کا آئینہ اور انھیں کے خیالات کا آئینہ یہ ہے۔
 نمایاں پر فخر کرتے تھے مبالغہ جھوٹی دوستیاں کر کے انکا موہ چرچانے لگے اور اسکا نام مہر
 بکیم صاحب مہشوقہ کی محبت میں اپنے دل کے جذبات اور واردات

شعر ارکھا۔ قدماچ مچ کسی نہ کسی اصل مشوقہ کی محبت میں ہے مں

”ہم نیشل کے پوتے نیشل کے پوتے ہونے پر فخر کرتے ہیں اور نیشل ہمارا دادا ہونے پر فخر کرتا ہے“

”عزت اور برتری کی کسی حد تک گھوٹے دوڑاے جاتیں سب آگے بڑھنے والے جب پاؤ گے بنی نیشل کچے گھوٹے پاؤ گے“

”ہم میں سے کوئی سردار جب تک کہ کوئی لڑکا اپنا جانشین بننے کے لائق نہیں چھوڑنا دینا سے نہیں اٹھتا۔“

”لڑائی کے دن ہم اپنی جانیں سستی کر دیتے ہیں مگر امن کے زمانے میں اگر انہی قیمت پوچھے تو اتنول میں“

”ہماری مانگوں کے بال (عطریات کے استعمال سے) سفید ہیں ہماری دیکھیں مہمانوں کے لئے گرم ہیں ہمارا مال ہمارے مقتولوں کے خون بہا کے لئے وقف ہو“

”میں اُس قوم میں سے ہوں جسکے بزرگوں نے دشمنوں کے لئے کہنے پر کہ ”کہاں ہیں قوم کے حمایتی“ اپنے کو نسبت و نابود کر دیا“

”اگر ہزار میں ہمارا ایک موجود ہو تو بھی جبکہ کہا جائے گا کہ ”کون ہے شہسوار“ تو انہی اپنے ہی پر نگاہ پڑے گی“

”ہمارے لوگوں کی یہی سخت مصیبت پڑے انکو اور وہی طرح اپنے مقتولوں پر ومانہ پاؤ گے“

”ہم کشت ہو ناک موقوفوں میں گھس جاتے ہیں مگر حقیقت اور تلواریں جنہوں نے ہے قول ہمارا ہے ہماری شب بکلیں آسان کر دیتی ہیں“

مگر ایسے دھیسے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو ٹھیک چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اس جوش کا پورا پورا اندازہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو صاحب ذوق ہیں اور جنہیں بے محل ہزاروں آہیں اور نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنا کہ بچل کسکا ایک ٹھنڈا سانس بھرتا۔

ایک یونانی شاعر کی
جوش اور جوش کا

عبرانیوں کی شاعری سب سے زیادہ جوشیلی مانی گئی ہے۔ ایک یورپین محقق کا قول ہے کہ عبرانی شاعروں کے کلام میں اس قدر جوش ہے کہ انکا شعر سن کر یہ

معلوم ہوتا ہے گویا صحرا میں ایک تناور درخت جل رہا ہے یا ایک شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے کیونکہ اُنہیں بھی بے انتہا جوش

عرب کی شاعری بظاہر عبرانی شاعری پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اُنہیں بھی بے انتہا جوش

پایا جاتا ہے۔ ایسے جیسا کہ یورپ کے موز لکھتے ہیں عرب یونانیوں کی شاعری سے نفرت کرتے تھے کیونکہ اُنکو یونانی شاعری اپنی شاعری کے آگے پھینکی۔ ٹھنڈی اور اور دے

بھری ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ یونانیوں کی جتنی کتابیں اُنھوں نے ترجمہ کیں انہیں ایک دیوان شعر ترجمہ نہیں ہوا۔ وہ ہومر۔ سوفوکلیر اور نیڈار کو اپنے شعرا کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر عربی نظم کا حاصل اردو میں لکھ کر ناظرین

کو دکھاتے ہیں تاکہ اُنکو معلوم ہو کہ عرب شعر میں کس قدر جوش ظاہر کرتے تھے۔ مگر چونکہ اردو میں عربی زبان کی خوبی باقی رہی نا ممکن ہے ایسے یہ ایک ناقص نمونہ عربی شاعر کا ہوگا۔

شائستہ بن حزن ہشلی جو ایک اسلامی شاعر ہے فخریہ اشعار میں کہتا ہے۔

کے اُن کھنڈروں کی زبان حال سے جو دلائل میں اُسے اپنی آنکھ سے دیکھے انکی تباہی
بربادی کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

بارگاہِ دادیم۔ ایں رفتِ ستم برما ^{مصلحت} بر قہرِ ستمگاراں آیا پھر رو دھلا ^{مصلحت} تباہی
یعنی ہم جو کبھی نوشیرواں کے عدل و انصاف کی بارگاہ تھے جب گردشِ روزگار نے
ہمیں اس حال کو پہنچا دیا تو ظالموں کے محلوں پر کیا نوبت گذرتی ہوگی

فردوسی اُس گفتگو کو جو یزدجر نے سعد و قاص کے ایلچی سے
کی تھی اس طرح بیان کرتا ہے ^{superior person}۔

ز شیرِ شتر خورون و سُویمار ^{a kind of lion} عَرَب را بجایِ ریدست کا

کہ ملکِ عجم را کنند آرزو ^{عجم} تقو بر تو اے چرخ گرداں تقو

فردوسی نے ان موقع پر جیسا کہ اُسکے بیان سے ظاہر ہے اہلِ یزدجر و کا جامہ
پہن لیا ہے اور اُسکے غصہ اور جوش کی نقل کو بالکل اصل کر دکھایا ہے۔

جوش سے یہ مراد نہیں ہے کہ مضمون خواہ خواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں

میں ادا کیا جائے ممکن ہے کہ الفاظ نرم ملائم اور دھیمے ہوں۔ مگر نہیں غایتِ درجہ کا جوش

چھپا ہوا ہو خواجہ حافظ کہتے ہیں

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیرِ کمال گفت ^{میر تقی} فراق یارِ ناز آں سیکند کہ بتوان گفت

دہنِ رنجا و بیانِ ہر سخن

یعنی

میر تقی کہتے ہیں۔

دلِ سمنردہ کو ہنسنے تمام تمام لیا

ہمارے آگے ترا جب لکھنے نام لیا

صرف نمونہ کے طور پر ایک دو مثال لکھی جاتی ہیں۔
(۳) نظیری نیشاپوری باوجودیکہ ایک نہایت معقول و خوب شاعر ہے شانہ زادہ مرا

کی مدح میں کہتا ہے۔

توئی کہ بودہ و نابودہ جہاں ازت
مغن درت بگفتیم ہرچہ باد اباد

توئی کہ بودہ و نابودہ جہاں ازت کی تعریف میں کہتا ہے۔

(۴) عرفی حکیم ابوالفتح کے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے۔
از ازل سوے ابد و زابد آید بہ ازل
آئینہ رخسار آں سبکیہ کہ چوں گرم غنائش ساری

آئینہ رخسار آں سبکیہ کہ چوں گرم غنائش ساری
قطرہ کش دم فتن چکد از پیشانی
شبم آساش نشیند کہ جعت بہ کفل

جوش سے یہ مراد ہے کہ مضمون ایسے بیاختہ الفاظ اور موثر پیرائے میں بیان کیا جا
جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون

پیش کیا کہ اس سے

جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے بندھوایا ہے۔

نئے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اُس سے بندھوایا ہے۔

ایسا جوش شاعر کے ہر قسم کے بیان میں عام اس سے کہ وہ خود اپنی حالت بیان کرے

یاد و سرے کی۔ اور خوشی کا بیان کرے یا غم کا۔ اور تعریف کرے یا مذمت کرے۔ یا نہ تعریف کرے

نہ مذمت۔ غرض کہ ہر صنف مضامین میں جو کہ شعر کے پیرایہ میں بیان کیے جاسکتے ہیں

پایا جاتا ممکن ہے۔ شاعر کی ذات میں جو چیز سے متاثر ہونے۔ ہر شخص کی خوشی یا غم میں

شریک بنے۔ اور ہر ایک کے جذبات سے متکلیف ہو جانے کا ایک خدا واد ملکہ ہوتا ہے۔ وہ

زبان بلکہ بے جان چیزوں کی حالت انکی زبان حال سے ایسی بیان کر سکتا ہے کہ اگر ان میں

گوئیائی ہوتی تو وہ بھی اپنی حالت اُس سے زیادہ بیان نہ کر سکتیں خاقانی نوشیروان کی گنج

پانچویں صورت کی مثال جہیں صلیت پر شاعر نے کیس قدر اضافہ کر دیا ہو جیسے شیخ شیرازی
ترکان خاتون کرمانی کی طرح میں کہتے ہیں۔

منشور در نواحی و مشہور در جہاں آوازہٴ تعب و خوف رہاے تو

شکرت مسافراں کہ بہ آفاق می برند گریز فلک سے سند رہند بر عطاے تو

تیج بازاراں نہ کند در دریا رخصم چنداں اثر کہ ہمت کشور کشاے تو

نیز شیخ۔ ابو بکر سعد کی تعریف میں کہتے ہیں۔

بتیغ وطن گرفتہ بن جنگویاں ملک تو بہر و بچہ گرفتہ بہ عدل و ہمت و رے

دو خصلت اندنگہاں ملک یاوردین بگوش جان تو پذیر ام این و گفت خداے

یکے کہ گردین زور اوراں تقبیر بن دوم کہ از دریا چارگاں بلطف درایے داخل ہے

چشم عقل مرا بس خلق بادشاہانند کہ سایہ بر ایشان فگندہ چو ہلے

چونکہ شیخ کے ان دولہ و ممدوحوں کا حال معلوم ہے کہ وہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ کسی نہ کسی

مصنف تھے ایسے شیخ کے ان مدحیہ اشعار کو ا صلیت پر مبنی سمجھا جائے گا لیکن اگر یہ اوصاف

کسی ایسے ممدوح کے حق میں بیان کیے جاتیں جو بالکل اُنسے معر او جیسا کہ ہمارے شعرا کے قصائد

میں عموماً دیکھا جاتا ہے تو کہا جائے گا کہ شعر ا صلیت پر مبنی نہیں۔

ان پانچ صورتوں کے سوا اور کوئی صورت ایسی نہیں مل سکتی جنہیں شعر کو کھینچ

توان کر کی طرح ا صلیت پر مبنی قرار دیا جائے اور ایسے کلام کی ہماری شاعری میں کچھ نہیں ہے

نہ صرف متاخرین کے بلکہ متقدمین کے کلام میں بھی ایسی مثالیں دفتر و قلم موجود ہیں۔ پچاں

عقل من پروانہ گشت وہم ندید چوں تو شمعے دھندرا راں انجمن

اسی صورت کی دوسری مثال شیراز کی فصل بہار کے بیان میں۔

سرخ ریحان ست یا بوسے بہشت خاک شیراز ست یا شک خن

چوتھی صورت کی مثال جہیں سامعین کو یہ معلوم ہو کہ گویا شاعر کے تحت مدیہ میں

ہو جس طرح وہ بیان کرتا ہے ایسی ہے جیسے نظیری اپنی بڑائی اور زمانہ کی ناقدری کی بیان میں کہتا ہے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودے چو سبح باز پر فتنی و کس قدر تو شناخت دین

فکس

عرفی اپنی بڑائی افسوس کرتا ہے۔

سر زردہ ام بامہ کنعان کیسے جیب معشوق تماشا طلب آئینہ گیرم

ایسی خود ستانی اور فخر کو اصلیت پر مبنی ٹھہرنے سے شاید ناظرین کو بادی النظر میں

ہوگا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ گویا ایسے مضامین مبالغہ سے خالی نہیں ہوتے مگر ان میں

کم و بیش رستی کی جھلک ضرور ہوتی ہے۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسے مضامین میں رستی

مطلق نہیں ہوتی تو بھی ہمیں کچھ شک نہیں کہ بعض شعرا کے فخر و مبالغہ میں ایسا جوش ہوتا

جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ لگ فی الواقع شعر لکھتے وقت اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے

اور صرف انکا ایسا سمجھنا اس بات کے لیے کافی ہے کہ اُنکے فخریہ اشعار کو اصلیت پر مبنی سمجھا جائے

کیونکہ اصلیت کے معنی جو کچھ کہ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ شاعر کے بیان کا کوئی منشا یا محلی عنہ نفس

the thing related

ہو۔

میں یا صرف

بادبوئے سخن آورد گل و سنبل و بید
 در دو کال بچہ رونق بکشا یار عطر
 خیری و ظلمی نیلو فروستاں افروز ^{گلستان}
 نقشہائے کہ درو خیرہ بماند بصیر ^{السنبل} نظر کن
 ارغواں ریختہ بردر کہ خضرک چین ^{greenery}
 این ہنوز اول آثار جہاں افروز گیت ^{جان سے روشنی}
 شاخہا و خیر و شیر و باغند ہنوز
 باش تا حاملہ گردند بہ الوان شمار ^{گرفت زین}

دوسری صورت کی مثال جہیں شعر کی بنیاد سامعین کے عقیدہ پر رکھی جاتی ہے ایسی
 جیسے مثلاً میر انیس ماتم سید الشہداء میں لکھتے ہیں۔

تھرتے ہیں لوح و قلم و عرش معظم ^{عزت}
 باندھو ہیں ملائک کی صفیں حلقہ نام ^{دست}
 ڈرے نہ اٹ جائے کہیں دفتر عالم

باقصوں سے عطار کے قلم چھوٹ پڑا ^{نئی نظم}

ہر فرد پہ اک غم کا فلک ٹوٹ پڑا

مونہ ڈھانپے ہو روئی کے یو جوج پہ ہنسا ^{آسمان}

تاروں پھی طاری ہو غم ایسا کہ نہیں تاب ^{نفس} یاروں پناہ ^{میں} کہ جہت ہوئی نایاب

قتل پسیر سید لولاک کا دن ہے

یہ خاتمہ خجستہ پاک کا دن ہے ^{مستطاب}

تیسری صورت کی مثال جہیں شاعر محض اپنے عندیہ پر شعر کی بنیاد رکھتا ہے ایسی ہے
 جیسے شیخ شیرازی معشوق کی طرف خطاب کر کے کہتے ہیں۔

سودا اور فوق جیسے شاق شاعروں سے بھی ایسی سادگی نہج نہیں کی میسر نہیں باوجود
 زبان کی شستگی و صفائی پر نہایت دلدادہ ہیں مگر طرز جدید کے مرثیہ میں انکو بھی کثرت سے عربی
 فارسی الفاظ استعمال کرنے اور ہمیشہ کے لئے اپنے روزمرہ میں دخل کرنے پڑے ہیں خصوصاً
 اس زمانہ میں کہ روز بروز لوگوں کی معلومات اور اطلاع بڑھتی جاتی ہے اور شاعری میں خیالات
 جدید اضافہ ہوتے جاتے ہیں جنکے لئے اردو کے محلی میں الفاظ ہم نہیں پہنچتے ممکن نہیں کہ اردو
 کے محدود روزمرہ میں ہر قسم کے خیالات ادا کیے جاسکیں *

اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقتاً
 نفس الامر پر مبنی ہونا چاہیے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعری بنیاد رکھی گئی
 ہو وہ نفس الامر میں ناگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے غف یہ میں فی الواقع موجود ہو یا
 ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اُسکے غنہ میں فی الواقع موجود ہے نیز اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی
 مقصود نہیں ہے کہ بیان میں اصلیت سے سرسبز و سبز ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت
 ہونی ضرور ہے اس پر اگر شاعر نے اپنی طرف سے فی الجملہ کبھی بیشی کر دی تو کچھ مضائقہ نہیں ہے
 پہلی صورت کی مثال جہیں شعری بنا محض حقائق نفس الامر پر مبنی ہو

جیسے شیخ شیرازی ہمارے تعریف میں کہتے ہیں۔
 آدمی زادہ اگر در طرب آید چه عجب
 باش تا غنچه یارب دہن باز کند
 سرور باغ برقص آمدہ و بید و خند
 باد اداں چو سہ رنافہ آہوے سار
 بہت چوں عارض گل بکوعی کردہ یا
 غنہ زلالہ فرو آمدہ ہنگام بحر

ہمارے نزدیک ایسی سادگی پر پوجائیت در کاکت کے درجہ کو پہنچ جائے سادگی کا اطلاق کرنا گویا
 سادگی کا نام بدنام کرنا ہے ایسے کلام کو سادہ نہیں بلکہ عامیاناہ کلام کہا جائے گا لیکن ایسا کلام
 جو اعلیٰ و اوسط درجہ کے آدمیوں کے نزدیک سادہ اور پھل ہو اور ادنیٰ درجہ کے لوگ اسکی
 اصل خوبی سمجھنے سے قاصر ہوں ایسے کلام کو سادگی کی حد میں داخل رکھنا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ
 کہ جو عمدہ کلام ایسا صاف عام فہم ہو کہ اسکا اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگ
 سمجھ سکیں۔ اور اس سے یکساں لذت اور حظ اٹھائیں۔ وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اسکو
 سادہ اور پھل کہا جائے۔ مگر کوئی ایسی نظم جسکا ہر شعر عام فہم و خاص پسند ہو خواہ اسکا لکھنے
 والا ہومر ہو یا شکسپیئر نہ آج تک سر انجام ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا
 تو شکسپیئر کے ڈکس پر شریں لکھنے کی کیوں ضرورت ہوتی۔

ہمارے نزدیک کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ خیال کیسا ہی بلند اور
 دقیق ہو مگر چپ رہے اور ناہموار نہ ہو۔ اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تجاؤ اور روزمرہ کی بول چال کے
 قریب قریب ہوں۔ جقدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی اسقدر سادگی
 کے زیور سے محفل سمجھی جائے گی۔ تجاؤ اور روزمرہ کی بول چال سے نہ تو عوام الناس اور سوتیلوں
 کی بول چال مراد ہے اور نہ علما و فضلا کی۔ بلکہ وہ الفاظ و محاورات مراد ہیں جو خاص عام
 دونوں کی بول چال میں عامۃ الورد ہیں لیکن اردو زبان میں سادگی کا ایسا التزام ہر قسم کے کلام
 میں نبجہ نہیں سکتا۔ اگر کچھ نبجہ سکتا ہے تو محض عشقیہ غزل یا عشقیہ مثنوی میں بیجا کہ میر و
 سودا اور انکے اکثر معاصرین اور بعض متاخرین نے خاص ان دور صنفوں میں کیا ہے۔ قصیدنا

اور مہا حافظہ کے قبرستان نے اپنے سارے مڑے اٹھا بٹھائے۔ لیکن جہاں فقہہ کی
 ترکیب بدلی یا کسی لفظ کی جگہ اسکا مرادف رکھ دیا۔ اُسی وقت سارا اثر کا فور ہو گیا جو شخص اس کے
 کلام میں ایسی تبدیلی کے بعد وہی طلسم کھڑا کرنا چاہے وہ اپنے تئیں ایسی ہی غلطی میں پاتے
 جیسا الف لیلہ میں قاسم نے اپنے تئیں پایا تھا کہ وہ ایک دروازہ پر کھڑا ہوا پکار پکار کر کہہ رہا تھا
 ”دکھل گیہوں“ ”دکھل جو“، مگر دروازہ ہرگز نہ کھلتا تھا جب تک یہ نہ کہا جا کہ ”کھل نہ سیم“
 ملٹن کی تینوں شرطوں کی شرح اگرچہ کسی قدر اوپر بیان ہو چکی ہے۔ لیکن ہماری
 نزدیک ابھی اُس میں کسی قدر اور تشریح کی ضرورت ہے۔

سادگی ایک اضافی امر ہے۔ وہی شعر جو ایک حکیم کی نظر میں محض سادہ اور
 سہل معلوم ہوتا ہے اور جس کے معنی اُس کے ذہن میں منجھو سننے کے متباد رہ جاتے
 ہیں اور جو خوبی اُس میں شاعر نے رکھی ہے اُس کو فوراً اور اک کر لیتا ہے۔ ایک عامی آدمی اُس کے
 سمجھنے اور اُس کی خوبی دریافت کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک علمیانہ شعر جو سن کر
 ایک بہت خیال جامل اچھل پڑتا ہے اور وجد کرنے لگتا ہو ایک عالی دماغ حکیم اُسی کو سن کر ناک
 چڑھا لیتا ہے اور اُس کو محض ایک سخیف اور رکیمے سبک تنگ بندی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا

8 الف لیلی میں قاسم اور علی بابا دونوں بھائیوں کے قصہ میں ذکر ہے کہ کسی پہاڑ میں ایک غار تھا جہاں لوگ لادھ
 اور سرے لوٹ مار کر کے جلاتے آتے نہیں جینے کو دیا کرتے تھے غار کا دروازہ ہمیشہ ”کھل نہ سیم“ کہنے پر کھل جاتا تھا
 اور بند ہو سیم پر بند ہو جاتا تھا۔ ایک بار علی بابا نے چھپ کر قزاقوں کو دروازہ کھولتے اور بند کرنے دیکھ لیا جب وہ
 چلے گئے تو اُسی ترکیب سے اُسے دروازہ کھولا اور بہت مال و سامان سے گدھوں پر لاد کر لے آیا۔ قاسم کو خبر ہوئی
 تو وہ بھی اُس سے دروازہ کھولنے کا مترسیک کر دیا۔ پہچان جب کوئی وہ دروازہ کھول کر اندر جاتا تھا تو کوڑا خود بخود بند ہو جاتا
 کرتے تھے اور پھر اُسی مترسے کھلتے تھے۔ قاسم اندر گیا تو وہ مترسہ بند تھا جب ال لیکر باہر آنا چاہا تو سیم نہ کھول گیا اسکی جگہ کھل جو
 یا کھل گیہوں کہنے لگا دروازہ نہ کھلا یہاں تک کہ قزاق اپنے اور قاسم کو قتل کر ڈالا ۱۲

و کھا کر لوگوں کو اپنی خاص لیاقت پر فریفتہ کرنا نہیں چاہتے۔

” دوسری بات جو ملٹن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ شعر صلیت پر مبنی ہو اس سے غرض ہے کہ خیال کی بنیاد ایسی چیز پر مبنی چاہیے جو حقیقت کچھ وجود رکھتی ہو۔ نہ یہ کہ سارا مضمون ایک خنجر اب کا ساتھ ساتھ ہو کہ ابھی تو سب کچھ تھا اور آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔ یہ بات جیسی مضمون میں ہونی ضرور ہے ایسی ہی الفاظ میں بھی ہونی چاہیے مثلاً ایسی تشبیہات استعمال نہ کی جائیں جن کا وجود عالم بالا پر ہو۔ “

” تیسری بات یہ تھی کہ شعر جوش سے بھر اہوا ہو۔ اس سے صرف یہی مراد نہیں کہ شاعر نے جوش کی حالت میں شعر کہا ہو یا شعر کے بیان سے اُس کا جوش ظاہر ہوتا ہو بلکہ ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ جو لوگ مخاطب ہیں اُن کے دل میں جوش پیدا کرنے والا ہو۔ اور اس غرض کے لئے ضرور ہے کہ اُن کے دل ٹٹولے جائیں اور اُن کے دلوں کو جذب کرنے کے لئے ایک مقناطی کشش بیان میں رکھی جائے۔ “

جس مقناطی کشش کا ذکر اس محقق نے ملٹن کے الفاظ کی شرح میں کیا ہو لاؤ مرکا لے کہتے ہیں کہ وہ خود ملٹن ہی کے بیان میں پائی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ” جو شوہر ہے کہ شعر میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ عموماً یہ فقرہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔ مگر جب ملٹن کا کلام پگایا جاتا ہے تو بہت ہی ٹھیک بیٹھتا ہے۔ اُس کا شعر افسوں کی طرح اثر کرتا ہے۔ حالانکہ بادی نظر میں اُس کے الفاظ میں اوروں کے الفاظ سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتا۔ مگر وہ منتر کے الفاظ ہیں کہ جو ہیں تلفظ میں آئے فوراً ماضی حال در دور۔ نزدیک ہو گیا۔ مجاہد کی نئی نئی شکلیں موجود ہوں گیں

خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئیں جنکے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو۔
 کے شاعر عام پر چلنا۔ بے تکلفی کے سیدھے رستے سے اور صراحت نہ ہونا اور نہ کہ کو جلائیوں سے
 رکھنا اسی کا نام سادگی ہے۔ عکاسی کے طالبوں کے لئے ایسا صاف نہیں ہو سکتا جیسا کہ
 شعر کا رستہ اُسکے سامعین کے لئے صاف ہونا چاہیے۔ طالب علم کو پستی اور بلندی۔ غار اور شیلے
 انکار اور تپھر۔ موجیں اور گرداب طے کر کے منزل پہنچنا ہوتا ہے۔ لیکن شعر پڑھنے یا سننے والے کو
 ایسی ہموار و صاف ٹرک ملنی چاہیے جس پر وہ آرام سے چلا جائے۔ ندی نالے اُسکے اور صراحت
 چل رہے ہوں اور پھل پھول و درخت اور مکان اُسکی منزل ملکی کر نیکی لئے جبرگہ موجود ہوں
 میں جو شاعر مقبول ہوتا ہے اس کا کلام ہمیشہ ایسا ہی دیکھا گیا ہے اور ایسا ہی سنا گیا
 ہر ذہن سے مصاحبت اور ہر دل میں گنجائش ہوتی ہے۔ ہر مرنے والے کلام میں ہر گونہ چرکا ایسا
 نقشہ کھینچا ہے کہ اُسکو جان۔ بڑھے اور وہ قومیں جو ایک دوسرے قصبوں کے فاصلے پر تھیں
 ہیں بڑھ چکی اور یکساں فراتے سکتی ہیں۔ عالم محبت کے چتے چتے پر جہاں جہاں کہ اُس کا کلام پہنچا
 اُسکی روشنی سوچ کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آباد اور ویرانہ کو برابر روشن کرتا ہے اور فاصلے
 یکساں اثر ڈالتا ہے۔ شکسپیر کا بھی ایسا ہی حال ہے جیسا ہومر کا۔ یہ دونوں برخلاف شاعروں
 کے متشبیات کو نہیں لیتے بلکہ ہمیشہ عام شوق اختیار کرتے ہیں۔ یہ خاص خاص صورتیں و رنگ

8 مستثنی صورتوں پر شعر کی بنیاد رکھو کی مثال اسی ہے جسے ہومر کا یہ شعر ہے۔
 یعنی شاعر نے مشوق کے چند باریک بینیوں پر تمام نئی نئی متشبیاتیں بنائیں اور ان کے ساتھ ساتھ
 کو چھوڑ کر اپنے صاحب کے گرجے کی طرز بیان سے شاعر کا لطف طبع خود ثابت ہوا۔ لیکن اگرچہ شاعر نے یہ
 ایک جہم میں کہہ دیا ہے۔ لیکن ان کے کہنے میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے کہنے سے ان کے کہنے سے ان کے کہنے سے
 کیونکہ ہومر کے ہاں یہ تمام شوق اختیار کرتے ہیں۔ ایسا خاص خاص صورتیں و رنگ
 ہے اور اپنے اس سے زیادہ شاعر ہوتا ہے۔

متخیلہ کی دلیری اور بلند پروازی زیادہ تر اس وقت پڑھتی ہو جب کہ شاعر کے ذہن میں اس کو اپنی غذا یعنی حقائق و واقعات کا ذخیرہ جمینہ تصب و کسے نہیں ملتا جس طرح انسان بھوک کی شدت میں جب معمولی غذا نہیں پاتا تو مجبور بناس پتی سے اپنا دماغ بھر کر صحت کو خراب کر لیتا اور اگر یہ مہلک ہو جاتا ہے اس طرح جب قوت متخیلہ کو اسکی معتاد غذا نہیں ملتی تو وہ غیر معتاد غذا پر ماتھ ڈالتی ہے۔ خیالات و دوار کا جہیں صلیت کا نام و نشان نہیں ہوتا تراش کر تکلف انگو شعر کا لباس پہناتی ہے اور قوت مہینہ کو اپنے کام میں خلل انداز سمجھ کر اسکی طاعت سے باہر ہو جاتی ہے اور سخن کلر شاعر کو مہل گو۔ اور کوہ کنرین و کاہ برا و ردن کا مصداق بنا دیتی ہے۔

شاعر کے لیے چپ کلر خزانہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور قوت متخیلہ کے لیے اسکی اصلی غذا انکی کچھ کمی نہیں ہے پس بجائے اسکے کہ وہ گھر میں مٹھپ کر کاغذ کی پھول بنکھڑیاں بنائے اسکو چاہیے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں اور خود اپنی ذات میں قدرت حق کا تماشا دیکھے جہاں بھانت بھانت کے اصلی پھول اور بنکھڑیوں کے لازوال خزانے موجود ہیں۔ ورنہ انکی نسبت کہا جاتا جانتا قدرت کو ہے اک کھیل تو کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

یہاں تاں کن خاصیتوں کا بیان ہوا چنچے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچتا اب وہ خصوصیتیں بیان کرنی ہیں جو دنیا کے تمام مقبول شاعروں کے کلام

شعریں
پانچویں

میں عموماً پائی جاتی ہیں **میلٹن** نے انکو چنچے مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو جو ش سے بھر اہو اہو اور ا صلیت پر مبنی ہو۔ ایک یور وین محقق ان لفظوں کی شرح کرتا ہے۔ سادگی سے صرف لفظوں ہی کی سادگی مراد نہیں ہے۔ بلکہ

نہیں ہوتی *

الغرض شاعر کی ذات میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا تین صفت متحقق ہونے ضروری ہیں
ایک وہی یعنی تخیل یا معینش اور دوسری یعنی صحیفہ فطرت کے مطالعہ کی عادت اور

تیسری قوتِ مزہ کا کلام
کے پانچ

الفاظ پر قدرت *

اب تخیل کی نسبت اتنا جان لینا اور ضرور ہے کہ اسکو جہاں تک ممکن ہو عتدال
رکھنا اور طبیعت پر غالب ہونے دینا چاہیے کیونکہ جب اسکا غلبہ طبیعت پر زیادہ ہو جاتا ہے
اور وہ قوتِ مزہ کے قابو سے جو کہ اسکی روک ٹوک کرنے والی ہے باہر ہو جاتا ہے تو اسکی حالت
شاعر کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔ قوتِ تخیل ہمیشہ خلاقی اور بلند پروازی کی طرف مائل رہتی
مگر قوتِ مزہ اسکی پرواز کو محدود کرتی ہے اسکی خلاقی کی مراعہ ہوتی ہے اور اسکو ایک قدم بے
نہیں چلنے دیتی۔ قوتِ تخیل کیسی ہی ولیہ اور بلند پرواز ہو جب تک کہ وہ قوتِ مزہ کی محکوم ہو
شاعری کو اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بقدر اسکی پرواز بلند ہوگی اسقدر شاعری اعلیٰ درجہ
پہنچے گی۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں انہیں قوتِ تخیل کی بلند پروازی اور قوتِ مزہ
کی حکومت دونوں ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں۔ انکا تخیل نہ خیالات میں بے عتدالی کرنے پا تا ہے نہ الفاظ
میں کجروی دیکر دوسری صورت میں جبکہ تخیل قوتِ مزہ پر غالب آجائے شاعر کے لیے اسکی پرواز
ایسی ہی خطرناک ہے جیسے سوار کے لیے نہایت چالاک گھوڑا جبکہ سونہ میں لگام نہ ہو بہار دل ہونہا
شاعر دل کو اس قوت کی آزادی اور مطلق العنانی نے گمراہ کر دیا ہے اور بعض جو گمراہ ہو کر پھر راہ
سہت پر آئے ہیں وہ اسوقت تک نہیں آئے جب تک کہ قوتِ مزہ کو اسپر حکم نہیں بنایا تو

برس سے زیادہ نہیں۔ جتنا کثرت آج تک مدون نہیں ہوا۔ جسکی گہریر آج تک اطمینان کے قابل نہیں بنی۔ جسکے لائق مصنف اور شاعر انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ایسی زبان میں اگر اساتذہ کے پیچ پیکر کر لیا جائے تو ج طرح ابابیل کا گھوسلا تبدیل آفرینش سے ایک ہی حالت پر چلا آتا ہے اور اُسی حالت پر چلا جائے گا۔ ہی طرح اردو شاعری جس گوارہ میں اُسے آنکھیں کھولی ہیں اُسی گوارہ میں ہمیشہ جھومتی رہے گی۔

(اے بے با بن شریق کہتے ہیں کہ ”بعضوں کی رائے یہ ہے کہ ایک بار اساتذہ کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالکر اسکو صنفِ خاطر سے محو کر دینا چاہیے“ کیونکہ اُسکا بعینہ ذہن میں محفوظ رہنا وہی ترکیبوں اور سلوبوں کے استعمال کرنے سے ہمیشہ مانع ہوگا۔ لیکن جب وہ کلام صنفِ خاطر سے محو ہوگا تو بسبب اُس رنگ کے جو کلام بلحاظی سیر کرنے سے طبیعت پر خود بخود چڑھ گیا ہوگا۔ اُس میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ وہی ہی ترکیبیں اور سلوب جیسے کہ اساتذہ کے کلام میں واقع ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں خود بخود بغیر اس تصور کے کہ یہ ترکیبیں لاں ترکیب پر بنی ہے اور یہ سلوب لاں سلوب کا چربا ہے جیسی ضرورت پڑے گی بنانا چلا جائے گا۔“

ہمارے نزدیک یہ رائے نسبت پہلی رائے کے زیادہ وقعت کے قابل ہے۔ ہمیں اس فائدہ کے سوا جو صاحبِ رائے نے بیان کیا ہے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کا کلام جب تک صنفِ خاطر سے محو نہ ہو جائے طبیعت انھیں سلوبوں اور پیرایوں میں مقید اور محصور رہتی ہے جو اُنکے کلام کو بار بار پڑھنے اور یاد کرنے سے ہنرِ طبیعت ثانی کے ہو جاتے ہیں اور جسکے سبب سلسلہ بیان میں نئے سلوب اور نئے پیرائے ابداع کرنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوتا اور اسلئے فنِ شعر کو کچھ ترقی

بلبلے برگ گلے خوش رنگ و ستار و شست
و دندان برگ نوا خوش نالہ ماتے زار و شست
گفت مارا جسلوہ معشوق برابر کی روشت
گفتش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست
پس یہ کہنا کہ شاعری کا کمال محض الفاظ میں ہے معافی میں ہرگز نہیں کی طرح ٹھیک نہیں
سمجھا جاسکتا۔

ابن شریق کہتے ہیں کہ ”شاعر کو اعلا طبع بقہ کے شعر کا کلام یاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے شعر کی بنیاد اسی منوال پر رکھے۔ جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا اگر وہ محض طبیعت کی لہج سے کچھ لکھ بھی لے گا تو اس کو شعر نہیں بلکہ نظم یا ساقط از اعتبار یا کمال ہر کہیں گے۔ پس جب اس کا حافظہ بلحاظ کلام سے پُر ہو جائے اور ان کی روشنی فہم کی لہج پر نقش ہو جائے تب کر شعر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اب بقدر مشق زیادہ ہوگی اس بقدر کلا شاعری

علا طبع بقہ
شعر کی بنیاد
اوست

استحکم ہوگا۔ ابن شریق نے یہ ہایت خاص عربی زبان کی نسبت کی ہے شاید عربی زبان کے لئے یہ ہایت مناسب ہو کیونکہ وہاں ایک نعت دراز سے شاعری کا دور دورہ چلا آتا تھا۔ زبان میں برس سے زیادہ گذر چکے تھے کہ ہر عہد اور طبقہ میں ایک سے ایک بہتر و برتر شاعر نظر آتا تھا۔ زبان میں بے انتہا وسعت پیدا ہوئی تھی ہر طبقے کے ادا کرنے کے لئے صدیوں اسلوب و پیرایہ لٹریچر میں موجود تھے شاید وہاں یہ بات ممکن ہو کہ ہر طبقے کے ادا کرنے کے لئے قدامت کا اسلوب اختیار کیا جائے اور نئے اسلوب پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو لیکن ایک ایسی ناممکن بات جیسی کہ اردو ہے جس کی شاعری ابھی تک محض طفولیت کی حالت میں ہے۔ جس کے لٹریچر کی عمر اگر انصاف سے دیکھا جائے تو پچاس ساٹھ

مضمون کے لیے نئے نئے اسلوب بیان ڈھونڈھنے پڑی گئے جن کا مقبول ہونا نہایت مشتبہ اور نامقبول ہونا قرین قیاس ہے

اسکے سوا معنی کے متعلق ایک اور کمال حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو الفاظ سے بچہ تعلق نہیں صرف بچہ کا مطالعہ اور معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینا ہی شاعر کا کام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں ان کا انتخاب کرنا اور ان کی تصویر کھینچنا شاعر کا کام ہے۔ شاعر مثلاً نباتات اور پھول و پھل کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے کہ ایک محقق علم نباتات کا دیکھتا ہے۔ یا وہ ایک واقعہ تاریخی پر اس حیثیت سے نظر نہیں ڈالتا جس حیثیت سے کہ ایک مورخ نظر ڈالتا ہے۔ وہ ہر ایک شے میں سے صرف وہ خاصیتیں چن لیتا ہے جن پر قوت تخلیق کا عمل چل سکے اور جو عام نظروں سے مخفی ہوں جو طرح ایک نیار یا ریت میں سے چاندی کے ذرے نکال لیتا ہے جو کسی کو نہیں سوجھتے اس طرح شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ میں سے صرف ذوقیات لے لیتا ہے جنہیں اُسکے سوا کسی کا حصہ نہیں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے مثلاً سکندر کے مرنے کا حال اور اُسکے اخیر وقت کے واقعات مورخین نے جو کچھ لکھے ہوں سو لکھے ہوں مگر ایک رستہ شاعر اُن سے صرف نیت سچ نکالتا ہے کہ

سکندر کہ برعالمے حکم دہشت
در آن دم کہ بگذشت و عالم گدشت
میتربودش کز وعالمے
تساند و مہلت دہندش دے

یا فضل بہار میں بلبل ہزار دستان کے غیر معمولی چھپے دیکھ کر ایک خواص حیوانات کا متعلق اُسکے جو کچھ اسباب قرار دے سو دے مگر ایک متصوف شاعر اُسکے یہ معنی بتاتا ہے کہ

۵۰

و غیرہ کے پیالہ میں اُسکی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالہ میں کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے۔ مگر ہم انکی جناب میں عرض کرتے ہیں کہ حضرت اگر مانی کھاسی گال لایا جو بھل یا اڑھن ہوگا۔ یا ایسی حالت میں پلا یا جائیگا جبکہ اُسکی پیاس مطلق نہ ہو تو خواہ سونے یا چاندی کے پیالہ میں پلائے خواہ باور اور پھٹک کے پیالہ میں وہ ہرگز خوش گوار نہیں ہو سکتا اور ہرگز اُسکی قدر

برائے پاک لفظی شے بروز آرد کہ مرغ و ماہی باشند خستہ۔ او بیدار
 چاہے کہ کوئی نظم جسے کہ استقلال کے ساتھ جمہور کے دل پر اثر کیا ہو و خود طویل ہو و خواہ
 مختصر ایسی نہیں ہے جو بے تکلف لکھ کر پھینک دی گئی ہو جو بقدر کہ نظم میں زیادہ میاں خچی
 اور آواز معلوم ہو شیعہ قرار جاتا چاہیے کہ اسپر زیادہ محنت زیادہ غور اور زیادہ حاک و صلاح لگائی ہوگی
 ابن رشیق اپنی کتاب علم میں لکھتے ہیں کہ ”جب شعر سرانجام ہو جائے تو
 اسپر بار بار نظر دینی چاہیے اور جہاں تک ہو سکے اس میں خوب تصحیح و تہذیب کرنی چاہیے پھر
 بھی اگر شعر میں جودت اور خوبی پیدا نہ ہو تو اس کے دور کرنے میں پس پیش نہ کرنا چاہیے جیسا کہ اکثر
 شعرا کیا کرتے ہیں۔ انسان اپنے کلام پر ایسے کہ وہ اس کی مجازی اولاد ہوتی ہے منتوں اور فرنیست
 ہوتا ہے پس اگر اس کے دور کرنے میں مضائقہ کیا جائے گا تو ایک بڑے شعر کے سبب اس کا کلام
 بلاغت سے گر جائے گا۔“

ابن خلدون اسی الفاظ کی بحث کے متعلق کہتے ہیں کہ انشاء پر دانی کا ہر نظم
 میں ہو یا شعر میں محض الفاظ میں ہو۔ معانی میں ہرگز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع
 ہیں اور اصل الفاظ میں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ پس اُن کے لئے کہنی کے کتاب
 کرنے کی ضرورت نہیں ہو۔ اگر ضرورت ہو تو صرف اس بات کی ہے کہ اُن معانی کو کسطح الفاظ میں
 ادا کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ۔ اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی
 کو چاہو سونے کے پیالہ میں بھر لو۔ اور چاہو چاندی کے پیالہ میں اور چاہو کلچ یا بور یا سیپ کے
 پیالہ میں۔ اور چاہو مٹی کے پیالہ میں۔ پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی

الفاظ میں ہے نہ معانی میں
 انشاء پر دانی کا ہر نظم

اُن خیالات کو جو بدت سے انگور کے شہر کی طرح اُسکے ذہن میں پکے ہوئے تھے کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ وہ جھٹ پٹ بغیر غور و فکر کے سرخجام ہو گئے ہیں شعر میں وچیں ہوتی ہیں ایک خیال دوسرے الفاظ خیال تو ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پا جائے مگر اُسکے لئے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ یہ ممکن ہے کہ ایک متری مکان کا نہایت عمدہ اور نرالا نقشہ ذہن میں فوراً تجویز کر لے مگر یہ ممکن نہیں کہ اُس نقشہ پر مکان بھی ایک چشم زدن میں تیار ہو جائے سوزن اور قافیہ کی اوگٹ گھائی سے صحیح سلامت نکل جانا اور مناسب الفاظ کے تفحص سے عہدہ برابروں کو فی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ایک دن کام ایک گھنٹے میں کیا جائیگا تو وہ کام نہ ہوگا۔ بلکہ بیکار ہوگی۔

روما کے مشہور شاعر ورجیل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے شاعر لکھواتا تھا اور دن بھر اپنے غور کرتا تھا اور لکھ چھٹا تھا۔ اور یہ کہا کرتا تھا کہ کچھ بھی اسطرح اپنے بد صورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے۔ ایسے طو شاعر جس کے کلام میں شہور ہے کہ کمال بے ساختگی اور آماد معلوم ہوتی ہے۔ اُسکے سوا اب تک فیروز علامتہ اٹلی میں محفوظ ہیں اُن سوا دل کے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جو شاعر اُسکے نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں ملٹن بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نہایت سخت محنت اور جانفشانی سے نظم لکھی جاتی ہے اور نظم کی ایک ایک بیت میں اُسکے شامل ہونے سے پہلے کتنی ہی تبدیلیاں پے درپے کرنی پڑتی ہیں۔ ایک فارسی گو شاعر بھی فک و شعر کی حالت اسطرح بیان کرتا ہے۔

صورت اگرچہ شاعر سے متمیز ہو مگر معنی اُس بقدر پر پورے ادا کرنے جیسے کہ شعر میں ادا ہو سکتے شاعر بشرطیکہ شاعر ہو۔ اول تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے لفظ اُسکو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو طبع انسان کے وقت دیکھتا ہے اُسکو ضرور کاٹ پھانت کرنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعر مل کا کا نظم مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

آفاق اور مطلق

(اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ جو شعر شاعر کی زبان یا تسلیم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اُس شعر سے زیادہ لطیف اور بامزہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو پہلی صورت کا نام اُنھوں نے آمل رکھا ہے اور دوسری کا آورو بعضے اس موقع پر یہ مثال دیتے ہیں کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے وہ اُس شیرہ سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے جو انگور سے چھوڑ کر نکالا جائے۔ مگر ہم اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے اول تو یہ مثال جو اس موقع پر دیکھائی دیتی ہے اسی سے اُس رائے کے خلاف ثابت ہوتا ہے جو شیرہ انگور سے خود بخود اُسکے پک جانے کے بعد ٹپکتا ہے وہ یقیناً اُس شیرہ کی نسبت بہت دیر میں طیار ہوتا ہے جو کچے یا دھکچرے انگور سے چھوڑ کر نکالا جاتا ہے مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول۔ زیادہ لطیف۔ زیادہ بامزہ۔ زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر کسی موقع پر پاکیزہ خیالات جو اُسکے حافظہ میں پہلے سے ترتیب آمیز محفوظ ہوں مناسب الفاظ میں جو حسن اتفاق سے فی الفور اُسکے ذہن میں آجائیں اور اگر وہ لیکن اہل تو ایسے اتفاقات شاذ و نادر طور میں آتے ہیں۔ والہ اللہ العزیز و مددہ

پیدا کر سکتے ہیں انکو ایک ایک لفظ کی قدر قیمت معلوم ہوتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ
فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اُس کے اختیار کرنے یا ترک کر نیسے کیا

خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے نظم الفاظ میں گریباں برابر بھی کمی بچا جاتی ہے تو وہ فوراً سمجھ
جاتے ہیں کہ چارے شعر میں کونسی بات کی کسر ہے جس طرح ناقص سا بچے میں ڈھلی ہوئی خیر فرما

چھلی کھاتی ہے اس طرح اُن کے شعر میں اگر تاؤ بھاؤ بھی فرق بچا جاتا ہے محاذ اُن کی نظر میں کھٹک
جاتا ہے اگرچہ وزن اور تافیہ کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات

ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے مگر فرق
صرف بقدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اُسی لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل

جب تک زبان کے تمام کونین نہیں جھانک لیتا تب تک اُس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ شاعر کو
جب تک الفاظ پر کامل حکومت اور اُن کی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہ ہو ممکن

نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بلاست قناعت حکومت کر سکے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ
”شعر شاعر کے دماغ سے ہتھیار بند نہیں کو دیا۔ بلکہ خیال کی آہٹ الٹی ناہمواری سے لیکر انتہائی

وہنہیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب مہین کو شاید محسوس نہ ہوں
لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں۔“

اس بحث کے متعلق چند امور ہیں جنکو فک شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے
اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا۔ پھر انکو جانچنا اور تولنا۔ اور ادا

معنی کے لحاظ سے انہیں جو قصور بچائے اُسکو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منظم کرنا کہ

ایک نہایت محدود ذخیرہ ہے جنکو برتے برتے خود اسکا جی اکتا جائے گا اور سامعین کو سنتے سنتے نفرت ہو جائے گی جو شخص شعر کی ترتیب میں اصلیت کو ماتھے سے نہیں دیتا اور محض ہوا پر اپنی عمارت کی بنیاد نہیں رکھتا وہ اس بات پر فٹ رت رکھتا ہے کہ ایک مطلب کو جتنے اسلوبوں میں چاہے بیان کرے۔ اسکا تحلیل اس بقدر وسیع ہوگا جسقدر کہ اسکا مطالعہ وسیع ہے۔

کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ نقض کی شرائط کا ہے۔ اُن الفاظ کا ہے جنکے ذریعہ سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرنے میں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور سہم ہی جیسا کہ پہلا۔ شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر انکو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے۔ اور خیال کی تصویر ہو ہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اسکے اُس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو سحر کر لے۔ اس حلقہ کا طے کرنا جسقدر دشوار ہے۔ اُس بقدر ضروری بھی ہے کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہو تو اُسکے کہنے سے نہ کہنا ہوتا ہے۔ اگرچہ شاعر کے تخیل کو الفاظ کی ترتیب میں بھی ویسا ہی خدشہ جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں۔ لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا متبع اور نقض نہیں کرتا تو محض قوت تخیل کچھ کام نہیں آسکتی۔

جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعہ سے اپنے ہمجنسوں کے دل میں اثر

دنیا میں گزرے ہیں وہ کائنات یا فطرت انسانی کے مطالعہ میں ضرور مستغرق رہے ہیں جب رفتہ رفتہ اس مطالعہ کی عادت ہو جاتی ہے تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہو جاتا ہے اور مشاہدوں کے خزانے گنجینہ خیال میں خود بخود جمع ہونے لگتے ہیں +

سروالٹر سکوٹ جو انگلستان کا ایک مشہور شاعر ہے اُسکی نسبت لکھا ہے

سروالٹر سکوٹ کی شاعری

کہ اُسکی خاص خاص نظموں میں دو خاصیتیں ایسی ہیں جنکو سب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک اصلیت سے تجاوز نہ کرنا۔ دوسرے ایک ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا جہاں کہہ اُسے کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا کا بیان کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس موقع کی روح میں جو خاصیتیں تھیں سروالٹر نے وہ سب انتخاب کر لی تھیں سروالٹر کی نظم پڑھ کر آنکھوں کے سامنے بالکل وہی سماں بندھ جاتا ہے جو پہلے خود اُس موقع کے دیکھنے سے معلوم ہوا تھا۔ اور اب صیانت سے اُتر گیا تھا۔ ظاہر اُسے ان بیانات میں قوت تخیل پر ایسا بھروسہ نہیں کیا کہ اصلیت کو چھوڑ کر محض تخیل ہی پر قناعت کر لیتا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ روکھی کا قصہ لکھ رہا تھا ایک شخص نے اُسکو دیکھا کہ پاکٹ بک میں چھوٹے چھوٹے خود رو پھول پتے اور میوے جو وہاں لگ رہے تھے انکو نوٹ کر رہا ہے۔ ایک دوست نے اُس سے کہا کہ اس دردِ سر سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول کافی نہ تھے جو چھوٹے چھوٹے پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ سروالٹر نے کہا تمام کائنات میں نہ چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں جو بالکل یکساں ہوں۔ پس جو شخص محض اپنے تخیل پر بھروسہ کر کے مذکورہ بالا مطالعہ سے چشم پوشی یا غفلت کر گیا اُسکو بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ اُسکے دماغ میں چند معمولی تشبیہوں یا تمثیلوں کا

مختلف چیزوں سے متحد خاصیت اخذ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مرزا غالب

کہتے ہیں :-

ہوئے گل نالہ دل دو چرخ مچل جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا ✓

دوسری مثال

بگد ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمرہ کشت و میخ بقر

ناہید یعنی زہرہ کو سعد اور میخ کو بخش مانا گیا ہے پس دونوں باہتسار ذات اور صفات کے مختلف ہیں مگر شاعر کہتا ہے کہ ان کے سعادت و نحوست کے خلاف کو رہنے دو مجھ پر تو انکا اثر یکساں ہی ہوتا ہے میخ بقر سے قتل کرتا ہے تو زہرہ غمرہ سے +

اور تیسری مثال سے مختلف خاصیتیں استنباط کرنے کی مثال میر مننوں کا یہ شعری

تفاوت قامت یا رقیامت میں ہے کیا مننوں وہی فتنہ ہے لیکن یہاں فراسا پچے میں ڈھلتا ہے

یعنی قامت معشوق اور قیامت فتنہ ہونے میں تو دونوں متحد ہیں مگر فرق یہ ہے کہ فتنہ قیامت سا پچے میں ڈھلا ہوا نہیں ہے اور قامت معشوق سا پچے میں ڈھلا ہوا ہے +

غرض کہ یہ تمام باتیں جو اوپر ذکر کی گئیں ایسی ضروری ہیں کہ کوئی شاعر اُن سے استغنا کا

دعوے نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے بغیر قوت تخیل کو اپنی اصلی غذا جس سے وہ نشو و نما پاتی ہے نہیں پہنچتی بلکہ اُسکی طاقت ادھی سے بھی کم رہ جاتی ہے +

قوت تخیل کوئی شے بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتی بلکہ جو مصالح اُسکو خارج سے

ملتا ہے اُس میں وہ اپنا تصرف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے جتنے بڑے بڑے نامور شاعر

پھر معشوق حقیقی کو جسکی ذات بے نشان ہو بطور استعارہ کے غزالِ رعنا کے ساتھ تعبیر کرنا جس سے بہتر استعارہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اسکی طلب کو غزالِ رعنا کی مناسبت کو دہرایا میں پھر نئے تعبیر کرنا اور پھر باوجود ضمیر متصل کے جو کہ داؤدہ میں موجود تھی ضمیر مخاطب منفصل یعنی لفظ تو ضائدہ کرنا جس سے پایا جائے کہ تیرے سو اکوئی شے ہماری اس گشتگی کا باعث نہیں ہو اور چونکہ پیغام شکایت آمیز تھا اسلئے صبا سے یہ درخواست کرنی کہ لطیف بگو یعنی نرمی اور ادب سے پیغام دینا تاکہ شکایت ناگوار نہ گزرے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنہوں نے ایک معمولی بات کو ہمدرد بلند کر دیا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے باریک خیالات بھی اس سے زیادہ بلندی پر نہیں دکھائے جاسکتے۔

اگرچہ قوتِ تخیل احوال میں بھی جبکہ شاعر کی محسوسات کا دائرہ نہایت تنگ و محدود ہو اسی معمولی ذخیرہ سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ نسخہ کائنات اور ہمیں سے خاصہ نسخہ طرہ نہانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اُسکو پیش آتی ہیں انکو تعق کی نگاہ سے دیکھنا۔ جو امور مشاہدہ میں آئیں انکے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی۔ کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فنِ شق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے مستوحی اور مستوحی چیزوں سے مختلف غامضتیں فرما کر اخذ کر سکے اور اس ساریہ کو اپنی یاد کے خزانہ میں محفوظ رکھے۔

دوسری شرط کائنات کا مطالعہ

محفوظ رکھے۔

جدائی کا صدمہ نہ بتائے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعض غوشی سے وقفہ ایسی بشت ہو سکتی ہے کہ رنج اور غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے۔ اب معینین نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کی سطح اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اس وقت معشوق نہیں ہوتا۔ اور جب معشوق ہوتا ہے اس وقت تکلیف نہیں ہوتی۔ (اس مثال میں بھی معینین کا عمل معنی اور لفظ اور نوح بد رجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحبِ ذوق سلیم پر ظاہر ہے۔)

(۳) خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

صبا بلطف بگو آں غزالِ غنارا کہ سر بکوحہ و بیاباں تو دادہ مارا

اس شعر کا خلاصہ مطلب اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم صرف معشوق کی بدولت پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں بظاہر ہے کہ ہمیں معینین کا عمل خیالات میں اگر ہو بھی تو نہایت خفیف اور مختصر ہو گا مگر الفاظ میں اُسے وہ کرشمہ دکھایا ہے جسے شعر کو باعزت اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اسی قسم کے کلام کی نسبت کہا گیا ہے عبارتے کہ معنی برابر ہی اور اول تو صبا کی طرف خطاب کرنا جسمیں یہ اشارہ ہے کہ کوئی ذریعہ دوست تک پہنچا نہیں کا نظر نہیں آتا۔ ناچا صبا کو یہ سمجھ کر پیغام بربنایا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہو شاید دوست تک بھی اُس کا گذر ہو جائے گویا شوق نے ایسا از خود رفتہ کر دیا ہے کہ جو چیز پیغام بربنہ ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی اُس کے ماتہ پیغام بھیجتا ہے اور جواب کا اُمیدوار ہے

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ازاراں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے۔ اور جامِ شید ایک لسی چیز تھی جس کا بدل دُنیا میں موجود نہ تھا۔ اُسکو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جامِ سفال میں کوئی خوبی لسی نہیں ہے جبکہ وجہ سے وہ جامِ جمِ عیسیٰ چیز سے فائق اور اعلیٰ سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جامِ جم میں شراب پی جاتی تھی۔ اور مٹی کے کوزہ میں بھی شراب پی جاسکتی ہے اب قوتِ تخیل نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جامِ سفال کے آگے جامِ جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان ایک لغزبِ پیرایہ دیکر اس قابل کر دیا کہ زبان اُسکو پڑھ کر متلِ مذکور اور کان اُسکو سُن کر مخطوط اور دل اُسکو سمجھ کر متاثر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا ایجنیشن ہے۔ اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالمِ محسوسات میں قدم رکھا ہے اسکا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں ایجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بہتر تہِ غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمالِ سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے۔

(۲) غالب کا اسی زمین میں دوسرا شعر یہ ہے۔

اُنکے آنے سے جو آجاتی ہے رونقِ موند پر وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال چھپا ہے
شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت
بجال ہو جاتی ہے نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالتِ زار اور اُس کی

چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملک ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے طہری کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔

تخیل یا ایمجینیشن کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے جیسی کہ شعر کی تعریف مگر جن اُس کی ماہیت کا خیال ان لفظوں سے دل میں پیدا ہو سکتا ہے یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے دیتا ہوتا ہے یہ اُس کو کمر ترتیب بیکر ایک نئی صورت بخشی ہے اور پھر اُس کو الفاظ کے ایسے دکنش پر ایہ میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کس قدر الگ ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیل کا عمل اور تصرف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے۔ یہی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقہ بیان ایسا زالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصورات اور خیالات میں نصف کرتی ہے اور کبھی الفاظ و عبارات میں۔ اگرچہ اس قوت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا۔ بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے کہیں کم ہوتا ہے۔ اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے کہیں محض الفاظ میں۔ یہاں چند مثالیں بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) غالب دہلوی۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جامِ جسم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

کتاب حاصل نہیں ہو سکتا اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لئے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو وہ اُس کی کا تدارک اس ملکہ سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتابی ہر مجموعہ اُس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ اور ماضی و مستقبل کو اُس کے لئے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے کہ گویا اُس نے تمام وقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اُس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیے۔ اُس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری۔ عتقا اور آب جیوں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول و صاف کے ساتھ متصف کر سکتا ہے کہ انکی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے جو نتیجہ وہ نکالتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں میں طبق نہیں ہوتے لیکن جب ان اپنی معمولی حالت سے کس قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں مثلاً فیضی کتاب ہے۔

سخت سیاہی شب میں لخت ز شبنم کو کب میں

اس منطقی قاعدہ سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے زیادہ تاریک کیونکر ہو سکتی ہے اور تمام کو کب ایسے اجرام میں جنکا وجود بغیر روشنی کے تصور میں نہیں آ سکتا پھر ایک خاص کو کب ایسا مظلم اور سیاہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُس کو کالی رات کا ایک لمحہ کہا جاسکے۔ مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھانا

دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں +

۴۴، نظیری نیشاپوری۔

بہرِ شیلِ گلِ فخی گزینِ بلسل ۱ نو اگر ان نچرودہ گزندِ راجہ خبر

فضل بہار میں پھولوں کے کھلنے۔ یا ہوا میں اُمتال پیدا ہونے۔ یا بدن میں دورانِ خون کے تیز ہوجانے سے جو نشاط اور اُبتگِ نلیل کے دلیں پیدا ہوتی ہیں اور جبکو شعر اگل و گلش کے عشق سے تعبیر کرتے ہیں اور جبکہ جوش اور ولولہ میں وہ دن بھر چمکتا رہتا ہے۔ اُس حالت اور کیفیت کو شاعر نے فخی کے کاٹے کی لہر سے تعبیر کیا ہے۔ گو یہ تمثیل بھی اُس حالت کی اصل حقیقت ظاہر کرنے سے قاصر ہو۔ مگر جقدر کہ اُسی حالت کا تصور ان لفظوں کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اُتنا بھی تصویر یا ناک کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ گویا اس کیفیت کا ظاہر کرنا مصوری بُت ترشی اور ناک کی دسترس سے باہر چڑھتا ہے۔

اُمید ہے کہ ان مثالوں سے شاعر اور غیر شاعر کے کلام میں اور نیز شعر اور مصوٰی میں جو فرق ہے وہ بخوبی ظاہر ہو گیا ہو گا۔ اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے کونسی شرطیں ضروری ہیں اور شاعر میں وہ کونسی خاصیت ہے

جو اُسکو غیر شاعر سے تیز دیتی ہے +

۴۵، سب مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تیز دیتی ہے قوتِ تخیل۔ یا تخیل ہے۔ جبکو انگریزی میں مچینیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جقدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اُسیقدر اُسکی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ اور جقدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ اُسیقدر اُسکی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملک ہے جو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لیکر نکلتا ہے۔ اور جو

اس مضمون کو ایک غیر شاعر اس سے زیادہ بیان نہیں کر سکتا کہ خلقت بھونکی پیاسی مری ہو تھی یا اناج اور پانی نایاب تھا۔ یا اور ہی قسم کی معمولی باتیں جو قحط کے زمانہ میں عموماً پیش آتی ہیں لیکن تنہا سب سے سختی قحط کی تصویر جن لفظوں میں کہ سعدی نے کھینچی ہے ایسے معمولی بیانات سے ہرگز نہیں کچھ سکتی۔ اور چونکہ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو محسوس نہیں ہو سکتی۔ ایسے شاعر کے سوا اور بت تراش دو نو اسکی نقل اتارنے سے عاجز ہیں۔ البتہ ایکٹریا یا تاشا دکھانے سے کبھی قدر عمدہ برآ ہو سکتا ہے بشرطیکہ شاعر نے اُسکے لئے کافی الفاظ مہیا کر دیئے ہوں۔

(۳) ابن دلچ اندلسی ایک قصیدہ میں اپنے شیر خوار بچہ کی وہ حالت جبکہ وہ خود گھروالوں سے رخصت ہو کر کہیں دور جانے والا ہے اور بچہ اُسکے منہ کو تک رہا ہے۔ بیان کرتا ہے۔

عَیٌّ بِمَرْجُوعِ الْخَطَابِ وَالْخَطِّ بِمَوْقِعِ اهْوَاءِ النُّفُوسِ خَبِيرٌ

یعنی وہ بات کا جواب دینے سے تو عاجز ہے مگر اُسکی آنکھ اُن اداؤں سے واقف ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اس شعر میں استاد نے ایک محض وجدانی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے جو جسکی محاکات زمانہ حال کے مصوّر بت تراش اور ایکٹریا بھی بلاشبہہ کیس قدر کر سکتے ہیں لیکن نہ ایسی جیسی کہ شاعر نے کی ہے۔ نیز شاعر کے سوا کسی کو یہ اسلوب بیان ہرگز نہیں سوجھ سکتا کیونکہ جس مطلب کو اُس نے اس پیرائے میں بیان کیا ہے اُسکا حاصل صرف اس قدر ہے کہ رخصت ہوتے وقت جو وہ میری طرف دیکھتا تھا اُسپر بے اختیار پیارا آتا تھا اس معمولی بات کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ جسکے منہ میں بول تک نہ تھا اُسکی آنکھ ایک ایسے بھید سے واقف تھی جس سے اکثر بڑے بڑے عاقل اور دانشمند واقف نہیں ہوتے یعنی یہ کہ کس طرح اوروں کے

خواہ نظم میں ہو اور خواہ نثر میں " مذکورہ بالا تقریروں کا مطلب زیادہ دلنشین کرنے کے لیے ہم اس مقام پر چند مثالیں ذکر کرنی مناسب سمجھتے ہیں :

(۱) فردوسی کہتا ہے۔

بمالید چاچی کماں را بدست بدچرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کر و چپ را و خم کر و رست خروش از خم چرخ چاچی بنامت

ان دونو شعروں میں رستم کی وہ حالت دکھائی ہے جبکہ وہ شکبوس کشانی سے لڑنے کے لیے پیادہ میدان کا رزار میں گیا ہو اور سپہر وار کرنے کے لیے کمان میں تیر چڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان شعروں کے مضمون کو اگر ایک غیر شاعر معمولی طور پر بیان کرتا تو صرف اس قدر کہنا کافی تھا کہ رستم نے کمان کے چمک میں تیر چڑا لیکن اس بیان میں اُس حالت کی جبکہ وہ تیر چلانے کے لیے کمان تانے کھڑا تھا نقل مطلق نہیں پائی جاتی البتہ جو اسلوب فردوسی نے اُس کے بیان میں اختیار کیا ہے اُنہیں جہاں تک کہ الفاظ مسامت کر سکتے تھے اُس حالت کی کافی طور پر نقل اتاری گئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسی حالت ہے جو آنکھ سے محسوس ہو سکتی ہے اس لیے اسکو ایک بت تراش یا ایک مصور فردوسی کی نسبت زیادہ واضح اور زیادہ نمودار صورت میں ظاہر کر سکتا ہے :

(۲) سعدی شیرازی :

چہاں قوط سناے شد اندر دمشق کہ یاراں نہ راموش کردند عشق

اس شعر میں دمشق کے کسی قوط کا وہ عالم بیان کیا ہے جو وہاں کے باشندوں پر طاری تھا

جیسا ماسٹم اور چھینی کے کام دیکھ کر ہمارے خیال میں اُترتا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان وسیع
 اس قدر ہی کہ بت ترشی۔ مصوری اور نائٹک یہ تینوں فن اسکی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش
 قطعاً صورت کی نقل اُتار سکتا ہے۔ مصو صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور نائٹک
 کرنے والا شطیبہ شاعر نے اس کے لئے الفاظ مہیا کر دیئے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت
 بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجود دیکھ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے
 سکتی ہے اسکو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی
 قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے نہ بت ترشی کی اور نہ نائٹک کی۔ مصوری اور نائٹک
 وغیرہ انسان کے فضائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں جب قدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے
 ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ اور صورت اور نظر فریب نمونے ان کیفیات کے ہوتے ہیں
 جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں۔ مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقت سلوین
 کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے
 خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات۔ دولت کے انقلابات۔ سیرت انسانی
 معاشرت نوع انسانی۔ تمام چیزیں جو فی الحقیقہ موجود ہیں۔ اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف
 اشیاء کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جاسکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور
 ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جسکی قلمرو اس قدر وسیع ہے جب قدر خیال کی قلمرو۔

ایک اور محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ جو خیال ایک نئے معمولی اور زلزلے طو
 پر لفظوں کے ذریعہ سے اسے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اسکو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے

کہ لباس کو زیادہ خوشنما بنانے کے لیے انکی ایسی قطع رکھی جائے جس سے لباس کی علت غائی یعنی آسائش اور پردہ دونوں فوت ہو جائیں۔ (الغرض وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دار و مدار ہے اور جنکے سوا اُس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جسکے سبب شعر پر شعر کا اطلاق کیا جاسکے یہ دونوں شعر کی ماہیت سے خارج ہیں۔ ایسی لیے زمانہ حال کے محقق شعرا مقابل جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے شعر کو نہیں ٹھیراتے بلکہ علم و حکمت کو ٹھیراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جسطرح حکمت کا کام براہِ رست یہ ہے کہ ہر کدے پر ہر کدے سے تحقیقات میں مدد پہنچائے اور حقائق کو روشن کیے عام اس سے کہ کوئی اُس سے محظوظ یا استعجب یا متاثر ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح شعر کا کام براہِ رست یہ ہے کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کر دے عام اس سے کہ حکمت کا کوئی مقصد اُس سے حاصل ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ نظم میں ہو یا شریں) *

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو انکے تمام افراد کو جامع اور مانع ہو و دخل غیر سے۔ بہتہ لارڈ مکالمی نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گوانک و شعر کی تعریف نہیں کہا جاسکتا لیکن جو کچھ شعر سے آجکل مراد لی جاتی ہے انکے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے وہ کہتے ہیں کہ "شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتباراً سے مصوری بہت تراشی اور نازک سے مشابہ ہے مگر مصور بہت تراش اور نازک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کی قدر کا ل ترہتی ہے۔ شاعر کی کل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرنزوں سے۔ اور الفاظ ایسی چیزیں کہ اگر ہو مہر اور ڈھنڈی جیسے صنایع بھی انکو استعمال کریں تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صبح اور شیک نقشہ نہیں اُتار سکتے

لکھا ہے کہ یونانیوں کے ہاں قافیہ بھی (مثل وزن کے) ضروری نہ تھا اور چشموئی نام ایک
 پارسی گو شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے ایک کتاب میں اشعار غیر متقفے جمع کیے ہیں۔ یورپ میں بھی آج
 کل بلینیکا ورس یعنی غیر متقفے نظم کا بہ نسبت متقفے کے زیادہ رواج ہے۔ اگرچہ قافیہ بھی
 وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے جس سے کہ سکانتنا کانوں کو نہایت خوشگوار معلوم
 ہوتا ہے اور اُس کے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے۔ مگر قافیہ اور خاصکر ایسا جیسا
 کہ شعراے عجم نے اُسکو نہایت سخت قیدوں سے جکڑ کر دیا ہے اور پھر اُس پر ردیف
 اضافہ فرمائی ہے۔ شاعر کو بلاشبہ اُس کے فرائض ادا کرنے سے باز رکھتا ہے جب طرح صنائع
 لفظی کی پابندی معنی کا خون کر دیتی ہے اس طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ قافیہ کی قید ادا
 مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شاعر کو بجائے اُس کے کہ اول اپنے ذہن میں ایک خیال کو ترتیب
 دیکر اُس کے لئے الفاظ میا کرے سب سے پہلے قافیہ تجویز کرنا پڑتا ہے اور پھر اُس کے مناسب کوئی
 خیال ترتیب دیکر اُس کے ادا کرتے کے لئے ایسے الفاظ میا کیے جاتے ہیں جن کا سبب اخیر جبر
 قافیہ مجوزہ قرار پائے کیونکہ اگر ایسا نہ کرے تو ممکن ہے کہ خیال کی ترتیب کے بعد کوئی مناسب
 قافیہ ہم نہ پہنچے اور اُس خیال سے دست بردار ہونا پڑے۔ پس درحقیقت شاعر خود کو کوئی خیال
 نہیں باندھتا بلکہ قافیہ جن خیال کے باندھنے کی اُسے اجازت دیتا ہے اُسکو باندھ دیتا ہے
 اکثر غزل اور قصیدہ میں اول اخیر مصرع جمیں قافیہ ہوتا ہے اندھا دھند کسی نہ کسی مضمون کا
 گھڑ لیا جاتا ہے اور پھر اُس کے مناسب پہلا مصرع اُس پر لگایا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ شعر کو زیادہ خوش
 بنانے کے لئے اُس میں ایک ایسی قید لگانی جس سے شعری مہلیت باقی نہ رہے بعینہ ایسی بات

استعمال میں آتے ہیں ایک شعر اور دوسرا نظم اور جملہ ان کے ماں وزن کی شرط پوٹری کے لئے نہیں بلکہ وزن کے لئے ہی۔ اس طرح ہمارے ماں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی چاہیے۔

قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے ہی حسی سمجھتے تھے۔ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی موثر اور دلکش تقریر کرتا تھا۔ اُسی کو شاعر جانتے تھے جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے جربتہ اور دلاویز فقرے اور مثلین پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب قریش نے قرآن مجید کی نزالی اور عجیب عبارت سنی تو جنہوں نے اُسکو کلام الہی نہ مانا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہنے لگے۔ حالانکہ قرآن شریف میں وزن کا طلق التزام نہ تھا۔ محقق طوسی اس لائق قباس میں لکھتے ہیں کہ عبری اور سریانی اور قدیم فارسی میں شعر کے لئے وزن حقیقی ضرور نہ تھا۔ سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ وزن سے شعر کی خوبی اور اُسکی تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے یورپ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ اگرچہ وزن پر شعر کا انحصار نہیں ہے اور ابتدا میں وہ مدتوں اس زیور سے محفل رہا ہے مگر وزن سے بلاشبہ اسکا اثر زیادہ تیز اور اسکا متثر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے۔

قافیہ بھی ہمارے ماں شعر کے لئے ایسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے جیسے کہ وزن مگر حقیقت وہ بھی نظم ہی کے لئے ضروری ہے نہ شعر کے لئے۔ اساس میں

انھیں نہیں بدستور جمی رہتی ہیں *

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تصانیف

سردو میں شاعری کے لیے فی زمانہ
کس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے۔

سے لوگ دوہرتے چلے آئے ہیں اور اس سے کہتا ہے کہ اب بلند تر ہے۔

مذکور کے لیے من فرمایا گیا ہے۔

قوم کی زمین میں کچھ آل باقی ہے تو تخم اکارت نہ جائے گا۔

شعر و شاعری

گو لڑ سمجھنے نے جب اول ہی اول اپنے ملک کے قدیم شاعروں کا مسلک متکی بنیاد
جھوٹ اور مبالغہ اور ہوا و ہوس کے مضامین پر تھی چھوڑ کر سچی نیچرل شاعری اختیار کی تو
اسکو یہی مشکلات پیش آئی تھیں۔ چنانچہ اس نے اس حالت کو ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ انہیں اپنی
نئی روش کی نظم کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے۔ ”اے میری پیاری نظم تو ان موقعوں سے
پہلی بھاگنے والی نظم ہے۔ جہاں نفسانی خواہشوں کی طغیانی ہوتی ہے۔ تو اس بے قدری
کے زمانہ میں بجائے اسکے کہ دلوں کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل کرے۔ ہر جگہ ملامت
کیجاتی ہے۔ تیری بدولت عام جلسوں میں مجھ کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب تنہا
ہوتا ہوں تو تجھے فخر کرتا ہوں۔ تو کمال کے طالبوں کی رہنما ہے۔ اور نیکی کی دایہ پس خدا
ہی تیرا نگہبان ہوگا۔ دنیا کے کسی حصہ میں خواہ وہ ٹور ٹوک کی چوٹیاں ہوں یا پیمپار کا کالیٹی
اور خواہ وہ خط استوا کا نہایت گرم خطہ ہو یا قطب کا منجمد کرنے والا جاڑا۔ جہاں کہیں تجھے
نغمہ چینی ہو تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھکڑوں پر غالب آئیو۔ اور اپنے
دروناک نالوں سے سچ کی مدد کیجیو۔ جسکو لوگ حقیر جانتے ہیں۔ تو گمراہوں کو دولت کی تجارت
کرنی سکھا۔ اور انکو اس بات کا یقین دلا کہ جو لوگ اپنے قدرتی ذریعوں پر بھروسہ کرتے ہیں
اگرچہ وہ مفلس ہوں لیکن خوشحال ہو سکتے ہیں۔ مگر جو ترقی تجارت سے ملک میں ہوتی ہو

8 نور نور وہ ہیں روس کے شمال مغرب میں ایک پہاڑ ہے ۱۲
۹ پیمپار کا جنوبی امریکا میں شہر کینٹو دار الحکومت ملک ایجوئیڈز کے پاس ایک پہاڑ ہے۔

اور اُسکے تمام حوصلوں سے عبور کر کے منزل مقصود تک پہنچنا ہی نہایت کٹھن اور دشوار کام ہی دوسری شکل اس سے بھی زیادہ سخت یہ ہے کہ موجودہ سوسائٹی کا مذاق چونکہ اس نئی روش ہی بالکل بیگانہ ہوتا ہے اسلئے نہ کوئی اُسکی مشکلات کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ کہیں اُسکی محنت کی داوِ دل سکتی ہے۔ پس کوئی شخص جیسا کہ زمانہ کی قدروانی سے بالکل دست بردار ہو کر اُس دہقان کی مانند جڑیں عمیق میں مگر نی کی پود اپنی زمین میں لگائے محض ایک اُمیدِ مبہوم پر آئندہ نسلوں کی ضیافتِ طبع کا منصوبہ نہ باندھے اس کو چہ میں ہرگز قدم نہیں رکھ سکتا۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نئی روش پر چلنے والا شاعر کوئی مضمون زمانہ کی ضرورت اور مقتضائے حال کے موافق شعر کے لباس میں جلوہ گر کر کے ملک کے جذبات پسند لوگوں میں کچھ شہرت یا قبولیت حاصل کر لے اور ایک خاص حیثیت سے اُسکے کلام کی داد توقع سے زیادہ اُسکو مل جائے۔ مگر شاعری کی حیثیت سے نہ تو فی الواقع وہ اُسکے کلام کی داد ہوتی ہے اور نہ وہ اُسکو داد سمجھتا ہے۔ بلکہ ایسی دادوں کو چپکے ہی چپکے اپنے دل میں پیشِ سرِ ٹھہراتا ہے۔

بحرِ آلودہ دستِ دینغ غازی ماندہ بے تھیں تو اول زیبِ اسپ و زینتِ برگستواں بینی شعر ہے مہمصر کچھ توقدیم شاعری کے تعصب اور زیادہ ترجیحیت اور بیگانگی مذاق کے سبب اُسکی روش کو اس محبت سے کہ وہ شاعر عام سے الگ ہے تسلیم نہیں کرتے۔ اور بعض اپنے نزدیک اُسکی بیچ بیچ سطحِ فوٹے ہیں کہ فلاں شخص نے شاعری نہیں کی بلکہ مفید اور چہ لاتنی مضامین لکھ کر اپنے لئے زادِ آخرت جمع کیا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الواقع موجودہ نسل کی قدر شناسی سے قطع نظر کر چکا ہے تو اُسکو ایسی باتوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ اگر

کلام سے کی گئی ہو۔ پس جو شخص ملکی زبان کی ڈکٹری لکھنے بیٹھا ہو اسکو سب سے پہلے شعر کے دیوان ٹھونکنے پڑتے ہیں۔ پھر جب شاعری چند مضامین میں محدود ہو جاتی ہے۔ اور اسکا مدار محض قلم کی تقلید پر آ رہتا ہے تو زبان بجائے اسکے کہ اسکا دائرہ زیادہ وسیع ہو وہ اپنی قدیم وسعت بھی کھو بیٹھتی ہے۔ زبان کا وہ اصل قلیل حصہ جسکے ذریعہ سے شاعر اپنے چند معمولی مضامین ادا کرتا ہے۔ زیادہ تر وہی مانوس اور صریح گنا جاتا ہے۔ اور باقی الفاظ و محاورات غریب و وحشی خیال کیے جاتے ہیں۔ پس سو اسکے کہ کچھ اُن میں سے اہل زبان کی بول چال میں کام آئیں یا لٹ کی کتابوں میں بند پڑے رہیں۔ اور کچھ ایک مدت کے بعد متروک الاستعمال ہو جائیں اور کسی مصرف میں نہیں آتے۔ نہ مصنفوں کو تحریر میں اور نہ قضا کو تقریر میں اُن سے کچھ مدد نہیں پہنچتی۔ قدامی تقلید کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں میں بضرورت شعرا اُنھوں نے تصرف کیا ہے اُنکے سوا کسی لفظ میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ جو محاورے جس پہلو پر وہ برت گئے ہیں وہ دوسرے پہلو پر ہرگز نہیں برتے جاسکتے جو تشبیہیں اُنکے کلام میں پائی گئی ہیں اُن سے سرو متجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ الغرض کسی ملک کی شاعری کو اُنکے لٹریچر کے ساتھ وہی نسبت ہو جو قلب کو جسد کے ساتھ کہ اِذَا صَلَّمْ صَلَّمْ الْجَسَدُ كُلَّهُ ۱؎ وَاِذَا فَنَدَ فَنَدَ الْجَسَدُ كُلَّهُ ۲؎

جب فن شعرا محال کو پہنچ جاتا ہے تو اُنکی اصلاح قریب ناممکن کے ہو جاتی ہے۔ اول تو شعر اکوف دیکم الف و عادت کے سبب اس بات کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ جس راہ پر وہ جا رہے ہیں اسکے سوا کوئی اور بھی رستہ ہی۔ اور اگر بالفرض کسی نے قوم کا شاعر عام چھوڑ کر دوسری راہ اختیار بھی کی تو اسکو دو نہایت سخت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اول تو طریق غیر مسلوک میں قدم رکھنا

جاتی ہے اور ادھر جھوٹی اور بے سرو پا باتیں وزن و قافیہ کے دلکش سپر ایو میں سُنتے سُنتے سوسائٹی کے مذاق میں زیر ہر گھٹتا جاتا ہے۔ حقائق و واقعات سے لوگوں کو روز بروز مناسبت کم ہوتی جاتی ہے۔ عجیب غریب باتوں۔ سوپر نیچرل کہانیوں اور محال خیالات سے دلوں کو انشراح ہونے لگتا ہے۔ تانیخ کے مسید جو سادے و قانع سُنتے سے جی گھبرانے لگتے ہیں جھوٹے قصے اور افسانے حقائق و حقیقت سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ تانیخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی اور سائنس طے طبیعتیں بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ اور چکے ہی چکے مگر نہایت استحکام کے ساتھ خلاق و نیمہ سوسائٹی میں جڑ پکڑتے جلتے ہیں۔ اور جب جھوٹ کے ساتھ ہزل و تخریت بھی شاعری کے قوام میں دخل ہو جاتی ہے تو قومی حشلاق کو بالکل گھن لگ جاتا ہے۔

سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اُسکے محدود ہو جانے سے ملک کو پہنچتا ہے وہ اُسکے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔ جب جھوٹ اور مبالغہ عام شاعر کا شعار ہو جاتا ہے تو اُسکا اثر مصنفوں کی تحریر اور فصاحت کی تقریر اور خواص ہل نلک کے روزمرہ اور بول چال تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کا نمایاں اور برگزیدہ حصہ وہی الفاظ و محاورات اور ترکیبیں سمجھی جاتی ہیں جو شعر کے استعمال میں آ جاتے ہیں۔ پس جو شخص ملکی زبان کی تحریر یا تقریر یا روزمرہ میں مٹی یا زحائل کرنا چاہتا ہے اُسکو بالضرور شعر کی زبان کا اتبلع کرنا پڑتا ہے۔ اور اُس طرح مبالغہ لٹریچر اور زبان کی رگ پے میں سرائیت کر جاتا ہے جو شاعر کی ہزل گوئی سے زبان میں کثرت سے نامہذب اور مخش الفاظ دخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ لغات میں وہی الفاظ مستند اور نکسالی سمجھے جاتے ہیں جن کی توثیق و تصدیق شعر کے

بڑی شاعری سے لٹریچر اور زبان کا نقصان پہنچتا ہے

پچھلوں نے جب آنکھیں کھول کر بزرگوں کے ترکہ میں رجمہ قصائد اور عشقیہ غزلوں اور
 مثنویوں اور اباجی و ہرلیات کے سوا اور سامان بہت کم دیکھا تو انھوں نے شاعری کو
 انہیں چند مضمونوں میں منحصر سمجھا۔ لیکن ان مضمونوں میں بھی جبکہ چڑیاں بھیت چگ
 گئیں اب کیا دھڑا تھا۔ تعریف اگر سچی ہو اور عشق اصلی تو شاعر کے لیے میٹریل کی کچھ کمی نہیں
 جس طرح کائنات میں دو چیزیں یکساں نہیں پائی جاتیں اسی طرح ایک انسان کے محاسن دوسرے کے
 محاسن اور ایک کے دل کی واردات دوسرے کی واردات سے نہیں ملتی۔ لیکن جب تو دوسرا
 جھوٹی اور عشق محض تقلیدی ہو تو شعر کو ہمیشہ وہی باتیں جو اگلے لکھ گئے ہیں دوبہرانی پڑتی ہیں
 اب جو پچھلوں نے اگلوں کی تقلید کرنی شروع کی تو نہ صرف مضامین میں بلکہ خیالات

نثر اور اقتضائے
 کلامی اور
 شاعری

شاعری کی تقلید

میں۔ الفاظ میں۔ تراکیب میں۔ اسالیب میں۔ تشبیہات میں۔ استعارات میں۔ بھیر میں۔ قافیہ
 میں۔ ردیف میں۔ غرض کہ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز میں انکے قدم بہ قدم چلنا اختیار کیا
 پھر جب ایک ہی لکیر پیٹتے پیٹتے اجیرن ہو گئی تو نہایت بھونڈے اختراع ہونے لگے۔ جن پر یہ
 مثل صادق آتی ہے کہ خشک باگندہ بروزہ اگر چہ گندہ لیکن ایجاد بندہ ۰

اگرچہ شاعری کو بہت دیر سے سوسائٹی کا مذاق ناسد بجاڑا ہے۔ مگر شاعری جب بگڑ
 جاتی ہے تو اسکی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ جب جھوٹی
 شاعری کا رواج تمام قوم میں ہو جاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغہ سے سب کے کان مانوس
 ہو جاتے ہیں۔ جس شعر میں زیادہ جھوٹ یا نہایت مبالغہ ہوتا ہے اسکی شاعر کو زیادہ داد ملتی
 ہی۔ وہ مبالغہ میں اور غلو کرتا ہے تاکہ اور زیادہ داد ملے۔ اور اسکی طبیعت اتنی سے دور ہوتی

بڑی شاعری سے
 نقصان پہنچتا ہے

اور معصروں کی سچی تعریفیں اور انکے مرنے پر مرثیے لکھتے تھے۔ اپنی گذشتہ واقعی تکلیفیں اور خوشیاں بیان کرتے تھے۔ اپنے خاندان اور قبیلہ کی شجاعت اور سخاوت وغیرہ پر فخر کرتے تھے۔ سفر کی محنتیں اور مشقتیں جو خود اپنے گزرتی تھیں بیان کرتے تھے عالم سفر کے مقامات اور مواضع۔ شہر اور قریے۔ ندیاں اور چشمے سب نام بنام۔ اور جو بڑی یا بھلی کیفیاتیں وہاں پیش آتی تھیں انکو موثر طریقہ میں ادا کرتے تھے۔ بیوی اور بچوں یا دوستوں سے وداع ہونے کی حالت دکھاتے تھے۔ اس طرح تمام نیچرل جذبات جو ایک جو شیلے شاعر کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں سب انکے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ دربار کے تعلق اور خوشامد نے وہ سرچھوڑ دیں سب بند کر دیں اور شعرا کے لیے عام طور پر صرف دو میدان باقی رہ گئے جنہیں وہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھا سکتے تھے۔ ایک مدحیہ مضامین جنسے ممدوح کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ دوسرے عشقیہ مضامین جنسے انکے نفسانی جذبات کو مشتعل کرنے کی ہمت تھی۔ پھر جب ایک ٹٹ کے بعد دونوں مضمونوں میں چھوڑی ہوتی ہڈی کی طرح کچھ مزا باقی نہ رہا اور سلاطین و امرا کی مجالس گرم کرنے کے لیے اور یہ بھن کی ضرورت ہوئی تو مطاببات موصوحات و اماجی و نہر لیاات کا دفتر کھلا۔ بہت سے شاعروں نے سب چھوڑ چھا کر یہی کوچہ اختیار کر لیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ رنگ تمام سومانہی پر چڑھ گیا۔ اگرچہ ابتدا سے اختیر تک ہر طبقہ اور ہر عہد کے شعرا میں کم و بیش ایسے وجہ تعظیم لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کی شاعری پر سلمان فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن شارع عام پر زیادہ ترویجی لوگ نظر آتے ہیں جو پچھلوں کے لیے شاعری کا میدان نہایت تنگ کر گئے۔ یا انکے لیے بہت بڑے نمونے چھوڑ گئے ہیں۔

اُسکے کلام سے اُسکی دہریت پر اور کبھی غمزدل و تشیع پر استدلال کیا گیا۔ اور ساتھ ہزاریت کی
 مثنوی جسکا صمد فی بیت ایک مثال طلاق قرار پایا تھا اُسکے جلد میں سوائے محرومی و ناکامی کے
 اُسکو کچھ نہ ملا۔ مگر فی الحقیقت جیسی کہ اُسنے اپنے کلام کی داد پائی ہے۔ شاید ہی کسی شاعر کو ایسی
 داد ملی ہو۔ اُسکے شاہنامہ نے تمام دنیا کے دلوں کو مسح کر لیا۔ اور بڑے بڑے مسلم اُشبوت
 اُستاد اُسکی فصاحت کا لوہا مان گئے اور اسکا سبب اور کچھ نہ تھا سوائے اُسکے کہ سوسائٹی یا ادبا
 کا دباؤ اُسکی آزاد طبیعت پر غالب نہیں آیا۔

صدرِ سلام کی شاعری میں جب تک کہ غلامانہ تعلق اور غمناک اندیش نہیں رہا نہیں پائی
 تمام سچے جوش اور رولے موجود تھے۔ جو لوگ بیچ کے مستحق ہوتے تھے اُنکی بیچ اور جودم کے
 مستحق ہوتے تھے اُن کی مذمت کی جاتی تھی۔ جب کوئی منصف اور نیک خلیفہ یا وزیر موجد
 تھا اُسکے دردناک مرثیے لکھے جاتے تھے۔ اور ظالموں کی مذمت اُنکی زندگی میں کی جاتی تھی۔ خلفاء
 سلاطین کی مہمت اور فتوحات میں جو بڑے بڑے واقعات پیش آتے تھے۔ اُنکا قصائد میں
 ذکر کیا جاتا تھا۔ اجاب کی صحبتیں جو انقلاب رفرگارسے برہم ہو جاتی تھیں اُنپر دردناک اشعار
 لکھے جاتے تھے۔ پارسا بیویاں شوہروں کے اور شوہر بیویوں کے فراق میں درد انگیز شعر اُتار کتے
 تھے چراگا ہوں۔ چٹھوں۔ اور وادیوں کی گزشتہ صحبتوں اور جگہوں کی ہو بہو تصویر کھینچتے
 تھے۔ اپنی اوٹنیوں کی جفاکشی اور تیز رفتاری۔ گھوڑوں کی رفاقت اور وفاداری کا بیان کرتے
 تھے۔ بڑھاپے کی مصیبتیں۔ جوانی کے عیش۔ اور بچپن کی بے فکریاں ذکر کرتے تھے۔ اپنے
 بچوں کی جدائی اور اُنکے دیکھنے کی آرزو و حالتِ غربت میں لکھتے تھے۔ اہل وطن کی دوستوں کی

مہمدی نے اُسکو دربار میں ہلا کر یہ شعر اُس سے پڑھوایا اور نہایت بے غزنی کے ساتھ دربار
نکلا دیا۔ لکھا ہے کہ جعفر برملی کے سوا پھر کسی ایسے یا غلیفہ نے اُسکو صلہ نہیں دیا۔ جہاں
قصیدہ کہہ کر لیجا تا وہاں سے یہ جواب ملا۔ فیاضی تو معن کے ساتھ گئی جعفر برملی جکا ایک نا
اور خاص کر شاعر مہول حسان تھے۔ اُسکے مرثیے لکھنے پر بہت سے شاعر ماروں کے حکم سے قتل
کیے گئے رقاشی نے اکثر شعرا کے قتل کے بعد غنیہ ایک مرثیہ لکھا تھا اُسکے اخیر میں کہتا ہے

اَمَّا وَاللّٰهُ لَوْ لَا خَوْفٌ وَّ اِشِيں وَعَيْنٌ لِلْخَلِيفَةِ لَا تَنَامُ
لَطَفْنَا حَوْلَ قَبْرِكَ وَاسْتَلَمْنَا كَمَا لِلنَّاسِ بِالْحَجَرِ اسْتَلَامُ

ترجمہ۔ واللہ اگر غماز کا اور غلیفہ کی چشم بیدار کا خوف نہ ہوتا تو ہم تیری قبر کے گرد طواف
کرتے۔ اور بوسہ دیتے جیسے کہ لوگ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں +

ایسے مائیں اگر کوئی مستغنی مزاج اور آزاد طبع شاعر دربار کی رضا جوئی کا خیال نہیں کرتا
تو اُسکو ایسے ہی شرے بھگتے پڑتے ہیں جیسے کہ فردوسی کو بھگتے پڑے۔ فردوسی ایک
آزاد منش اور قانع آدمی تھا۔ باوجودیکہ حسن مہمدی وزیر سلطان محمود کو اُسکے
فاتحہ یا ضرر پہنچانے میں بہت بڑا دخل تھا مگر وہ اُسکو بلکہ خود سلطان کو کچھ غلط نہیں لاتا تھا۔
جب حسن مہمدی کی مخالفت کا حال اُسکو معلوم ہوا۔ تو اُس نے یہ دو شعر لکھے تھے۔

مَنْ بَنْدَہ کَز مَبَادِی فُطْرَتِ بَنْدِوَدَہ ام مَالِ بے مال ہرگز۔ طامح بے جاہ نیز
سُوئے در وزیر چر المفت شوم چوں فاعنم ز بارگہ پادشاہ نیز

اُسکی آزادی اور رست گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کے مزاج کو اُس سے متغیر کر دیا گیا کبھی

حسن مہمدی نے
اُسکو قصیدہ پڑھا ہے۔

اور پناہ چاہی۔ اُسے بسر و چشم قبول کیا ایشی نے کہا تو نے مجھے جن واپس سے پناہ دی؟ علمقہ نے کہا ہاں۔ ایشی نے کہا اور موت سے؟ وہ بولا یہ تو امکان سے خارج ہے۔ ایشی واپس ناراض ہو کر عامر بن لطفیل کے ہاں چلا گیا اُسے دونو باتوں کی نامی بھری۔ ایشی نے کہا سو سے کیونکر پناہ دی؟ کہا میری پناہ میں تجھے موت آجائے گی تو تیرا خون بہا تیرے وارثوں کو کچھ بچھوگا ایشی بہت خوش ہوا۔ اور اُسکی بیچ میں قصیدہ کہا اور علمقہ کی ہجو لکھی +

عرب کے سوا اور ملکوں میں بھی شعر کی قدردانی کا ایسا ہی حال رہا ہے۔ قومی سلطنتوں میں جہاں بادشاہ حاکم علی الاطلاق نہیں ہوتا۔ اپنی قدردانیوں سے شاعری بے انتہا ترقی پاتی ہے۔ شاعر جب تک تمام قوم میں مقبول نہیں ٹھہرتا۔ سلطنت سے کسی کچھ تقویت اور امداد نہیں ہوتی اور قوم میں وہی شاعر مقبول ہو سکتا ہے جو شاعری کے فرائض بغیر اُمید و بیم کے نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ نہ اُسکو سلطنت کی دستگیری کی کچھ پروا اور نہ بادشاہ کے موخندہ کا کچھ خوف ہو۔ لیکن خود مختار سلطنتوں میں شاعر کو ہر حال میں برابر کی رضا جوئی کا لحاظ رکھنا اور آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یہاں تک کہ اُسکے سچے جوش اور ولولے جگے بغیر شعر کو ایک قالب بے روح سمجھنا چاہیے۔ سب فتنہ خاں میں سمجھتے ہیں۔ نہ وہ اپنے دل کی آہنگ سے کسی کی وجہ کر سکتا ہے۔ نہ سچے جوش سے کسی کی ہجو لکھ سکتا ہے۔ مروان بن ابی حفصہ جو کہ خلیفہ مہمدی کے زمانہ میں مشہور شاعر تھے اُسے معن بن زائدہ کے مرثیہ میں حکمی شجاعت اور سخاوت ضرب لاش تھی یہ شعر لکھ دیا تھا۔

وَقَدْ ذَهَبَ النَّوَالُ فَلَا نَوَالَا
وَقُلْنَا اَيْنَ نَرْجِعُ بَعْدَ مَعْنٍ

شعر گوئی کی تحریک کرنے والا تھا۔ کیونکہ صلہ و انعام کا لالچ صرف انھیں لوگوں کو ہوتا تھا بھینر
 اسکی جستجاء تھی۔ لیکن واہ واسنے کی خواہش میں بادشاہ اور امیر اور غریب سب برابر تھے
 ان دونوں سببوں سے مسلمانوں کی شاعری کو دو طرف سے صدمہ پہنچا جب صلہ اور انعام مستحق
 اور غیر مستحق دونوں کو برابر ملنے لگے اور تحمیل کی غریبوں کی بوجھاو محل اور بے محل ہر درجہ کے شعر پر
 ہونے لگی تو جو لوگ فی الحقیقت صلہ و تحمیل کے مستحق تھے انکے دل چُھ گئے اور شاعری کی
 اعلیٰ لیاقتیں جو ان کی طبیعت میں ولایت تھیں وہ خریداروں کی بے تیرنی کے سبب
 جیسی چاہتے ظاہر ہونے پائیں۔ اور جو مستحق نہ تھے انکے دل بڑھے اور انکو قوم میں اپنی بسانہ
 پھیلانے اور شاعری پر ظلم کرنے کا موقع ملا۔

شعر گوئی کی تحریک کرنے والا تھا۔

شعر کی قدر تمام دنیا میں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے سلطنتوں نے ہمیشہ انکی قدر
 کی ہے اور قوموں نے انکے دل بڑھائے ہیں عرب میں شاعر قوم کی آبرو سمجھا جاتا تھا
 جب کسی قبیلہ میں کوئی شخص شاعری میں ممتاز ہوتا تھا تو اوقبیلوں کے لوگ اس قبیلہ کو
 اگر مبارک باد دیتے تھے اور سب ملکر خوشیاں کرتے تھے قبیلہ کی عورتیں اپنے بیاہ کے زیور
 پہن پہن کر آتی تھیں اور خیر و اشعار گاتی تھیں کہ ہم میں ایسا شخص پیدا ہوا جو تمام قبیلہ کی
 ناک رکھنے والا۔ انکے نسب اور زبان کی حفاظت کرنے والا۔ اور انکے کارنامے نمایاں اخلاف
 اعقاب تک پہنچانے والا ہے۔ شعر کی نازبرداری یہاں تک کیجاتی تھی کہ اگر وہ کوئی محال سوال
 کو بیٹھتا تو بھی صراحتہ اسکو رد نہ کیا جاتا تھا۔ ایک بار عشتیٰ بہت سال دسباب لیے بلایا
 بنی عامر میں جو کر گذرا۔ اور ہنزوں کے خوف سے اثنائے راہ میں علقمہ بن علاثمہ کے ہاں ٹھہر گیا

ماں بے شک ہوتا ہے۔ لیکن جیب یہ تانبار (یعنی جھوٹ) شعر کے طلا سے مٹا کیا جاتا ہے تو ہمنگب زبر خالص ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن جھوٹ کی بُرائی پر غالب آ جاتا ہے۔ اس بات کو سب نے پسند کیا اور بحث ختم ہو گئی۔

اس حکایت سے علاوہ اس بات کے کہ صاحب ابن عباد کے زمانہ یعنی چوتھی صدی ہجری میں ہماری شاعری محض ایک ذریعہ سلاطین و امرا کے تقرب کا سمجھی جاتی تھی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ شعر کے ذاتیات میں داخل ہو گیا تھا۔

یورپ کا ایک مورخ عربی لٹریچر کے ذکر میں لکھتا ہے کہ صرف عرب کی قوم میں اتنے شاعر ہوئے ہیں کہ تمام جہان کی قوموں کے شاعر شمار میں انکے برابر نہیں ہو سکتے۔ ظاہر اُسے عرب کی قوم کے شعرا سے صرف عربی زبان کے شاعر مراد لیے ہیں۔ اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر عربی کے ساتھ فارسی، ترکی، پشتو اور اردو کو بھی جو کہ خاص مسلمانوں کی زبانیں ہیں شامل کر لیا جائے تو مسلمان شاعروں کی تعداد کین حد تک پہنچ جائے گی۔ اور اگر بالفرض عرب کی قوم سے مطلقاً مسلمان شاعر مراد ہوں تو بھی تمام جہان کی قوموں کے شعرا سے انکی تعداد کا زیادہ ہونا کچھ کم تعجب خیز نہیں۔

بظاہر اس کثرت کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک شج و ستایش پر مروج کی طرف سے صلہ و نعام ملنے کا رواج جسکی وجہ سے ہر موزوں طبع کو عام اس سے کہ وہ شاعر بننے کے لائق ہو یا نہ ہو شاعری اختیار کر لیا خیال ہوتا تھا۔ دوسرے ہر درجہ کے شعرا پر سامعین کی طرف سے جاوید بجا تحسین و آفریں ہونے کا دستور۔ اور یہ پھیلا سبب پہلے سے بھی نیا

مسلمان شاعر کی کثرت

تکثر کا سبب

ہونے کو ہوتا ہے اور سلاطین و اُمراء میں وہ خوبیاں جکے سبب سے جمہور انام کے شکر و سپاس
 و ستائش کے مستحق اور شہر کی مداحی سے مستغنی ہوں باقی نہیں رہتیں تو انکو شاعروں کی
 بھٹتی کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں سمجھتی جسکو سن کر انکا نفس موٹا ہو۔ لہذا انکو شعر کی زیادہ
 قدر کرنی پڑتی ہے اس سے بھوٹی شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ پھر بہت سے نا شاعر جب
 شاعروں کو گراں بہا صلے اور خلعت و انعام برابر پاتے دیکھتے ہیں تو انکو بتکلف اپنے تئیں شاعر بنانا
 پڑتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی طبیعت میں شاعرانہ جدت و اختراع کا مادہ نہیں ہوتا وہ اصلی شاعروں
 کی نہایت بھونڈی تقلید کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسطرح بڑھاپے کی تصویر بچپن کی تصویر سے
 کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ جسطرح رفتہ رفتہ شعر کی صورت گویا مسخ ہو جاتی ہے۔ اور شاعری کا
 حاصل ہوا اسکے کہ اس سے قرب سلطانی حاصل ہوتا ہے اور کچھ نہیں رہتا۔

مرزا محمد طاہر نصر آبادی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک روز رات کے وقت
 صاحب ابن عباد طالقانی کی مجلس میں حسب معمول فضلا اور شعرا جمع تھے۔
 اثنائے سخن میں شعر کا ذکر چھپڑ گیا۔ بعضے شعر کی تعریف کرتے تھے۔ بعضے مذمت۔ جو لوگ مذمت
 کرتے تھے انھوں نے کہا کہ شعر اکثر مریج یا ذمہ پتعل ہوتا ہے اور دونوں چیزوں کی بنیاد جھوٹ پر ہے
 اسکے بعد ابو محمد خازن نے جو بہت بڑا صاحب علم و فضل تھا شعر کی تائید میں یہ کہا کہ شعر میں سب سے
 بڑی خوبی یہ ہے کہ ہم باوجودیکہ ہر علم و ہر ہر مہر مند ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز ہماری
 کامیابی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی صرف شعری ایسی چیز ہے جسکے ذریعہ سے ہم سلاطین و وزرا
 کے ہاں تقرب کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی یہ بات کہ شعر میں اکثر جھوٹ اور مبالغہ زیادہ ہوتا ہے

نہایت کیا خیال تھا۔
 جو مسمی چری میں شعر کی

وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے شغفانی صفائے نیت کی نسبت جو کہا گیا ہے کہ اُسے علم کو شاعری نے
 اور شاعری کو جو گوئی نے برباد کیا۔ اس کا منشا وہی سوسائٹی کا دباؤ تھا۔ اور عجب بیدار کاکی نے
 جو علم فضل سے دست بردار ہو کر نرل گوئی اختیار کیا کی یہ وہی زمانہ کا اقتضا تھا جب طبع خوشا
 اور نذر جھپٹ کا چنار اُرفتہ رفتہ ایک متدین اور سربازِ نیت کی نیت میں غلطو الدینا ہے اس طرح
 دربار کی واہ و اوصلہ کی چاٹ ایک آزاد خیال اور جذبی شاعر کو چپکے ہی چپکے بھٹی۔ بھوٹ
 اور خوشامدیا نرل و تسخر سپاس لڑاؤ لیتی ہے کہ وہ اُس کو کمال شاعری سمجھنے لگتا ہے +
 خود مختار بادشاہ جیسا کہ کوئی ہاتھ روکنے والا نہیں ہوتا مادہ تمام بیت المال جیب
 خنچ ہوتا ہے انکی بے دریغ بخشی شہر کی آزادی کے حق میں تمام قائل ہوتی ہے وہ شاعر جب کہ قوم کا سرتاج
 اور سرمایہ افتخار ہونا چاہتے تھا۔ ایک بندہ ہوا وہ ہوس کے دروازہ پر دروازہ گروں کی طرح صدا لگاتا
 اور شہنشاہِ عالم کہتا ہوا ہنچتا ہے۔ اول اہل حج و سیاحت میں حج سے اہل قطع نظر نہیں کیجاتی۔ کیونکہ
 قومی عروج کی آہٹ میں ہوس کے مستحق ہوتے ہیں اور شاعر کی طبیعت سے آزادی کا
 جو ہر وضع وائل نہیں ہو جاتا لیکن جب واقعات نہر جاتے ہیں اور حج سرائی کی گنت ہیشہ کے لیے
 شاعر کے ذمہ لگ جاتی ہے تو اُسکی شاعری کا مادہ صرف جھوٹی تہمتیں باندھنے پر رہ جاتا ہے۔ پھر
 جب قاتلِ قبال کا دورہ جسکی عظیمیتی شخصی سلطنتوں میں اکثر سو برس سے زیادہ نہیں ہوتی ختم
 عید زاکانی قزوینی ایک شہر نرل شاعر ہے۔ شخص اقسام علوم میں ماہر تھا اپنے ایک کتابِ فہرست میں کہی تھی اور کہا
 لیکر شاہ ابوسعاق انجو کے ہاں گزرنے کے لیے شیراز گیا تھا جب بادشاہ کے دربار میں جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ
 سخروں میں مشغول ہے کسی سے ملنے کی فرصت نہیں جب بیدنے کہا کہ سوئی سے تقرب بادشاہی حاصل ہو سکتا ہے تو علم
 حاصل کرنا فائدہ مند ہے۔ اسی روز سے نرل گوئی اختیار کیا اور اسی شہر ہو گیا +

کر سکتی ہے۔ قومی فتنہ ساز۔ قومی عزت۔ عہد و پیمان کی پابندی۔ بے دھڑک اپنے تمام غم پرے کر کے
 استقلال کے ساتھ سختیوں کو بروقت کرنا۔ اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل
 نہ ہو سکیں۔ اور اسی قسم کی وہ تمام فضیلتیں جنکے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اٹھتی
 ہو اور جنکے نہ ہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے اگر کسی
 قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلاشبہ انکی بنیاد تو اُسیں شعر ہی کی
 بدولت پڑتی ہے۔ اگر فساد اطوار اپنے خیالی کانٹیشنش سے شاعروں کو جلا وطن کر دینے
 میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ہرگز اخلاق پر احسان نہ کرتا۔ بلکہ اُسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک سرد و سرد
 خود غرض۔ اور مروت سے دور ایسی سوسائٹی قائم ہو جاتی جسکا کوئی کام اور کوئی کوشش بدون
 موقع اور مصلحت کے محض دل کے دلولہ اور جوش سے نہ ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ تمام دنیا شعر کا ادب
 اور تعظیم کرتی ہے۔ جنہوں نے اُس خاتم سلیمانی کی بدولت جو قوت متخیلہ نے اُنکے قبضہ میں دے دی
 انسان میں ایسی تحریک اور برنگینگی پیدا کی ہے جو کہ خود بخود بے یاسیگی کی طرف لیجانے والی ہے۔
 مگر باوجود ان تمام باتوں کے جو کہ شعر کی تائید میں کی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ سوسائٹی
 کے دباؤ یا زمانہ کے نقصان سے شعر پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ وہ بجائے اسکے
 کہ قومی اخلاق کی اصلاح کرے اُسکے بگاڑنے اور برباد کرنے کا ایک زبردست آلہ بن جائے
 قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات۔ اُسکی رہیں۔ اُسکی عادتیں۔ اُسکی غیبتیں۔ اُس کا
 میلان اور مذاق بدلتا ہے اُس قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی
 ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو کچھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ

شاعری سوسائٹی کی تائید ہے

شاعری کا فن و فنکار

شعر سے جسطرح نفسانی جذبات کو اشتعالک ہوتی ہے سبطج روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں۔ اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا

صبر و تعلق ہے جسکے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اسکو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ اسی بنا پر صوفیت کرام کے ایک عظیم القدر سلسلہ میں سماع کو جبکا جزو عظم اور رکن رکین شعر ہے وسیلہ قرب الہی اور باعث تصفیہ نفس و تزکیہ باطن مانا گیا ہے *

لنہ

یورپ کا ایک محقق کہتا ہے کہ شافل دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوتیں سوجاتی ہیں شعر اُنکو جگاتا ہے۔ اور ہمارے بچپن کے اُن خالص اور پاک جذبات کو جو لوٹ غرض کے دماغ سے متروک و مہربہ رہتے پھر تروتازہ کرتا ہے۔ دنیوی کاموں کی مشق اور عمارت سے بیشک فہن میں تیزی آجاتی ہے۔ مگر دل بالکل مڑ جاتا ہے جبکہ ہنسلاں میں قوت لایموت کے لئے یا تو نگہری میں جاہ و منصب کے لئے کوشش کی جاتی ہے اور دنیا میں چاروں طرف خود غرضی دیکھی جاتی ہے اس وقت انسان کو سخت شکلیں پیش آتیں اگر اُسکے پاس کوئی ایسا علاج نہو تا جو دل کے بہلانے اور تروتازہ کرنے میں چپکے ہی چپکے مگر نہایت قوت کے ساتھ ہنسلاں کی صورت میں مہرجم اور تو نگہری کی صورت میں تریاق کا کام دے سکے۔ یہ خاصیت خدا نے شعر میں ودیعت کی ہے جو بہکومحسوسات کے دائرہ سے نکال کر گذشتہ اور آئندہ حالتوں کو ہماری موجودہ حالت پر غالب کر دیتا ہے۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ سے اخلاق پر ہوتا ہے پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب

سمجھے قبول کرنا نہیں چاہتے جو لوگ اس سلسلے کے برخلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ علم کی ترقی سے
 الفاظ کے معنی محدود اور بہت سی باتوں کی واقعیت کے خیال محو ہو گئے ہیں۔ مگر زبانیں پہلے کی نسبت
 زیادہ سچ کہہ رہی ہیں اور اکثر مقاصد کے بیان کر نیچے زیادہ لائق ہوتی جاتی ہیں۔ بہت سی تشبیہیں بلاشبہ
 اس زمانہ میں بیکار ہو گئی ہیں مگر ذہن نئی تشبیہیں اختراع کر رہے عاجز نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ سائنس
 اور مینیکاس جو شیلے خیالات کو مردہ کرنے والے ہیں۔ لیکن انھیں کی بدولت شاعر کے لئے
 نئی نئی تشبیہات اور تشبیہات کا لازوال ذخیرہ جو پہلے موجود نہ تھا مہیا ہو گیا ہے اور ہوتا جانا ہی
 وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ سوسائٹی کے ترقی کرنے سے یہ پختہ شدن کی طاقت ضعیف
 ہو جاتی ہے بلکہ ان کا قول ہے کہ جب تک انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ ابد کے ساتھ ہمارا رشتہ مضبوط
 جب تک ہمارے بابائے رموانہ جنکا انکار نہیں ہو سکتا چاروں طرف سے ہمو گھیرے ہوئے ہیں۔
 عشق انسان کے دل چکر اٹھتا ہے اور ہر فرد بشر کی روداد زندگی کو ایک دھچپ قصہ بنا سکتا
 ہے۔ جب تک قوموں میں حب وطن کا جوش موجود ہے۔ جب تک بنی نوع۔ انسانی ہمدردی پر
 متفق ہو کر شامل ہونے کے لئے حاضر ہیں اور جب تک حوادث اور واقعات جو زندگی میں وقتاً بعد
 وقتاً حادث ہوتے ہیں خوشی یا غم کی سلسلہ جنمبانی کرتے ہیں تب تک اس بات کا خوف نہیں
 ہو سکتا کہ تخیل کی طاقت کم ہو جائے گی۔ اور اس سے بھی کم خوف جب تک کہ نیچر کی کالجی ہوئی
 ہو اس بات کا ہے کہ شاعر کا ذخیرہ بڑھ جائے گا۔ مگر یہیں شک نہیں کہ نیچر کی جو نمایاں چیزیں
 وہ اگلے مزدوروں نے چن لیں اور چونکہ اُنکے لئے وہ پہلی تھیں اور اسیلئے عجیب تھیں۔ اب اُنکے
 تعجب انگیز بیان پر کوئی سبقت نہیں لیجا سکتا۔

بیان کیجائے تو اُس سے کہیں خوف اور کہیں تعجب اور کہیں جوش خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انھیں چیزوں پر شاعری کی بنیاد ہی لیکن جب شائستگی زیادہ پھیلتی ہی تو یہ چشمے بند ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کہیں بند نہیں ہوتے تو انکو نہایت احتیاط کے ساتھ روکا جاتا ہے تاکہ اُن کا نہ اُڑے۔

اس رے کا ایک بڑا حامی یہ کہتا ہے کہ شعر دل پر دیسا ہی پردہ ڈالتا ہے جیسا میجک کینٹرن آئٹھ پر ڈالتی ہے جس طرح اس لٹین کا تماشا بالکل اندھیرے کمرے میں پورے کمال کو پہنچتا ہے ہی طرح شعر محض تاریک زمانہ میں اپنا پورا اثر دکھاتا ہے۔ اور طرح روشنی کے آتے ہی میجک کینٹرن کی تمام نمایاں نالود ہو جاتی ہیں ای طرح جوں جوں حقیقت کی حدود والہ صاف اور روشن اور احتمالات کے پرے مرتفع ہوتے جاتے ہیں اُس قدر شاعری کے سیاسی جلو کا فور ہوتے جاتے ہیں کیونکہ دیوتا ناقض چیزیں یعنی حقیقت اور دھوکا جمع نہیں ہو سکتیں۔

اس مطلب کے زیادہ دلنشین ہونے کے لیے ذیل کی مثال پر غور کرنی چاہیے فردوسی نے اپنے ہیر و رستم کی زور بندی اور بہادری کے متعلق جو کچھ شاہنامہ میں لکھا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اُس کو سکر رستم کی غیر معمولی عظمت اور بڑائی کا یقین دل میں پیدا ہوتا تھا۔ اُس کے زور اور شجاعت کا حال سُن کر تعجب کیا جاتا تھا۔ سامعین کے دلیں خود بخود اُس کے ساتھ ہمدردی اور اُس کے حرفیوں سے برخلافی کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اب جب قدر کہ علم بڑھتا جاتا ہے روز بروز وہ طلسم ٹوٹتا جاتا ہے اور وہ زمانہ قریب آتا ہے کہ رستم ایک معمولی آدمی سے زیادہ نہ سمجھا جائیگا۔

فردوسی کی مثال

شاعر کی زندگی

اگرچہ یہ راجو شاعری کی نسبت اوپر بیان ہوئی کیسے صحیح ہے مگر اسکو بھی بے سوچے

میٹھنے کی تاب نہ لا کر سیبا کا نہ باہر نکلائی۔ اور شیخ کی حضور میں جھک کر آداب بجالائی۔ اور عرض کی کہ لونڈی کو حکم ہو تو کچھ گاتے میرا صاحب چونکہ سماع کے عاشق تھے خاموش ہو رہے باقی نے اُن کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر یہ رباعی نہایت سوز و گداز کی نئی میں گانی شروع کی۔

شیخ نے فاحشہ گفتا۔ سستی کز خیر گستی و ہر شر پیوستی

زن گفت چنانکہ میسما یم ہستم تو نیز چنانکہ میسمائی بہتی ؟

شیخ کی حالت اس محفل رباعی کے سننے سے ہستی غیر ہو گئی کہ بانی کو اپنی جہالت سے سخت نادم ہونا پڑا۔ باوجودیکہ نور بانی کو خاموش کر دیا گیا تھا شیخ کی شور و شر کی سطح کم نہ ہوتی تھی۔ وہ زمین پر مریخ کی طرح لوٹتے تھے اور دیواروں میں سر دے دے مارتے تھے۔ دیر تک یہی حال رہا اور بہت مشکل سے ہوش میں آئے۔

بہر حال شعر اگر اصلیت سے بالکل تجا و ز اور محض بے بنیاد باتوں پر مبنی نہ ہو تو تاثیر اور دلنشینی اس کی نیچر میں داخل ہے۔ لیکن شاعری کی نسبت جو آپس زمانہ حال کے اکثر محققین نے قائم کی ہیں اس کا جھکاؤ اوسط ف پایا جاتا ہے کہ سویلر لٹین کا اثر شعر پر بڑا ہوتا ہے۔

شاعر کی تاثیر کا یہ اثر ہے کہ شاعر کی

جس قدر کہ علم زیادہ محقق ہوتا جاتا ہے۔ ہدیہ تخیل جیسے شاعری کی بنیاد پر گھٹتا جاتا ہے اور گڑبڑ کی عادت جو ترقی علم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ شعر کے حق میں ستم قائل ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک سوسائٹی نیم شایستہ اور اسکا علم اور واقفیت محدود رہتی ہے اور علل اسباب پر اطلاع کم ہوتی ہے اس وقت تک زندگی خود ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کی سرگزشت جو کہ بالکل ایک واقعات کا سلسلہ ہوتا ہے اگر ایک نیم شایستہ سوسائٹی میں سیدھے سادے طور پر بھی

کہ کیسے طبع امیر کو بخارا کی طرف مراجعت کرنے کی ترغیب دے۔ رودکی نے ایک قصیدہ لکھا اور جب وقت
بادشاہ شراب اور لاک رنگ میں مخمور ہوا تھا اُسکے سامنے پڑھا۔ اس قصیدہ نے امیر کے دل پر
ایسا اثر کیا کہ جی جانی محفل چھوڑ کر اُس وقت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بغیر منورہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع
لشکر کے بخارا کو روانہ ہو گیا۔ اور دس کوس پر جا کر پہلی منزل کی ۴

شاید اس قبیل کے واقعات ایشیائی شاعری میں کم دستیاب ہوں۔ لیکن ایسی حکایتیں
بیشمار ہیں کہ شعر کسی مناسب موقع پر پڑھا یا گایا گیا۔ اور سامعین کے دل قابو سے باہر ہو گئے۔ اور
صحت کا رنگ و لہر گوں ہو گیا۔ اس موقع پر ایک حکایت نقل کی جاتی ہے ۴

نور بانی گائے جس نے اپنے حسن و جمال خوش آوازی۔ بذالہ سخی۔ اور مصاحبت کی عمدہ نیت
کے سبب محمد شاہ کے تقرب کا درجہ حاصل کیا تھا۔ اور جو تمام امراے دربار کے دلوں پر قابض تھے
ایک روز نواب روشن الدود کہ کے ہاں بیٹھی تھی اور منہ ہی چل کی باتیں ہو رہی تھیں کہ تنے میں غالباً
میراں سید بھیک صاحب کی سواری جس نے نواب کو کمال عقیدت تھی آ پہنچی۔ نواب نے فوراً بانی کو
دوسرے کمرے میں بٹھا کر آگے سے چلن چھڑوا دی۔ میراں صاحب آئے اور اتفاق سے
بہت دیر تک بیٹھے۔ بانی جو ایک نہایت چلبلی اور بے چین طبیعت کی عورت تھی تنہائی میں زیادہ

نور بانی گائے جس نے اپنے حسن و جمال خوش آوازی۔ بذالہ سخی۔ اور مصاحبت کی عمدہ نیت

8 اس قصیدہ کے اول کے چند شعرے ہیں ۴

یاد جوئے ملیاں آید ہے	ہوئے یاد ہر سداں آید ہے
پائے مارا پڑیاں آید ہے	ریگے سوئے ورشتہ ہلے آید ہے
شنگ مارا کامیاں آید ہے	آبی حین و شکر فہلے آید ہے
شاہ سوت ہر سداں آید ہے	اسے بخارا شاد و شاد آید ہے
او سوئے آسمان آید ہے	شاہ نامت و بجا آسمان آید ہے
مرو سوئے بوستان آید ہے	شاہ سوت و بخارا بوستان آید ہے

ایک در بنی مازن کی مجلس میں بیٹھا تھا اور شراب پی رکھی تھی کہ محروم مازنی کے ایک حبشی غلام نے کچھ اشعار ایک عورت کی تشبیہ کے جو کہ بنی زبید میں سے تھی گائے۔ عبد اللہ نے اٹھ کر زور سے اُسکے منہ پر طماچہ مارا۔ غلام چپ لایا۔ بنی مازن نے غیظ و غضب میں اگر عبد اللہ کو مار ڈالا۔ پھر عمر و بن عبد یکر ب کے پاس جو کہ عبد اللہ کا بھائی تھا جا کر عذر کیا کہ تمھارے بھائی کو ہم میں سے ایک نادان آدمی نے جوش میں مدبوش تھا مار ڈالا ہے۔ سو ہم تم سے عفو کے خواستگار ہیں اور خون ہا جس قدر چاہو دینے کو تیار ہیں۔ عمر و خوبہا لینے پر آمادہ ہو گیا۔ جب بھائی کی آمادگی کا حال کُنبشہ بنت سعد یکر ب کو معلوم ہوا تو اُسے نہایت ملامت آمیز اشعار کہے جنہیں عمر و کو نفقہ نہ لینے پر سخت غیرت دلائی ہے۔ آخر عمر و بہن کی ملامت سے متاثر ہو کر نفقہ لینے کو کھڑا ہو گیا۔ اور مازنیوں سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لے کر چھوڑا۔

ایران کے مشہور شاعر رودکی کا قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حسین مسلمانوں نے جب خراسان کو فتح کیا اور ہرات کی فرحت بخش آب ہوا اُسکو پسند آیا تو اُسے وہیں مقام کر اور بخارا جو کہ سامانیوں کا اصلی تخت گاہ تھا اُسکے دل سے فراموش ہو گیا۔ لشکر کے سردار اور اعیان ان جو بخارا میں عالی شان عمارتیں اور عمدہ باغات رکھتے تھے ہرات میں رہنے لگے اور اہل ہرات بھی سپاہ کے زیادہ ٹھہرنے سے گھبرا اٹھے۔ رہنے اُستاد ابو الحسن رودکی سے یہ درخواست کی

دعویٰ کے کلام کی تائید

إِلَى قَوْمِهِ لَا تَعْقِلُوا الْعَمْرُومِي
وَأَتْرَكْتُمْ فِي بَيْتِ بَصْعَدَةَ مَظْلُومِي
وَهَلْ بَلَنْ عَمْرٍ وَطَيْرُ شَرِّهِ لَطْفُومِي
فَمَسَحُوا بِأَلَانِ أَعْمَامِ اللَّصْنَمِي
إِذَا زُرْتُمْ لَمْ تَعْقِلُوا عَمْرٍ مِّنَ الدَّهْمِي

۸ کہنے کے شاعر ہیں۔ اَرْسَلْ عَبْدُ اللَّهِ إِذْ عَانَ يَوْمَهُ
وَلَا تَلَحُّذًا مِّنْهُمْ إِذَا لَا وَابِدَهُ
وَدَعَا عَنْكَ عَمْرٍ اَلْزَمَ عَمْرٍ وَمَسْلَمِي
فَإِنْ أَنْتُمْ لَمْ تَسْأَلُوا وَانْتَدَبْتُمْ
وَلَا تَرُدُّوهُ إِلَّا فَضُولَ نِسَاءِ كَمَرِي

افنی کے کلام کی تائید

عرب کا مشہور شاعر میمون بن قیس جو کونا بیسنا ہونے کے سبب اعشی کہتے تھے اُسکے کلام میں یہ تاثیر ضربِ ابل تھی کہ جسکی طرح کرتا ہے وہ عزیز و نیک نام اور جسکی جھوکتا ہے وہ بلیں رسوا ہو جاتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اُسکے پاس آئی اور یہ کہہ کر میری لڑکیاں بہت ہیں اور کہیں اُنکو بڑ نہیں لٹا۔ اگر تو چاہے تو لوگوں کو شعر کے ذریعہ سے ہمارے خاندان کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اعشی نے اُسکی لڑکیوں کے حسن و جمال و خصائل پسندیدہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ جسکی بدولت اُن لڑکیوں کی صورت اور سیرت کا چرچا تمام ملک میں پھیل گیا اور چاروں طرف سے اُنکے پیغام آنے لگے۔ یہاں تک کہ اُمراء نے بھاری بھاری ہنر مقرر کر کے اُنسے شادیاں کر لیں۔ لڑکیوں کی ماں جب کوئی لڑکی بیاہی جاتی تھی ایک دنٹ بطور شکر یہ کہ اعشی کے واسطے ہدیہ بھیج دیتی تھی۔

اسکے سوا زمانہ جاہلیت کی شاعری میں ایسی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ مثلاً شاعر اپنے قبیلہ کو جب کہ تمام قبیلہ کے لوگ اپنے مقتول کا خون بہالینے پر رضی ہیں ملامت کرتا ہے اور قاتل سے تہمت لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ یا کسی شخص کی وجہ سے اپنے قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے لڑنے یا بدلہ لینے کے لیے برا بھلا کہتا ہے۔ یا اپنے پانی کے چشمہ یا چراگاہ کے چھن جانے پر قوم سے مدد لینے اور اُن میں جوش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اکثر ایسی خوبصورتیاں ہیں کامیاب ہوتا ہے۔ مثلاً عجب اللہ بن محمد بکیر جو کہ نبی زبید کا سردار تھا

زمانہ جاہلیت کے شاعروں کی تائید

8 یہ ایک منفرد شاعر ہے یعنی اسنے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے ہیں اسنے ایک قصیدہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی لکھا تھا اور یہی عرب کا پہلا شاعر ہے۔ جسنے حج کوئی کا دار و مدار ہاتھ پر رکھا تھا۔ اور بعض مداحی کی دولت و دولت مند ہونے کا بیان کیا تھا۔ ۱۱

کرنی شروع کی اور غالباً فرانس میں سخت اضطراب اور سرسبکی پیدا ہوئی۔ اُس وقت فرانس میں بھی دو قصیدے ایک منسوب بہ پیرس اور دوسرا منسوب بہ مارسلینز لکھے گئے تھے جو گذرگاہوں اور شاہ راہوں میں طبل جنگ پر گائے جاتے تھے۔ اوجین لوگوں کو بادشاہ سے بغاوت اور آزادی کی حمایت کرنے پر اکسایا گیا تھا

الغرض یورپ میں لوگوں نے شعر سے بہت بڑے بڑے کام لئے ہیں خصوصاً ڈرمیسٹک پوسٹیری نے یورپ کو جعفر فانی پہنچایا ہے اسکا اندازہ کلہایت مشکل ہے اس واسطے شکسپیر کے ڈراما جسے پولیٹیکل سوشل اور مورل طرہ کے بیشافائدہ اہل یورپ کو پہنچے ہیں بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں بلکہ جو لوگ مذہب کی قید سے آزاد ہیں وہ انکو بائبل سے بھی زیادہ سو مند اور فائدہ رساں خیال کرتے ہیں۔

ایشیا کی شاعری میں اگرچہ ایسی شالیں صبی کہ اوپر ذکر کی گئیں شاید شکل سے مل سکیں لیکن ایسے واقعات بہ کثرت بیان کئے جاسکتے ہیں جسے شعر کی غیر معمولی تاثیر اور اس کے جاویدگانی ثبوت ملتا ہے۔

8 رفاعاندی ناظر در سہ ہست مختلفہ مصرعے ان دونوں قصیدوں کو عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنے سفر نامہ میں حکام الدیوان انقش بنو ان بنی ہے نقل کیلئے دونوں کا پہلا ایک ایک بند یہاں لکھا جاتا ہے

قصیدہ باریتہ

قصیدہ مرسلیہ

یا اهل خراسان الغرا	یا شجاعا نابشہام تم	شیایا بنی الاوطان ہتا	خرقت خادکہ لکم تھتا
عشتم فی الزود و رطیتہ	والان خذوا حریکم	افیموا للرایۃ العظمیٰ سوتیا	وشنوا غارۃ الھیجا ملیتا
ما احسن یوم غناکم	بنوا فکرم فی کلکم	علیکم بالسلام ایا اہالی	ونظم صغوفکم مثل اللالی
کروا کر اللظفر بھم	الذ	و بخضوافی دماد اولی الوبال	فہم اعداءکم فی کل حال
		و جی دم غدا فیکم حلیا	بناخضوادماء اولی الوبال

اور ملک کے لیے بھی کچھ مفید نہ ہوا۔ لیکن اس واقعہ سے شعر کی تاثیر اور کرسٹ بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

لارڈ باترن کی نظم موسوم بہ چائلڈ ہینری رلڈز پبلشرز میچ ایک مشہور نظم ہے جسے ایک حصہ میں فرانس، انگلستان اور روس کو غیرت دلائی ہے اور یونان کو ترکوں کی اطاعت سے آزاد کرانے پر برہنہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ جو فائدے یونان کے علم و حکمت سے یورپ نے اور جاکر فرانس اور انگلستان نے حاصل کیے ہیں اسکا بدلہ آج تک یونان کو کچھ نہیں دیا گیا۔ اور روس نے بھی جو کہ گریک چرچ کی پیروی کا دم بھرتا ہے یونان کو کسی قسم کی مدد نہیں دی۔ پھر سینوں سلطنتوں کو غیرت دلانے کے لیے یونانیوں کو ترغیب دی ہے کہ غیروں سے کچھ امید رکھنی نہ چاہیے۔ بلکہ خود اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے ترکوں کی غلامی سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ ۱۸۶۱ء میں اس نظم کی شاعت ہوئی جسے سبب باترن کی شاعری کی تمام یورپ میں دھوم ہو گئی اور انگریز اس کی نظم پر مستون ہو گئے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ فرانس، انگلستان، اٹلی، آسٹریا اور روس میں اس نظم وہ کام کیا جو آگ بارود پر کرتی ہے۔ جس وقت یونان نے ترکی سے بغاوت اختیار کی یورپ کا متفقہ بیڑا فوراً اس کی کمک کو پہنچا۔ ۱۸۶۲ء میں متفقہ بیڑے نے ترکوں کے بیڑے کو شکست دی اور ترکی کو یونان کے آزاد کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس کی آزادی کو تمام یورپ نے تسلیم کر لیا۔ اور تھو ایک ڈنمارک کا شہزادہ یونان کا بادشاہ بنایا گیا اور یونان میں پارلیمنٹ قائم کی گئی۔

۱۸۶۴ء میں جب کہ چارلس دہم بادشاہ فرانس نے قانون آزادی کے برخلاف کارروائی

جہاں کے باشندے میرے ہٹسوں سے زیادہ بھاکش۔ سنگدل اور یونان کے علم و حکمت سے خیر ہوتے۔ وہ حالت میرے لیے اس سے بہت بہتر تھی کہ لوگ مجھ کو دیکھ کر ایک دوسرے کہیں کہ شخص اُسی تھینز کا رہنے والا ہے جو سیلیس کی لڑائی سے بھاگ گئے۔ اے عزیز جلد دشمنوں سے انتقام لو۔ اور یہ ننگ عار ہم سے دور کرو۔ اور چٹن سے نہ بیٹھو جب تک کہ اپنا چھنا ہوا ملک ظالم دشمنوں کے پنجے نہ چھڑالو۔ ” ان غیت انگیز اشعار سے اتھنز والوں کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اُسی وقت سب نے ہتھیار سنبھال کر سولن کو سپاہ کا سردار اور عالم مقرر کیا اور سب کے سپاہی گیروں کی کشتیوں میں سوار ہو کر سیلیس پر چڑھ گئے۔ آخر حیا کہ تاریخ میں تفصیل مذکور ہے جزیرہ سیلیس پر قابض ہو گئے۔ اور دشمنوں میں سے بہت سے قید ہوئے اور باقی تمام مال اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک بار غنیم نے بٹے ساز و سامان کے ساتھ سیلیس پر چڑھائی کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ *

انگلستان کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اڈورڈ نے جب ویلر پر چڑھائی کی تو ویلر کے شاعروں نے قومی ہمدردی کے جوش میں نہایت دلورہ انگیز اشعار کہنے شروع کیے۔ تاکہ اہل ویلر کی ہمت اور غیث زیادہ ہو۔ اگرچہ انگلستان کی سپاہ کے آگے ان کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ لیکن شاعروں کے پر جوش کلام نے انہیں جُت وطن کا جوش ہمدرد پھیلا دیا تھا کہ جب وہ فوج شاہی کے مقابلہ میں کامیابی سے بالکل نابود ہو گئے تو بھی طاعت خوشی سے قبول نہ کی۔ شاعروں کے کلام اڈورڈ کی ہمدرد مزاحمت ہوئی اور سکویسی قوتیں اٹھانی پٹیں کھینچ کے بعد اُسے ویلر کے تمام شاعروں اور نصابوں کو قتل کر دیا۔ اگرچہ شاعری کا نتیجہ ویلر کے شاعروں کے حق میں بہت بُرا

سامنے کھسک کر شوق کیا کرتے تھے کہ اوپر کے ہونٹ اور پیشانی پر ویسی ہی شکن ڈالیں جیسی کہ لارڈ
 بائرن کی بعض تصویروں میں پائی جاتی ہے۔ بعضوں نے اُسکی ریش سے گلوبند باندھنا پھڑو دیا تھا
 یورپ میں پولنگل شکلات کی وقت قدیم سے پوسٹری کو قوم کی ترغیب و تحریص کا ایک بہت
 اہم سمجھتے رہے ہیں۔ ایک نے مانہ میں ایتھنز اور مگارا والوں میں جزیرہ سیلس کی
 بابت مدت و راز تک جنگ ہی جمیں ایتھنز والوں کو براہ شکستیں ہوتی رہیں۔ اور
 رقتہ انکا حوصلہ بیاہست ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے لڑائی سے دست بردار ہو گئے۔ اور اس بات پر
 اتفاق کر لیا کہ جو شخص اس لڑائی کا ذکر کرے یا دوبارہ لڑنے کی تحریک دے وہ قتل کیا جائے۔ وقت
 ایتھنز کا مشہور مقنن سولن زندہ تھا۔ اُسکو نہایت غیرت آئی۔ اُس نے اہل وطن کو پھر لڑائی پر آمادہ
 کرنا چاہا۔ وہ دانستہ مجنون بن گیا۔ جب ایتھنز میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ سولن دیوانہ ہو گیا ہے
 اُس نے کچھ شعار نہایت درد انگیز لکھے اور پُرانے زدہ کپڑے پہن کر اور اپنے گلے میں ایک رستی اور
 سر پر اپنی چادر ڈال کر گھر سے نکلا۔ لوگ یہ حال دیکھ کر اُسکے گرد جمع ہو گئے۔ وہ ایک بلندی پر
 جہاں کشت فضا منادی کیا کرتے تھے جا کھڑا ہوا۔ اور اپنی عادت کے خلاف اشعار پڑھنے شروع
 کرنا چکا مضمون یہ تھا ”کاش میں ایتھنز میں پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ عجم یا بربڑ یا کسی اور ملک میں پیدا ہوتا

پولنگل شکلات کی ترغیب و تحریص کا ایک بہت اہم سمجھتے رہے ہیں۔ ایک نے مانہ میں ایتھنز اور مگارا والوں میں جزیرہ سیلس کی بابت مدت و راز تک جنگ ہی جمیں ایتھنز والوں کو براہ شکستیں ہوتی رہیں۔ اور

۵ لکھتوں میں میر تقی میر اور مرزا دبیر نے بھی تقریباً ایسی ہی قبولیت حاصل کی تھی جو لوگ میر تقی میر کو پسند کرتے تھے وہ مرثیہ گوئی اور
 مرثیہ خوانی میں جہاں تک پہنچتا تھا میر تقی میر کی تقلید کرتے تھے اور جو فرق مرزا دبیر کا طرفدار تھا وہ ہر ایک بات میں تنقیدی بیڑی کرتا تھا
 گر لارڈ بائرن اور ان دونوں صاحبوں کی قبولیت میں اتنا فرق جو کہ لارڈ بائرن کی عظمت اہل ہجرت کے دل میں صرف اس لئے تھی کہ وہ انکو اپنا
 شاعر سمجھتے تھے اور اسی لئے کیتھرک اور پوسٹمنٹ دونوں نے اُسکو یکساں عزیز رکھے تھے۔ بخلاف انیس و دسیر کے کہ انکی عظمت محض ایک
 مذہبی شاعر ہونے کی وجہ سے تھی اور اسی لئے ان کی بڑائی اور بزرگی جیسی کہ عموماً ایک فرقہ کے دل میں تھی ویسی عام طور پر دوسرے فرقہ کے
 دل میں نہ تھی یہ امتیاز بیٹے قومی اور مذہبی حیثیت کا ہمارے ادب اہل یورپ کے تمام کلاموں میں پایا جاتا ہے ۱۱

اُس وقت کون جانتا تھا کہ اس ناچیز گیس میں جراثیم کروں اور زہار دریاؤں کی طاقت چھپی ہوئی ہے؟
 ہمارے ملک میں بھانڈا اور نقالوں کا کام بہت ذلیل سمجھا جاتا ہے اور چولی میں جو سوانگ بھر
 جاتے ہیں وہ سوسائٹی کے لیے مضمر خیال کیے جاتے ہیں لیکن یورپ میں اسی سوانگ اور نقالی

جانتے ہیں وہ سوسائٹی کے لیے مضمر خیال کیے جاتے ہیں لیکن یورپ میں اسی سوانگ اور نقالی

نے اصلاح پاکر قوموں کو بے اتہا اخلاقی اور تمدنی فائدے پہنچائے ہیں۔
 بابے کے تمام آلات جو ہمارے ہاں ہمیشہ لہو و لعب کے مجموعوں میں متعل ہوتے ہیں اور
 جبکہ یہاں کے عقلا محض فضول جانتے ہیں شاید قوموں نے اُنکے مناسب استعمال سے نہایت
 اگر انہیں فائدے اٹھائے ہیں۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ میدان جنگ میں جب اصول مقررہ کے
 اسے افق باجا جیتا ہے تو سپاہ کے دل مد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ اور افسر کے حکم پر ہر سپاہی جان
 رنے کو موجود ہو جاتا ہے۔ اور جب کسی وجہ سے جنگ کے موقع پر باجا بجنے سے رک جاتا ہے تو

رنے کو موجود ہو جاتا ہے۔ اور افسر کا حکم بہت کم مانا جاتا ہے۔

ن کے دل سرد ہو جاتے ہیں اور افسر کا حکم بہت کم مانا جاتا ہے۔

تایخ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر

فتح نمایاں حاصل کی ہے بعض اوقات شاعر کا کلام جمہور کے دل پر ایسا تسلط کرتا ہے کہ

شاعر کی ہر ایک چیز یہاں تک کہ اُسکے عیب بھی خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں

اور لوگ اس بات میں کوشش کرتے ہیں کہ آپ بھی اُن عیبوں سے شصف ہو کر دکھائیں یا سرن

کی نسبت مشہور ہے کہ ”لوگ اُسکی تصویر نہایت شوق سے خریدتے تھے اور اُسکی نشانیاں او

یادگاریں سنت سنت کر رکھتے تھے اُسکے شواہد و خط یاد کرتے تھے اور ایسے ہی اشعار کہنے

میں کوشش کرتے تھے۔ بلکہ یہ چاہتے تھے کہ شاعر کی جیسے ہی دکھائی دینے لگیں اکثر لوگ آئینہ

کیا تھا اگرچہ اکثر نے اُس نلکہ کو مقتضائے فطرت کے خلاف استعمال کیا۔ پس ایک ایسے عطیہ کو جو قدرت نے عنایت کیا ہو صرف اس وجہ سے کہ اکثر لوگ اُسکو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں کسی طرح عیب اور پیکار نہیں کہا جاسکتا عقل خدا کی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ مگر بہت سے لوگ اُسکو مکر و فریب اور شر و فساد میں استعمال کرتے ہیں۔ یہی طرح شجاعت ایک عطیہ الہی ہے مگر بعض اوقات وہ قتل و غارت و رہزنی میں صرف کیجاتی ہے۔ کیا اس سے عقل کی شرافت اور شجاعت کی فضیلت میں کچھ فرق آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ شعر کسی کے بُرے استعمال سے بُرا نہیں ٹھہر سکتا۔

یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ شہین شاعری کا مادہ ہوتا ہے وہی شاعر نسبتاً ہے۔ شاعری کی سب سے پہلی علامت موزون طبع سمجھی جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو اشعار بعضے ضعیفوں سے موزوں نہیں پڑے جاتے اُنکو بعض اُن پڑھ اور صغیر سن بچے بلا تکلف موزوں پڑھ دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ بعضی طبیعتوں میں اُسکی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ پس جو شخص اس عطیہ الہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا۔ ممکن نہیں کہ اُس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔

شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ سامعین کو اکثر اُس سے حزن یا نشاط یا جوش یا اندر دگی کم یا زیادہ ضرر پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے انداز ہو سکتا ہے کہ اگر اُس سے کچھ کام لیا جائے تو وہ کہاں تک فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بجاپ سے جو حیرت انگیز کرشمے اب ظاہر ہوتے ہیں انکا سرعہ اول اُس خفیف حرکت میں لگا تھا جو اکثر کچھ مانیڈی چرپنی کو بجاپ کے زور سے ہوا کرتی

گرمی مینہ اور آندھی کی گزند سے بچتے ہیں اسلئے دونوں کے کام سب کے نزدیک غرت اور تر کے قابل ہیں۔ لیکن ایک بانسری بجانے والا جو کسی انسان ٹیکرے پر تن نہا بیٹھا بانسری لگے سے اپنا دل بہلاتا اور شاید کبھی کبھی سننے والوں کے دل بھی اپنی طرف کھینچتا ہو گا اُسکی ذات سے بنی نوع کے فائدہ کی چنداں توقع نہیں مگر وہ اپنے دلچسپ شغل کو کسان اور حسما کے کام سے کچھ کم ضروری نہیں سمجھتا۔ اور اس خیال سے اپنے دل میں خوش ہو کہ اگر اس کام کو سلسلہ متمن میں کچھ دخل نہوتا تو صلح حکیم انسان کی طبیعت میں اسکا مذاق ہرگز پیدا نہ کرتا ہزار رنگ ریں کارخانہ درکار است مگر نکتہ نظیری ہمہ نگو بستند

شعری مع و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جقدر اُسکی مذمت کی گئی ہے وہ نہایت مع کے زیادہ قرین قیاس ہے۔ خود ایک شاعر کا قول ہو کہ دنیا میں شاعر کے سوا کوئی ذلیل سے ذلیل پیشہ والا ایسا نہیں ہے جسکی سوسائٹی کو ضرورت نہوا۔ فلاطون نے جو یونان کے لئے جمہوری سلطنت کا ایک خیالی ڈھانچ بنایا تھا۔ اُس میں شاعروں کے سوا ہر پیشہ اور اور ہر فن کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی تھی۔ زمانہ حال میں بعضوں نے شعر کو میجک لینٹرن سے تشبیہ دی ہے یعنی میجک لینٹرن جقدر زیادہ تاریک کمرے میں روشن کیجاتی ہے اُس جقدر زیادہ جلو دکھاتی ہے۔ اسی طرح شعر جقدر جلن تاریکی کے زمانہ میں ظہور کرتا ہے اُس جقدر زیادہ رونق پاتا ہے۔ یہ اور ہی قسم کی اور بہت سی باتیں جو شعر کے برخلاف کہی گئی ہیں۔ ایسی ہیں جو لامحالہ تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ مگر اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کو قدرت نے اسی کام کے لئے بنایا تھا اور یہ ملک انکی طبیعت میں دیعت

شعری مع و ذم

شاعری کا کھلا کھلا تبصرا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مُقَدِّمَہ

شعر و شاعری پر

حکیم علی الاطلاق نے اس پرانے آباد دنیا یعنی کارخانہ دنیا کی رونق اور نظم و انتظام کے لیے انسان کے مختلف گروہوں میں مختلف قابلیتیں پیدا کی ہیں تاکہ سب گروہ اپنے اپنے مذاق اور استعداد کے موافق جدا جدا کاموں میں مصروف رہیں۔ اور ایک دوسرے کی کوشش سے سب کی ضرورتیں رفع ہوں اور کسی کا کام اٹکا نہ رہے۔ اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں چنداں سود مند نہیں معلوم ہوتے۔ مگر چونکہ قسام ازل سے انکو یہی حصہ پہنچا ہے اسلئے وہ اپنی قیمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ جو کام ان کی کوشش سے سرانجام ہوتا ہو گو تمام عالم کی نظر میں اُسکی کچھ وقعت نہ ہو۔ مگر ان کی نظر میں وہ ویسا ہی ضروری اور ناگزیر ہے جیسے اور گروہوں کے مفید اور عظیم الشان کام تمام عالم کی نظر میں ضروری اور ناگزیر ہیں۔ کسان اپنی کوشش سے عالم کی پرورش کرتا ہے۔ اور حمار کی کوشش سے لوگ سردی

دُرُجُ الدُّهْنِ كَيْفَ دَارَ

جس رُخ دماند پھرے اسی رُخ پھر جاؤ

مقدمہ

جمین شاعری کی ماہیت اور اسکے حسن و قبح پر مقل بحث کی گئی ہے

دیوانِ حاکمی

شتمبر قطعات و غزلیات و ترکیب بندات و رباعیات وغیرہ

مصنف

فاکسارالطاف حسین حاکمی پانی پتی تقیم درشتہ العلوم علی گڑھ

س ۹۳۴

مطبع انصاریہ دہلی

ناشر تاج محمد حجت اللہ رعد کے

نامی پریس کا نو دین چھپا

فہرست مضامین دیوان حالی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۴-۱۵۵	قصیدے اور ترکیب بنہ وغیرہ	۳-۱۵	ویباچہ
۲۰۶-۲۱۸	اشعار متفرقہ	۱۶-۵۲	قطعات
	قطعات تیارخ اور تاریخی جملے مقبول	۵۳-۱۳۳	غزلیات
۲۱۹-۲۳۲	قرآن مجید	۱۳۳-۱۵۳	رباعیات

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۳-۷۵	کیسی ہے۔		اُردو میں شاعر بننے کے لیے فی زمانہ
۸۵-۸۳	نمائندہ شعری نسبت شعرے اسلام کی	۳۰	کس شرط کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔
	زمانہ کی رفتار کے موافق اُردو شاعری	۳۱-۳۰	شعر کے لیے وزن ضروری ہی نہیں
۸۶	میں ترقی کیونکر ہو سکتی ہے۔	۳۳-۳۱	قافیہ شعر کے لیے ضروری ہی نہیں
۸۹-۸۷	شاعری کے لیے سبق اقتدار ضروری	۳۷-۳۳	شعر کی ماہیت
۹۱	جھوٹ اور مبالغہ سے بچنا ضروری ہے		شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری
۱۰۲-۹۱	نیچرل شاعری سے کیا مراد ہے۔	۴۷-۳۷	ہیں۔
۱۱۲-۱۰۲	زبان کو درست سے استعمال کرنا ضروری	۴۹-۴۷	آباد اور آرد میں فرق۔
	فکر شعر کی طرف کس حالت میں متوجہ		انشاء پر دازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر
۱۱۵-۱۱۳	ہونا چاہیے۔	۵۱-۴۹	نہ سہانی پر۔
۱۱۶-۱۱۵	غزل قصیدہ اور مثنوی کی اصلاح۔	۵۲-۵۱	شعر میں کس قسم کی باتیں بیان کرنی چاہئے۔
۱۱۸-۱۱۶	غزل کی اصلاح کی ضرورت اور دشواری		اعلیٰ طبقہ کے شعر کا کلام یاد ہونے
	غزل کو کون لوگوں نے مقبول خاص و	۵۴-۵۲	کی نسبت رہا۔
	عام بنایا۔	۵۵-۵۴	تخیل کو قوت میسر نہ کا محکوم رکھنا چاہئے
	غزل میں کس قسم کے مضامین بیان	۵۵-۵۵	شعر میں کیا گویاں ہونی چاہئیں۔
۱۱۲-۱۱۹	چاہئیں۔		ہماری غزل قصیدہ اور مثنوی کی موجودہ حالت

